اللہ
رابطۂ شیخ
تصورِ شیخ، توجہ اور تصرفِ شیخ کی وضاحت
پیر عبد اللطیف خان نقشبندی
خلیفۂ مجاز نیریاں شریف

اس کتاب کے سرورق پر 'اوپر کی جانب بلندیوں میں 'ایک زرد رنگ کا ہالہ جس میں لفظ "اللہ" کندہ کیا ہُوا نظر آرہا ہے 'اللہ تعالیٰ کے انوار اور الطاف کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ وہ نور ہے جو پوری کائنات کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے۔ لفظ اللہ اس کی ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ اس کا ذاتی نام بھی ہے۔ لفظ اللہ 'خدا نہیں لیکن خدا سے جدا بھی نہیں۔ اس کی پہچان کی اول اور آخر بنیاد یہی لفظ ہے۔ اگرچہ اللہ کا لفظ ذاتِ الٰہی نہیں لیکن سوچنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس نام کو لینے کی بار بار تاکید کیوں فرمائی۔ یہ تاکید اس لئے ہے کہ اس کے نام سے اللہ کے انوار ملتے ہیں اور ان انوار کے ذریعے وہ خود بھی مل جاتا ہے۔ اس کے نام سے اطمینان اور سکون اس لئے حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ کا نام ہی اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ جب نام مل گیا تو پھر سمجھ لو کہ خدا ملے ہی ملے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جس گھر کا راستہ مل گیا تو وہ گھر کیسے نہ ملے گا۔ خدا کی ذات بے نشان 'بے چون اور بے چگون ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا تعین کسی ایک جگہ پر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک جگہ پر ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ پر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے انوار کو تمثیلاً زرد رنگ کے ہالے سے ظاہر کیا گیا ہے ورنہ حقیقت کو جاننے کے لئے یہاں کوئی راہ نہیں۔ اس کے ذاتی انوار کو کوئی چیز برداشت نہیں کر سکتی 'اسی لئے اس کو ستر ہزار پردوں میں مخفی رکھا گیا اور اس کے انوار جب ستر ہزار پردوں سے چھن کر ہم تک پہنچتے ہیں تب کہیں ہمارے لئے برداشت کے قابل ہوتے ہیں۔ اگر ان پردوں میں سے ایک پردہ کو بھی درمیان سے ہٹا دیا جائے تو تمام کائنات جل کر راکھ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا فیض حاصل کرنا مقصود ہو تو کسی شیخ کو درمیان میں بطور برزخ رکھا جاتا ہے اور یہی امر رابطۂ شیخ کا باعث ہوتا ہے۔

اس کتاب کے سرورق میں مذکورہ بالا ستر ہزار نورانی اور ظلماتی پردوں کو سیاہ اور ہلکے نیلے رنگوں سے ظاہر کیا گیا ہے جو زرد رنگ کے ہالے کے چاروں طرف موجود ہیں۔ ان تمام پردوں کو جس کسی کے لئے ہٹا دیا جاتا ہے تو وہ واصل باللہ ہو جاتا ہے۔ ان پردوں کا ہٹنا اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر سے پیدا شدہ دلوں کی آگ (جسے آتشِ عشق بھی کہا جاتا ہے) سے ہی ممکن ہے۔ دلوں کی یہ آگ روحانیت کے وضع کردہ طریقوں سے حاصل ہوتی ہے۔

سرورق پر سرخ رنگ کی چوڑی پٹی جو تدریجاً باریک اور لطیف ہوتی جا رہی ہے اور زرد رنگ اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے سالک کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ پٹی بلندیوں پر واقع اللہ تعالیٰ کے انوار کے زرد رنگ کے ہالے میں گم ہو جاتی ہے اور فنا فی اللہ کو ظاہر کرتی ہے۔ اس پٹی کا سُرخ رنگ ایک مرید کے تصوّرِ شیخ کو ظاہر کر رہا ہے اور ہلکا سرخ رنگ تصوّرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نشاندہی کر رہا ہے جبکہ پٹی کا زرد رنگ والا آخری حصہ 'تصور باری تعالیٰ کو ظاہر کر رہا ہے۔ تصور شیخ کے ذریعے ایک سالک فنافی الشیخ اور پھر فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم اور بالآخر فنافی اللہ کا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ

(اور تلاش کرو اس (اللہ) تک پہنچنے کے راستہ کو)

(المائدہ: ۳۵)

رابطۂ شیخ

تصور شیخ، توجہ اور تصرف شیخ پر پہلی مستند اور جامع تحریر

مصنّف

پیر عبداللطیف خان نقشبندی

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ
ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے
خوبصورت اور معیاری مطبوعات

ناشر : میر شکیل الرحمٰن
اشاعت اول : مارچ 1995ء
اشاعت دوم : دسمبر 1996ء بمطابق شعبان 1417ھ
تعداد : 3000
قیمت : 125 روپے
سرورق : رانا ریاض احمد
اہتمام و ادارت : مظفر محمد علی
پبلشر : جنگ پبلشرز لاہور (جنگ انٹرپرائزز پرائیویٹ لمیٹڈ کا ایک ذیلی ادارہ)
مطبع : جنگ پبلشرز پریس
13- سر آغا خان روڈ، لاہور

انتساب

بنام حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم
و جملہ خواجگان نقشبندؒ

از

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تا خواجہ و مخدوم من حضرت علامہ پیر علاؤ الدین صدیقی غزنوی مدظلہ، سجادہ نشین، دربار نیریاں شریف، تراڑ خل، (آزاد کشمیر) اور اس فقیر کے درویش والدین رحمۃ اللہ علیہما جن کی فیض رس نگاہوں نے مجھے ملت و قوم کی خدمت کے قابل بنایا۔

خادم الفقراء

پیر عبداللطیف خان نقشبندی

ڈائریکٹر (ر) محکمہ موسمیات لاہور

خلیفہ مجاز (نیریاں شریف)۔ آزاد کشمیر

ای - 7/1 اے - 11 ایکسٹینشن، ذوالفقار سٹریٹ کیولری
گراؤنڈ۔ لاہور چھاؤنی، فون: 6666631، 6665475

معاونت : جناب عاصم مجید خان، جناب شاہد ملک، جنابہ تسنیم مجید خان (پروفیسر فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور)

فہرست

نظریۂ رابطہ کی وضاحت ٦۵

رابطۂ شیخ ــــ حضرت مجددؒ کے نزدیک ۸۹

رابطہ، توجّہ الی اللہ کا طریق ہے ۱۰۰

ربط کیسے قائم کیا جائے؟ ۱۰۹

رُوح کی تمنّا دیدارِ الٰہی ہے ۱۱۶

قُربِ الٰہی اولیاء کے قُرب میں ہے ۱۲۶

رابطہ میں تخلیق ایک لازمی جزو ہے ۱۹۶

حمدِ باری تعالیٰ

تیری قدرت کا الٰہی ہے تعیّن، نہ حساب
بالاتر ہے ممکنہ اوصاف سے تیری جناب
تو بھی ہے بے مثل، اور بے مثل ہے تیرا حبیبؐ
ذرہَ عشقِ محمدؐ ہو ہمیں یا رب نصیب
نور سے تیرے ضیائے مصطفیٰؐ کی ہے نمود
اس ضیاء سے گلشنِ عالم میں کارِ ہست و بود
ذکر تیرا باعثِ تسکینِ قلب و جان ہے
اس نشاطِ ذِکر میں تیری لگن اِیمان ہے
ذکر سے تیرے ہی صوفی کے کدو میں ہے شراب
ہے تیرے ہی ذکر میں وِجدان و کیف واِضطراب
عاشقوں کا جینا مرنا، ہر نفَس تیرے لئے
ہو گئے جو لوگ تیرے، تو ہے بس ان کے لئے
مذہبِ حق کیا ہے؟ بندِ طالب و مطلوب بس
چاہتا ہے تو، جسے چاہے ترا محبوب بس
آج مسلم کو عزیز از جاں ہیں دولتِ کے صنم
ان کی نظروں میں ہے بے معنی سفر سوئے حرم
خواہش دنیا کے بت ہر ایک کے زیرِ بغل
اور ڈالے پشت میں قرآں، کتابِ بےبَدل
مسلمِ بےباک کو عیش و طرب سے کام ہے
تیرے بندوں کو تری قیدِ قفس آرام ہے

کیا کہیں، کیوں ہر وقت دل صورت سیماب ہے
قوم کے غم میں دلِ نالاں سدا بےتاب ہے

خون کے آنسو رلاتی ہے مسلمانوں کی بات
ختم کر دے اے خدا الحاد کی تاریک رات

کن بما لطفِ لطیفؔ و چشمِ خوش انجام را
برکشا بر ما خدایا گردشِ ایّام را

باسمہٖ تعالیٰ

نعتِ رسول مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم

(از عبداللّطیف خان نقشبندی)

مدینے کا ہمارے دل میں جب نقشِ کمال آیا
رخِ اقدس مرے دل میں بہ ایں حسن و جمال آیا

یہ دُوری کیسی دُوری ہے کہ ہیں لمحاتِ قُرب اِس میں
توجہ کی تو روضہ صورتِ عینِ مثال آیا

ہو جب مجبوری کا عالم تو رو لیتا ہوں پل بھر کو
اِدھر ٹپکا مرا آنسو، اُدھر حکمِ وصال آیا

خیالوں کی یہ دنیا کیا ہے؟ اک بحرِ تلاطم ہے
یہ طوفان عشق کے قطرے. رگ صوفی میں ڈال آیا

وہ اک حصّہ تھا نورِ لم یزل کے ذاتی جلووں کا
وجودِ مصطفےٰؐ میں ایسا نورِ لازوال آیا

کمالاتِ جہاں بنی اُسی کے ہاتھ آتے ہیں
نظر جس کو رُخِ انور کا اک جلوۂ خال آیا

تصوّر مصطفائیؐ کا ملا تو ربطِ کامل سے
اُنہی کی اک توجہ سے دلوں میں کیف و حال آیا

رسول پاکؐ کی ہی ذات عشقِ حق کی مصدر ہے
اسی چشمے سے عشقِ بوبکرؓ، عزمِ بلالؓ آیا

محمدؐ کی محبت سے عروجِ دین و ملت تھا
گیا جب عشق یہ سینوں سے، امت کو زوال آیا

محبت مصطفیٰ کی، عزمِ خدمت، خوئے بےباکی
اِسی سے اوجِ ملت، حُسنِ خُو، صدقِ مقال آیا
غضب ہے کہ طریقت میں نہ پھر ایسا نکھار آیا
جنیدؒ و بایزیدؒ آیا نہ ان کا ہم خیال آیا
ستم ہے، صحبتِ صالح کی مشتاق نہیں باقی
دریں حالت ہمارے دور میں قحط الرِّجال آیا
لطیفؔ ہم نے گزاری عمر ساری کارِ ملت میں
نہ اپنی قوم کو لیکن سنبھلنے کا خیال آیا

منقبت

بحضور حضرت علامہ علاؤالدین صدیقی نقشبندی مدظلہٗ، سجادہ نشین، دربار عالیہ، نیریاں شریف

ہو جس کے دل میں حُسنِ مصطفٰےؐ کی آرزومندی
وہ کر لے عشقِ نقشِ پائے صدیقی کی پابندی

یہاں سے قاسمیؒ انوار اور فیضان ملتا ہے
یہی در ہے جہاں سے میں نے پائے راز الوندی

طلبگار خدا کے واسطے سجدوں کی بارش ہے
ہو اہل دل تو ملتی ہے طریقت کی حنا بندی

رضائے حق جو پالیتا ہے وہ میر طریقت ہے
مرادِ مرد مومن ہے نہ درویشی نہ خورسندی

مری خاک ازل شاید انہی کی خاکِ در سے ہو
دلاویزی انہی سے ہے انہی سے میری دلبندی

خفا ہوں اس لئے میں رسم و راہِ دنیا والوں سے
خدا والوں سے ہے نا آشنا ان کی خردمندی

جھکے گا بس اُسی کا سَر خُدا کی بارگاہی میں
میسّر ہو خدا والوں کی جن لوگوں کو فرزندی

خدا والے خدا کے حاشیہ بردار ہوتے ہیں
یہ جبرائیلؑ سے کرتے ہیں مل کر آشیاں بندی

جو منکر ہے طریقت کا، وہ محرومِ کرم ہو گا
کہاں لے جائے گی ان کو ولی سے دور افگندی

جہاں والوں کی خدمت ہی لطیفؔ عینِ تصوّف ہے
یہی ہے راز عظمت کا، یہی دینِ خداوندی

عطا صدیقؓ کی ہو گی حشر میں بہرِ صدیقی
بٹے گی ان کے ہاتھوں سے محمدؐ کی رضامندی

مقدمہ

از حضرت پیر کرم شاہ مدظلہ، جسٹس وفاقی شرعی عدالت۔ پاکستان

اللہ ربّ العزت نے اپنے محبوبِ کریم عَلَیْهِ التَحِیَّةُ وَالثَّنَاءُ وَالتَّسلِیْم کو بے شمار شانوں اور ان گنت کمالات سے بہرہ ور فرما کر مبعوث کیا۔ یہ کمالاتِ عالیہ حدِ احصاء سے باہر ہیں۔ انہیں میں سے ایک خصلتِ حمیدہ یہ بھی ہے کہ آپ "دلوں کا تزکیہ فرماتے ہیں"۔ وہ دل جو دنیوی خواہشات سے آلودہ ہو چکے ہوں، ان کی دھڑکنوں کا مرکز و محور بدل گیا ہو، جو اپنے خالق و مالک کے ذکر کی حلاوت سے محروم ہو چکے ہوں، شیطانی وسوسہ اندازیوں اور نفس کی دسیسہ کاریوں کی آماجگاہ بن چکے ہوں، جب ایسے پراگندہ دل بھی آپ کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوں گے اور آپ کی نگاہِ لطف ان کی جانب اٹھ جائے گی تو ان دلوں کو وہ طہارت نصیب ہو جائے گی کہ قدسیانِ سمٰوات بھی ان پر رشک کریں گے۔ اب شیطانی حربے ان کے دلوں پر اثرانداز نہیں ہو سکیں گے بلکہ وہ تو انوارِ ربّانی کے مہبط و مرکز بن چکے ہوں گے۔

ہمارے پاک و پاکیزہ سرشت پیغمبرؐ کے فیضِ ہمایوں نے دلوں کی اجڑی ہوئی دنیا کو بہار آشنا کر دیا۔ ایسی سرمدی و دائمی بہار کہ وہ اس کے بعد کبھی بھی خزاں کی ستم رانیوں کا شکار نہیں ہو سکتی۔

نبی اکرم و اطہر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی فیض بخشیوں کا یہ سلسلہ اولیاء کرام کی صورت میں آج بھی جاری و ساری ہے۔ ان نفوسِ قدسیہ کے روحانی تصرفات اور باطنی فیوضات نے ہمیشہ دنیا میں خیر کی روایت کو زندہ رکھا۔ عصیان و لغزشوں سے آلودہ دلوں کو حق و راستی کے انوار سے روشن و منور کرنے کا سلسلہ ہمیشہ ان پاکانِ امت نے اپنی شبانہ روز کاوشوں سے بحال رکھا۔ اولیائے کرام کی اس مساعی کے صدقے اس امت میں ایسے ارفع و اعلیٰ کردار اور ایسی برگزیدہ ہستیاں پیدا ہوتی رہیں کہ دنیا کی کوئی قوم ان جیسے نادر روزگار وجود پیش نہیں کر سکتی۔

آج جبکہ عالمِ اسلام گوناگوں ابلیسی سازشوں کا شکار ہے، ان میں سے ایک بہت بڑی سازش اسلام کے اس روحانی نظام کو مشکوک اور بے اصل ثابت کرنے کی ہے۔ اغیار اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ امت اپنے ایمان، محبت اور حق کی خاطر مرمٹنے کے لازوال جذبے کہاں سے حاصل کرتی ہے۔ ایسے میں وہ افراد بڑے خوش بخت اور فرخندہ اقبال ہیں جو اپنے اسلاف کی درخشندہ اور حیات آفریں

روایات کی پاسداری کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

محترمی عزت مآب حضرت پیر عبداللطیف خان صاحب نقشبندی کی تصنیفات عالیہ دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ فی زمانہ صوفیائے کرام کی تعلیمات کو سہل انداز میں اور عصری مذاق کے مطابق نوجوان نسل اور تشکیک زدہ افراد کے سامنے پیش کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ ان روایات کے احیاء کے بغیر امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کا مقصد کبھی بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ ایسی مفید اور معیاری کتابوں کے مصنف یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اللہ رب العزت ان کی کاوشوں کو قبولیت سے ہمکنار فرمائے اور ان کی فیض رسانیوں کے سلسلہ کو مزید وسعت عطا فرمائے۔ آمین

خاکِ راہِ صاحب دلاں
پیر محمد کرم شاہ الازہری
سجادہ نشین، بھیرہ شریف

۴ر اکتوبر ۱۹۹۵ء

غرضِ تصنیف

میرے دیدار کی ہے اِک یہی شرط
کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے (اقبالؒ)

طریق رابطہ یا رابطۂ شیخ، راہ سلوک کی ایک ایسی مخصوص شاخ ہے جس پر خامہ آرائی کا قصد، طریقت کے حقائق کو افشاء کرنے سے عبارت ہے۔ یوں تو پورے کا پورا علم طریقت مغیبات اور مخفی علوم سے تعلق رکھتا ہے لیکن رابطہ شیخ ایسے مخفی طریقے کے ساتھ مہارت پیدا کرنے کا عمل ہے جس میں سالک اپنی روح کو پوری قوت میں لانے کے بعد، اپنے محبوب کے کوچے میں طواف کرنے کی اہلیت حاصل کر لیتا ہے اور اس کے ساتھ غیر رسمی تعلق قائم کر کے متعدد روحانی فیوضات کا اکتساب کرتا ہے۔ یہ محبوب، سالک کا شیخ ہو، خواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اللہ عزوجل کی ذات ہو، بہرحال ان تینوں ہستیوں کی جناب میں حاضری یا حضوری سالک کی مطمح نظر ہوتی ہے۔ فیضی نے شاید اسی مخفی طریقے سے اپنے محبوب کے کوچے میں حاضر ہونے کا ذکر اپنے ایک شعر میں یوں ظاہر کیا ہے۔

فیضی از ظاہر پرستانِ ارادت نیستم — ما بطوفِ کوئے اُو از راہِ پنہاں می روم
(فیضی میں ارادت کے ظاہر پرستوں میں سے نہیں ہوں، ہم اس کے کوچے کے طواف کے لئے ایک مخفی راستے سے جاتے ہیں)

الروض الباسم میں ہے کہ سلوک ایک گہرا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ مکاشفہ کی کشتی کے بغیر اس سمندر میں سفر کرنا درست نہیں اور یہ ایک سیاہ رات ہے جس میں مشاہدہ کے چاند کے طلوع ہونے کے بغیر سفر کرنا درست نہیں۔ سلوک کے علوم ضروری اور بدیہی (از خود ظاہر) ہیں جو تجربہ سے تواتر کے ساتھ ریاضت کرنے والے ان اصحاب سے ثابت ہیں جو تخلیہ کو لازم سمجھتے ہیں اور بیداری میں وہ چیزیں دیکھتے ہیں جو دوسرے لوگ خواب میں دیکھتے ہیں اور وہ مخاطب کو دیکھے بغیر اس کا کلام سن لیتے ہیں۔ (الروض الباسم ۲: ۵۷)

رابطۂ شیخ، ربط الی اللہ قائم کرنے اور واصل باللہ ہونے کی ایک راہ فراہم کرتا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے جن کا نام روحانی دنیا میں صف اول کے اولیاء میں تسلیم کیا جاتا ہے اور جنہوں

نے اس راستے میں سخت مجاہدات کو اختیار کیا، فرماتے ہیں کہ بندے کو ایسا وقت ضرور نکالنا چاہئے جس میں اپنے مالک کے سوا کسی اور پر نظر نہ اٹھے۔ (یعنی طریق رابطہ سے اللہ تعالیٰ تک ربط حاصل کیا جائے) آپ نے فرمایا کہ میں نے سخت مجاہدات کئے اور میری انتھک کوششوں کے باوجود بھی اللہ کی معرفت کا دروازہ مجھ پر نہ کھل سکا، لیکن جب مصائب کے ذریعے در حق پر دستک دی تو یہ دروازہ کھل گیا۔ اس کے علاوہ تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور جب قلبی لگاؤ (ربط الی اللہ) کے ذریعے چلا تو منزل تک پہنچ گیا۔ فرماتے ہیں کہ اس راہ میں اذیتیں نفع بخش ثابت ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو آزمائشوں اور مصائب میں مبتلا کیے رکھتے ہیں اور حق تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اپنے عاشقوں پر چھوڑے رکھا ہے تاکہ مخلوق ان کو تنگ کرے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ اس کے دوستوں کو دنیا والے پہچان سکیں۔ ایک حدیث شریف میں بھی ہے کہ میرے دوست میری چادر میں چھپے رہتے ہیں اور میرے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے ان دوستوں کے لئے جن کو وہ قبولیت عطا فرمانا چاہتا ہے، ایک ایسا فرعون مقرر کر دیتا ہے جو ہمہ وقت اسے اذیت پہنچاتا رہے۔ فرمایا نفسانی خواہشات کو چھوڑ دینا بھی دراصل واصل الی اللہ ہو جانا ہے اور جو واصل الی اللہ رہتا ہے، مخلوق اس کی فرمانبردار ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ خداشناس جہنم کے لئے عذاب ہوتا ہے اور جس کو خداشناسی حاصل نہیں ہوئی اس کے لئے جہنم عذاب ہے۔ یہ بات ایک حدیث سے بھی ثابت ہوتی ہے، جس میں اس حقیقت کا ذکر ہے کہ مومن جب پل صراط سے گزرے گا تو جہنم اس کی خوشامد کرے گی کہ اے مومن جلدی سے گزر جا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری وجہ سے میری آگ ٹھنڈی ہو جائے۔ مومن کے دل کی آگ جہنم کی آگ سے تیز ہوتی ہے کیونکہ ایک عاشق کے سینے میں عشق الٰہی کی آگ موجود رہتی ہے اور اگر اس کے عشق کا ایک ذرہ کائنات پر ڈال دیا جائے تو پوری کائنات جل کر راکھ ہو جائے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ علم بھی نام نہاد علماء یا نااہل علماء سے سیکھنا مناسب نہیں کیونکہ وہ روحانی قوتوں سے محروم رہتے ہیں۔ علم اور خبر ایسے شخص سے سیکھو اور سنو جو علم سے معلوم (یعنی اللہ تعالیٰ) تک رسائی حاصل کر چکا ہو اور خبر سے مخبر کو پہچانتا ہو۔ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ محسوس کر لیا کہ امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسے خدارسیدہ انسان بھی ہیں جو تحت الثریٰ سے لے کر اعلیٰ علیین تک چھائے ہوئے ہیں تو آپ نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں شمولیت کے لئے دعا کی۔

بزرگوں کا تحت الثریٰ سے اعلیٰ علیین تک چھانے کے مذکورہ بالا بیان سے ایک مشہور روایت یاد آتی ہے کہ حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ (جن کو حضرت داتا گنج بخشؒ کے قریب کا زمانہ حاصل تھا) جب ذکر الٰہی کے دوران وجد میں آتے تو اٹھ کر رقص کرنے لگتے۔ لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ ذکر کے دوران رقص کرتے ہیں، یہ رقص کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ رقص وہ کرے جو اگر زمین پر پاؤں مارے تو اسے تحت الثریٰ تک ہر چیز نظر آجائے اور اگر آستین اٹھائے تو اس کی نگاہ عرش عظیم پر

بڑے اور اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو تو اسے چاہئے کہ وہ بایزید بسطامیؒ اور جنید بغدادیؒ کے چشمے سے پانی پیئے اور رقص نہ کرے۔ حضرت ابو سعید ابوالخیرؒ کے متعلق زمین کے نیچے کے معاملات دیکھنے کا ایک واقعہ منقول ہے کہ سلطان طغرل کے وزیر ابو منصور ورقانی جب قریب المرگ تھے تو انہوں نے ابوالقاسم قشیریؒ اور ابو سعید ابوالخیرؒ سے کہا کہ میں نے ہمیشہ آپ دونوں کی بہت خدمتیں کی ہیں، اس وقت میری درخواست ہے کہ جب میں مرجاؤں تو آپ لوگ میرے جنازے کا ساتھ دینا اور جب تک آپ کی برکتوں سے قبر کے سوال و جواب سے فارغ نہ ہو جاؤں، واپس نہ آنا۔ دونوں شیوخ نے یہ درخواست قبول کر لی۔ ابوالقاسمؒ نے حضرت ابو سعیدؒ سے کہا کہ تم چٹائی ڈال کر قبر کے سرہانے بیٹھو، میں لوگوں کو رخصت کر کے آتا ہوں۔ ابھی قبر پر مٹی کا ڈالنا مکمل ہوا ہی تھا کہ شیخ ابو سعیدؒ اٹھ بیٹھے اور چل دیئے۔ ابوالقاسمؒ نے پوچھا وصیت کا کیا ہوا۔ فرمایا کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑی۔ فرمایا کہ فرشتے آئے اور سوال کرنے لگے تو ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ تم دیکھ نہیں رہے کہ اس کے سرہانے کون بیٹھا ہے؟ اتنا کہہ کر وہ رخصت ہو گئے اور میں بھی وہاں سے چل پڑا۔ (مقامات اولیاؒ)

مذکورہ بالا روحانی کیفیات، درجات اور مقامات صرف ان لوگوں کو ہی حاصل ہوتے ہیں جو مشائخ کرام سے ربط حاصل کریں اور روحانی منازل کو ان کی نگہداشت میں طے کریں۔

علمِ تصوّف دوسرے علوم سے منفرد ہے:۔ دیگر علوم کے برعکس علمِ تصوّف اور سلوک میں ایک سالک کو شرعی امور کی پابندی کرتے ہوئے توجہِ شیخ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ شیخ سے شخصی وابستگی قائم رکھنا اور اس سے رہنمائی حاصل کرنا اس علم کی بنیادی ضروریات میں شامل ہے۔ مقاماتِ سلوک کو طے کرنا ہو تو اس میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کسی طالب کے اپنے ظرف کا معیار کس قدر بلند ہے اور وہ شیخ کے ساتھ کس قدر مضبوط ربط قائم کر سکتا ہے۔ اس راہ میں کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے سالک کے راہبر کی طرف سے حاصل ہونے والے تصرفات اور توجہ کو بھی بہت بڑا دخل حاصل ہے کیونکہ تصرفات کے شعبے میں کبھی کبھی ایک توجہ بھری نگاہ سالک کو ایسی منزل پر پہنچا دیتی ہے جو سینکڑوں سال کے مجاہدات کے باوجود بھی حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سالکِ طریقت کو رابطہ شیخ کے باعث ایسی قوتیں حاصل ہو جاتی ہیں جو اہل طریقت کا ہی خاصہ ہیں جن کی مثال عام طریقے سے عبادت کرنے والوں میں شاید اور باید ہی ملتی ہے۔

رابطۂ شیخ، طریقت کے ان علوم سے تعلق رکھتا ہے جن کے ذریعے ایک مرید اپنے شیخ سے ذاتی اور شخصی روابط قائم کر کے اس سے طرح طرح کے فیوضات اور فوائد حاصل کرتا ہے۔ طریق رابطہ اپنی جگہ ایک مستقل اور نہایت وسیع عنوان ہے، جس میں تصورِ شیخ سے لے کر توجہِ شیخ، رابطہ

شیخ اور تصرّفِ شیخ کے مفہوم شامل ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات اس امر سے تعلق رکھتی ہیں جن کے ذریعے ایک سالک اپنے شیخ کی رہنمائی میں ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت کے ذریعے اپنے من کا تزکیہ اور باطن کو صاف کرتا ہے اور پھر اپنے شیخ کی مدد و نصرت حاصل کر کے واصل باللہ ہو جاتا ہے۔ رابطۂ شیخ کی ان عمیق گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے عام مسلمان تو کجا، راہ طریقت پر چلنے والے اکثر صوفیوں کو بھی خاطر خواہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ زیرِ نظر کتاب میں ان تمام معلومات کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کا علم حاصل کرنا اس راہ کے مسافروں کے لئے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

تصوف اور سلوک ایک ایسا روحانی شعبہ ہے جس میں داخل ہونے کی اولین شرط روحانی تعلیمات حاصل کرنے کے بعد ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسی شیخ کی صحبت میں آنا ہے۔ اہل سلوک کی تعلیمات میں القائی اور انعکاس کے عمل کو اس قدر دخل حاصل ہے کہ اس کے بغیر اس میں ایک قدم بھی اٹھایا نہیں جا سکتا۔ روحانی دنیا میں اگر محض علم اور عمل کے حصول پر ہی مدارج کا مدار ہوتا تو ہر شخص بغیر کسی شیخ و مرشد کی نگاہ فیض و کرم کے کچھ محنت کر لینے کے بعد صوفی باصفا ہونے کا دعویٰ کر بیٹھتا۔ علامہ اقبالؒ نے ان حکیمانہ درسوں سے بیزاری کا اظہار کیا ہے جو انہوں نے مغرب کی بلند پایہ درسگاہوں سے حاصل کیے تھے۔

مرا درسِ حکیماں دردِ سر داد
کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم

(اہلِ فلسفہ کے درسوں نے مجھے درد سری کے سوا کچھ نہیں دیا کیونکہ میں تو نگاہِ فیض کا پروردہ ہوں)

لہٰذا علمِ سلوک میں پیش رفت مقصود ہو تو اہل اللہ کے وضع کردہ قوانین و ضوابط سے واسطہ ضرور پڑتا ہے اور لازمی طور پر اقتباسِ فیض اور اس کے تصرّفات و توجہات کی ہر لمحہ مرید کو ضرورت رہتی ہے۔ طبعاً کسی مرید کے لئے اپنے مرشد کی طویل صحبت حاصل کرنا ممکن نہیں لہٰذا مرید رابطۂ شیخ کے ذریعے ہمہ وقت اپنے شیخ کے ساتھ منسلک و مربوط رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ طریقت رابطۂ شیخ کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، بلکہ اسے روحانیت کی اولین ضرورت قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں مرید اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ خدا کے ساتھ اپنا براہ راست ربط قائم کر سکے لہٰذا شیخ کی ذات کو بطورِ برزخ درمیان میں رکھنا ایک ناگریز عمل سمجھا جاتا ہے۔ برزخ کی اہمیت اس کتاب میں (اور راقم الحروف کی دوسری کتاب "بیعت کی تشکیل اور تربیت" میں بھی) واضح کر دی گئی ہے۔ کوئی شخص بغیر کسی شیخ کی وساطت کے آج تک وصلِ الٰہی کی منزل تک نہیں پہنچ سکا۔

اسبات کا عرفان ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے پناہ قوتوں کا مالک بنایا ہے: ۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف پڑھے لکھے اور اچھی خاصی سدھ بدھ والے انسان بھی توجہ دینا پسند نہیں کرتے کیونکہ آج کا مسلمان صرف مال و دولت کی چمک کا ہی غلام بن چکا ہے

اور دینی امور کی طرف توجہ کرنا اس کے نزدیک چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ مسلمانوں کی اس بے التفاتی میں دشمنان اسلام کا بہت گہرا تعلق ہے کیونکہ وہ ایسے مسلمانوں سے خائف ہیں جو ایک بار دنیا بھر میں اپنی قابلیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

تخلیقِ کائنات کا مقصودِ اول انسان کی ذات ہی تھی اور جس وقت انسان کو اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات میں اپنا نائب بنایا تو اسی وقت اس کو ان کمالات اور صفات کا مالک بنا دیا جن میں اس کا کوئی ساجھی نہ تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان تمام خوبیوں کے مالک ہونے کے باوجود مسلمان اپنے خالق کی نافرمانیوں کے باعث، خود کو اس قدر شرمناک تنزّلات تک لے گیا ہے کہ اب وہ دنیا کی ایک ادنیٰ سی مخلوق سے بھی خائف اور مغلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن کمالات کی بلندیوں پر فائز کیا ہے اس کی کچھ جھلک علامہ اقبال کے درج ذیل اشعار سے واضح ہوتی ہے۔ ۔

کِس بلندی پہ ہے مقام مِرا عرش ربِّ جلیل کا ہوں میں

وہ مشتِ خاک ہوں فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں نہ پوچھو میری وسعت کی زمیں سے آسماں تک ہے

وہ بحر ہے آدمی جس کا ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانہ

انسان کو وہ امتیازات حاصل ہیں کہ جن سے نوری مخلوق کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ حور و فرشتہ بھی انسانی تخیّلات کے اسیر ہیں۔ وہ ایسے ایسے کارنامے انجام دے سکتا ہے کہ جس سے عقل عاجز ہے۔ انسان اپنے دل میں جو چاہتا ہے اسے کر بھی سکتا ہے حتیٰ کہ وہ اگر چاہے اور جب چاہے قیامت برپا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔

نہاں تقدیر ہا در پردۂ من قیامت ہا بغل پروردۂ من
(میرے اندر (قوموں کی) تقدیریں پنہاں ہیں، میری آستین میں کئی قیامتیں پرورش پا رہی ہیں)
دمے در خویشتن خلوت گزیدم جہانے لازوالے آفریدم!
(میں نے ایک لمحہ اپنے اندر خلوت اختیار کی تو ایک جہان لازوال پیدا کر دیا)

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے پیدا

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

نہ کر تقلید اے جبریلؑ میرے جذب و مستی کی　　　تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

راقم الحروف کا ایک مضمون (جو "مقام آدم" کے نام سے ایک پمفلٹ کی شکل میں چھپ چکا ہے) اور انشاء اللہ "اسلام اور روحانیت" کی کتاب میں شامل کیا جائے گا، اس میں بنی نوع انسان کی نوری مخلوقات پر برتری کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ مضمون بہت دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ اس مضمون میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خاکی مخلوق (انسان) کی ہر بار نفس کی مخالفت اور مزاحمت کرنے کے باعث درجوں میں بلندی کر دی جاتی ہے اور چونکہ نوری مخلوق نفس کی کشمکش سے محروم رکھی گئی ہے اس لئے انسان کو دیئے جانے والے درجات کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتی۔ دنیاوی مشکلات، تکالیف اور دنیا کی زندگی میں ملنے والے رنج و غم میں استقامت اور صبر کرنے کے باعث انسان کو جو اجر ملتا ہے وہ نوری مخلوق کی بڑی سے بڑی عبادتوں سے کئی گنا بڑھ چڑھ کر ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ جبریلؑ خاکی انسان کی بلندی تک کہاں پہنچ سکتے ہیں، ان کی بلند نامی تو صرف اس لئے ہے کہ ان کو ملائکہ مقربین میں شامل کیا گیا ہے ورنہ وہ اس قدر بلند نام نہ ہوتے۔

کجا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند　　　کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را

(کہاں وہ نوری جو سوائے پیغام رسانی کے کچھ نہیں جانتے اور کہاں وہ خاکی انسان کو جو پوری کائنات کو اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہے)

باوجِ مشتِ غبارے کجا رسد جبریلؑ　　　بلند نامیٔ او از بلندیٔ بام است

(اس مٹھی بھر خاکی انسان کی بلندی کو جبریلؑ کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ان کی بلند نامی تو ان کے مقام کی بلندی کے سبب ہے)

جہاں پیدا و محتاجِ دلیلے　　　نمی آید بفکرِ جبرئیلے

(یہ جہاں ظاہری احوال رکھتا ہے اور دلیل کا محتاج ہے۔ یہ جہاں جبرائیلؑ کی فکر میں نہیں آ سکتا)

می تواں جبرئیلؑ را کنجشکِ دست آموز کرد　　　شہپرش با موئے آتش دیدہ بستن می تواں

(جبریلؑ کو ہاتھ پر بیٹھنے والی سدھائی ہوئی چڑیا کی طرح کیا جا سکتا ہے۔ اس کے پروں کو جلے ہوئے بال سے باندھا جا سکتا ہے)

انسان کو کس قدر قوتیں عطا کی گئی ہیں اس پر قرآن کی بے شمار آیات اور احادیثِ نبوی ناطق ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر استطاعت عطا کی ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہی ہوتا ہے لیکن مسلمان ہے کہ چند سونے چاندی کے سکوں کو حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے اور ان تمام اختیارات سے ہاتھ دھو چکا ہے۔ اس تحریر سے

ہمارا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنی ان ذمہ داریوں کی طرف توجہ دیں جو ان کے خالق نے ان پر عائد کی ہیں تاکہ وہ پھر سے ان خدائی انعامات کے وارث بن سکیں جن سے وہ اپنی غفلتوں اور نفسانی لغزشوں کے باعث محروم ہوئے ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

ہے گلہ مجھ کو تری لذتِ پیدائی کا ۔۔۔ تو ہوا فاش تو ہیں اب مرے اسرار بھی فاش
ہو ترے دل کے ہر اک ذرّے سے تعمیر حرم ۔۔۔ دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر
پہلے خوددار تو مانندِ سکندر ہولے ۔۔۔ پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مسلمانوں کے لئے جو ضابطہ حیات متعین کیا ہے اس میں نہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کے آداب بیان فرمائے ہیں بلکہ انسان کے لئے دنیا میں بلند مقامات عزت و آبرو حاصل کرنے کے اصول بھی وضع فرما دیئے ہیں، اسی وجہ سے علامہ اقبالؒ مسلمانوں کو اللہ کے احکامات پر عمل کرنے کی تاکید فرماتے ہیں تاکہ وہ اللہ کے جمال کا مشاہدہ کر سکیں۔

سرِّ دینِ حق صدقِ مقال اکلِ حلال ۔۔۔ خلوت و جلوت تماشائے جمال
(دین کا راز سچ بولنے اور حلال کھانے میں ہے۔ خلوت اور جلوت میں حق تعالیٰ کا جمال نظر آتا ہے)

در رہِ دیں سخت چوں الماس زی ۔۔۔ دل بہ حق بربند و بے وسواس زی
(دین کی راہ میں الماس کے پتھر کی طرح سختی اختیار کرو۔ دل کو اللہ کے لئے خاص کرو اور وسوسوں سے آزاد ہو جاؤ)

اے ترا بخشد خدا قلب و جگر ۔۔۔ طاعتِ مردِ مسلمانے نگر
(اللہ تعالیٰ تجھے ایسا قلب و جگر عطا کرے کہ تو مرد مسلمان کی فرمانبرداری کا مقام دیکھے)

اہل رابطہ کو حالات حاضرہ سے باخبر ہونے کے لئے کشف کا عطا ہونا۔

نیابت الہٰیہ کو قائم رکھنے اور کامیابیاں دینے کے لئے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت سی ایسی طاقتیں عطا کی گئی ہیں جن کے ذریعے وہ کائنات میں اپنا تصرّف قائم رکھ سکے اور حالات زمانہ سے باخبر رہے۔ ان تصرفات میں سے ایک کشف کا عطا ہونا ہے۔ تصوّف میں کشف کے یہ معنی ہیں کہ صوفی کے سامنے سے حجابات بقدر مراتب اٹھا دیئے جاتے ہیں۔ اس کے تین درجے ہیں۔ پہلی قسم محاضرہ جس میں عقل سے بذریعہ برہان کام لیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے ارباب عقول علم الیقین تک پہنچتے ہیں۔ یہ منزل حدود، فکر و نظر ہی سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اس میں عقل کو بہت بڑا دخل ہے اس لئے اسے کشف نہیں کہنا چاہئے، لیکن اسے کشف اس لئے کہتے ہیں کہ کسی کے ذہن میں کوئی فکر یا علمی نظریہ کے آنے کو اللہ کی طرف سے ہی سوچنا تصور کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم مکاشفہ ہے جس میں علم سے بذریعہ بیان و تشریح کام لیا جاتا ہے اور اس سے اصحاب العلوم کی رسائی عین الیقین تک ہوتی ہے اور تیسری قسم مشاہدہ ہے جو براہ راست ذاتی تجربہ یعنی معرفت کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کے ذریعے اہل معرفتِ حق

الیقین تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ حق الیقین مطلوب حقیقی کا بلاواسطہ دیدار ہے اور اسے بعض اوقات معائنہ بھی کہتے ہیں۔ (الرسالۃ القشیریہ)

صاحبِ کشاف نے کشف کی چند اقسام یا مراتب بیان کیے ہیں:۔

اول کشف نظری: جب سالک اپنے جذبۂ ارادت سے طبیعتِ سفلی سے حقیقتِ علیین میں قدم رکھتا ہے اور اپنے باطن کو ریاضت کے ذریعے صاف کر لیتا ہے تو اس کی چشم باطن کھل جاتی ہے اور اس رفعِ حجاب کے مطابق اس پر حقائق کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

دوم کشف نوری: جب سالک کشفِ نظری سے آگے بڑھ جائے تو نور دل اس کو حاصل ہو جاتا ہے (جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے "مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے)

سوم کشف سرّی: یہاں آفرینش کے اسرار اور حکمتِ وجود کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ ایک صوفی کو اس بات کا کشف ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بیماریوں کی شفا کے لئے کن کن جڑی بوٹیوں کے استعمال میں شفا کا حکم دیا اور تمام بیماریوں کی شفا کا حکم ایک دم عطا فرمایا ہے اور ایک لمحہ میں فرمایا۔ ایسی معلومات براہ راست اللہ تعالیٰ سالک کو بذریعہ القایا الہام عطا فرما دیتا ہے۔

چہارم۔ مکاشفۂ روحانی: اس میں بہشت، دوزخ، پل صراط اور دیگر عوالم کی حقیقت کھل جاتی ہے۔

پنجم۔ مکاشفۂ خفی: اس کشف کے ذریعے عالمِ صفاتِ خداوندی میں سالک کو راستہ ملتا ہے۔

ششم۔ مکاشفۂ ذاتی: یہ مکاشفہ بہت مشکل ہے اور اس میں اشیاء کی حقیقت ظاہر کر دی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذاتی جلوؤں کو برداشت کی حد تک ظاہر کیا جاتا ہے کیونکہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ان جلوؤں سے مخصوص کیا گیا ہے۔ حضرت سلطان باھوؒ نے "عَیْنُ الْفَقْر" میں لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ "قُمْ بِاِذْنِ اللہ" ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا مرتبہ "قُمْ بِاِذْنِی" ہے کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی توحید کا مرتبہ زبانی ہے (کیونکہ انہوں نے اللہ کو دیکھ کر توحید کا اعلان نہیں کیا) اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو کامل توحید حاصل ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو دیکھ کر توحید کی گواہی دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں تمام رسولوں کی امتوں کو اپنی نعمتوں کو یاد کرنے کا حکم دیا (اُذْکُرُوا نِعْمَتِیَ یعنی میری نعمتوں کا ذکر کرو) مگر امتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات کا ذکر کرنے کو فرمایا (فَاذْکُرُوْنِیْ یعنی میرا ذکر کرو)

قرآن اور حدیث سے تصرّف باطنی یعنی طریق رابطہ کا اثبات موجود ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اگرچہ ہر چیز پر قادر ہے لیکن اس نے اس دنیا میں بہت سے کام اپنی نورانی یا روحانی ہستیوں کے سپرد کیے ہیں۔ اس سلسلے میں طوالت کے باعث تفصیلی بحث نہیں کی جا سکتی البتہ آپ چند اشارات اس کتاب کے "حرفِ آغاز" سے مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس جگہ مذکورہ سنتِ الٰہی کے چند نکات پیش کیے جائیں گے جس سے معلوم ہو گا کہ روحانی اور باطنی تصرف کا کام اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور اپنے پاکیزہ بندوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے لئے جبرائیل علیہ السلام کو بی بی مریم کے پاس بھیجنا (اَیَّدْنَاهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ البقرہ: ٨٧) یعنی ہم نے تقویت دی انہیں جبریل علیہ السلام سے) مومنوں کے دلوں میں آپس کی محبت کا ڈالنا (فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ آل عمران: ١٠٣)، مومنوں پر سکون طاری کرنا (هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ الفتح: ٤) مومنوں کی فرشتوں سے مدد کرنا (آل عمران: ١٢٤) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خضر علیہ السلام کے ذریعے چند معاملات کی وضاحت کرنا الکہف: ٦٠ تا ٨٢) وغیرہ۔ قرآن میں ان کے علاوہ اور بہت سی مثالیں بھی موجود ہیں۔

احادیث مبارکہ میں بھی مذکورِ بالا تصرّفِ باطنی کا ذکر آیا ہے۔ مثال کے طور پر حدیثِ فعلی میں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ نے جبرائیل علیہ السلام سے فرمایا "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" سب کو معلوم ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تین بار سینے سے لگایا تو تیسری بار سینے کے ساتھ لگنے کے بعد آپ نے پڑھنا شروع کر دیا۔ سینے سے سینے کو فیض پہنچانے کا طریقہ اب بھی اہل طریقت میں مروّج ہے۔ مرشد اپنے مریدین کو تین بار اپنی توجہ سے مشرف کرتا ہے۔ پہلی توجہ دینے کا مقصد مرید کی روحانی صورت کی درستی کرنا ہوتا ہے۔ دوسری بار توجہ دینے کا مقصد وہ نحوست (جو مرید میں بیعت سے پہلے موجود ہوتی ہے) کا رفع کرنا ہوتا ہے اور تیسری بار تنویرِ قلب (صفائے قلب) کے لئے توجہ دی جاتی ہے۔ ایسی توجہات دینے کے بعد مرید میں منازل و مقاماتِ سلوک طے کرنے کی استطاعت پیدا ہو جاتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کمزوریٔ حافظہ کی شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ھریرہؓ سے فرمایا کہ اپنی چادر زمین پر بچھاؤ۔ اس کے بعد آپؐ نے اپنے دونوں مبارک ہاتھوں سے کوئی روحانی چیز اس چادر پر انڈیل دی اور پھر فرمایا کہ اب اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لو۔ حضرت ابو ھریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں کبھی کوئی حدیث نہ بھولا اور بیشتر احادیث آپ سے ہی مروی ہیں۔ اس طرز پر بے شمار واقعات سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں اور اولیائے کرام کی سیرت و سوانح کی کتابیں تو ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ تمام مثالیں اس بات کا بین ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ انبیائے کرام اور اولیائے کرام سے ربط قائم کیا جائے تو ان کے فیضان کا اثر مشاہدے میں آتا ہے۔ جو کوئی اس کا انکار کرتا ہے تو یہ ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں۔

شاہ اسمٰعیل دہلوی نے تو پہلے وسیلۂ شیخ کی مخالفت کی اور پھر اپنی کتاب "منصب امامت" میں لکھتے ہیں "مراد از وسیلہ شخصے است کہ اقرب باشد در منزلت کما قال اللہ تعالیٰ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ (یعنی وہ لوگ جنہیں یہ مشرک پکارا کرتے ہیں وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب کی طرف وسیلہ کہ کون سا بندہ اللہ سے زیادہ قریب ہے۔ بنی اسرائیل: ۵۷ وَاَقْرَبُ اِلَى اللہ باعتبار منزلت، اول رسول اللہ صلی علیہ وسلم است و بعد ازاں نائبِ او" (اور اللہ کے سب سے قریب باعتبار قدر و منزلت پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان کے بعد ان کے نائب) اس کے علاوہ قرآن میں ان لوگوں کے ساتھ مصاحبت کرنے کا حکم ہے جو لوگ صادقین میں سے ہیں اور اہل ذکر ہیں کیونکہ ان لوگوں کا حال اور قال یکساں ہوتا ہے اور ان کی صحبت سے انسان اللہ کا قرب اور وصل حاصل کرتا ہے۔ قرآن میں سورہ حٰمٓ السجدہ کی آیت ۵۳ میں ہے سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ (ہم دکھائیں گے انہیں اپنی نشانیاں آفاق (عالم) میں اور ان کے نفسوں میں) اس آیت میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو حق الیقین والے ہیں۔ حضرت عبید اللہ احرارؒ فرماتے ہیں۔

نماز را بحقیقت قضا بود لیکن نمازِ صحبتِ ما را قضا نہ خواہد شد

(حقیقتاً نماز تو قضا ہو گئی لیکن ہماری صحبت کی نماز قضا نہیں ہونا چاہئے)

حضرت عبید اللہ احرارؒ کا اشارہ اسی شخصی صحبت اور طریق رابطہ کی صحبت کی طرف ہے۔ کیونکہ اولیاء اللہ کی صحبت میں بیٹھنے والا شقی نہیں ہوتا ان کی خدمت میں بیٹھنا عبادت ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ عارفین کی صحبت میں بغیر وضو بیٹھنا خلافِ ادب ہے کیونکہ کوئی عبادت بغیر وضو کے درست نہیں۔

امساک بالعُروَۃِ الوُثقیٰ اور حَبلُ اللہ کو طریقِ رابطہ سے تقویت ملتی

ہے۔ عروۃ الوثقیٰ مضبوط گرہ یا کڑے کو کہتے ہیں۔ سورہ البقرہ کی آیت ۲۵۶ میں اس بات کا ذکر ہے کہ جو اللہ پر ایمان لایا اس نے عُرْوَةُ الْوُثْقٰى کو تھام لیا۔ اہلِ طریقت ہر وقت اس مضبوط گرہ کو طریق رابطہ کے ذریعے سے تھامے رہتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کو بھی عروۃ الوثقیٰ کہا جاتا ہے کیونکہ جو ان کی صحبت سے فیضیاب ہوا وہ واصل باللہ ہو گیا۔ اسی طرح سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۳ میں ہے کہ اللہ کی رسی (حَبْلُ اللہ) کو سب مل کر تھام لو۔ صوفیاء کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کو پختہ کرنے کے لئے ذکر و فکر میں کافی وقت گزارنا ہوتا ہے۔ اتباع شریعت اور اطاعت الٰہی کی آگ میں جل کر یہ رسی زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ مرید اپنے طور پر اسی رسی کو ذکر و فکر اور دیگر عبادات سے مضبوط تو کر سکتا ہے مگر اس رسی کو اللہ کے ساتھ جوڑنے کے لئے ایک مرشد کامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ شیخ کامل فقط وہی کہلا سکتا ہے جو مرید کی محبت کو دنیا سے ہٹا کر پہلے اپنی طرف کر لیتا ہے اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی طرف لاتے ہوئے اللہ کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ یہی بات رابطہ شیخ کی اصل غرض و غایت ہے۔

رفتہ رفتہ شیخ مرید کے رشتے کو اللہ کے ساتھ اس قدر پختہ کر دیتا ہے کہ دنیا کی کوئی آفت اس رشتے کو توڑ نہ سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو اسی رسی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس انداز سے جوڑا کہ وہ بڑے سے بڑے طوفانوں سے بھی ٹکرا جاتے اور اپنی جان قربان کرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔

طریقِ رابطہ میں ذاتِ باریٰ تعالیٰ کی طرف حد درجہ استغراق پیدا کرنا ہوتا ہے۔ طریق رابطہ کے اس استغراق میں فنائیت کا ہونا طریقِ رابطہ کے لوازمات میں شامل ہے۔ طریقت میں فنائیت کا لفظ عدم شعور کو ظاہر کرتا ہے۔ ذات باری تعالیٰ میں اس درجہ استغراق کا ہونا کہ اپنا ہوش بھی نہ رہے "فنا" کہلاتا ہے اور اگر اس فنائیت کا بھی احساس نہ ہو تو اس کو فناء الفناء کہتے ہیں۔

ہستیٔ من رفت و خیالش بماند　　　　این کہ تو بینی یا منم بلکہ اوست

(میری ہستی ختم ہو گئی اور صرف اس (خدا) کا خیال رہ گیا۔ اس حالت میں میرا یا تیرا نہیں بلکہ اسی خدا کا دیکھنا ہوتا ہے)

فنا کا حصول مطلوب ہو تو سالک کو پہلے ذکر کا طریقہ سکھایا جاتا ہے اور پھر وہ باقاعدگی سے روزانہ اتنے عرصے کے لئے ذکر میں مشغول رہے کہ ذکر کے مطلوبہ اثرات رونما ہونے لگیں اور سالک خود بھی محسوس کرے کہ اس کو ذکر کی ریاضت سے کیا کچھ حاصل ہوا ہے۔ عرصہ دراز تک نفی ماسوا اللہ کی مشق کرتے کرتے سالک پر دن رات میں وقتاً فوقتاً ذکر کے دوران ایسی بے خودی سی طاری ہو جاتی ہے جس میں سالک کو اپنے ماحول کا بہت دھندلا سا خیال باقی رہ جاتا ہے اور وہ خود کو کھویا کھویا سا محسوس کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کے دل و دماغ میں صرف اللہ کا ہی احساس باقی رہ جاتا ہے۔ یہ بے خودی کی کیفیت بڑھ جائے تو اس کے ذہن میں پیار، نفرت، غصہ کے خیالات نفی ہونے کے ساتھ ساتھ جسم اور ماحول کے باقی ہونے کا احساس بھی جاتا رہتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ محسوس ہو رہا ہے وہ اللہ ہی اللہ ہے۔

فنا چار قسم کی ہوتی ہے۔ فنائے افعال، فنائے صفات، فنائے ذات اور مکمل فنا۔ پہلی تین قسموں میں اپنے اور خلق کے افعال، صفات اور ذات کو حق تعالیٰ کے افعال، صفات اور ذات میں علی الترتیب فنا کر دینا ہے۔ جب نفی ہو جائے تو سالکان طریقت کی چار طرح پر کیفیات دیکھنے میں آتی ہیں۔ (۱) پہلی کیفیت یہ کہ نفی میں سالک کا ماحول اور اس کی اشیاء کی طرف خیال رہتا ہے اور اسے اپنی ہستی کا خیال بہت کم ہوتا ہے۔ جب وہ ان اشیاء کو تسبیح اور سجدہ کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اگر سالک ناپختہ کار ہے تو یہ سمجھنے لگتا ہے کہ مخلوق اس کو سجدہ کر رہی ہے۔ (۲) نفی کی دوسری حالت یہ ہوتی ہے کہ اس میں اشیاء کا خیال بالکل نفی ہو جاتا ہے لیکن اپنی ہستی کا کچھ نہ کچھ خیال موجود رہتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ خود کو کُل کا ایک جزو تصوّر کرتا ہے۔ (۳) نفی کی تیسری کیفیت یہ ہے کہ سالک کے دل

میں اپنی ہستی اور اللہ تعالٰی کی ہستی یعنی دونوں کے احساسات مدغم ہو جاتے ہیں اور خود کو ہی سب کچھ سمجھ لیتا ہے (اناالحق والی کیفیت) اور (۴) چوتھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اپنی ہستی کا خیال مکمل طور پر غائب ہو جاتا ہے اور اللہ کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔ اس حال میں نہ احساس کرنے والا رہتا ہے اور نہ ہی محسوسات۔ یہ مکمل نفی کی کیفیت ہے۔ چوتھی قسم کی کیفیت جب پختہ ہو جائے اور سالک اپنی کوشش جاری رکھے مگر اس حال میں قیام نہ کرلے تو پھر وہ اللہ کی ہستی کو، اپنی ہستی کو اور مخلوق کو الگ الگ محسوس کرنے لگتا ہے یا ان کو دل کی آنکھ سے دیکھنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اللہ، اللہ ہی ہے اور مخلوق، مخلوق ہے۔ جیسے ابن عربیؒ نے کہا کہ بندہ، بندہ ہی ہے خواہ وہ کتنا ہی عروج حاصل کیوں نہ کرلے اور اللہ، اللہ ہی ہے خواہ وہ کتنا ہی نزول کر جائے۔

کوائف اور احوال ہر وقت طاری نہیں رہتے۔ کیفیت دیرپا نہیں ہوتی۔ حال وارد ہونے لگے تو سالک کے افعال اور اقوال میں سکر اور صحو دونوں حالتوں میں یقین جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اس بات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے قرآن میں اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں فرمایا وہ حرف بحرف درست ہے۔

ربط الٰہی قائم ہو جائے تو روح رقص میں آجاتی ہے اور غیر معمولی تصرف حاصل کرلیتی ہے۔ ایسی حالت میں سالک کے دل میں جذبِ کلیم پیدا ہو جاتا ہے اور ایسے امور اس سے وجود میں آتے ہیں کہ جن سے وہ زمین اور آسمان کو اپنے تصرّف میں لا سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مولانا رومؒ کے کلام میں غوطہ لگانے والے صوفی جسم کو وجد یا رقص میں لانے کی بات تو کرتے ہیں لیکن مولانا رومؒ نے رقص روح پر جو کلام کیا ہے اس سے اپنی آنکھیں بند کرلی ہیں۔ مولاناؒ نے فرمایا ہے کہ تن کا رقص تو صرف خاک اڑاتا ہے لیکن جان کا رقص کائنات کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ بعض صوفیاء خود کو اور اپنے مریدوں کو بھی ذکر کی مجلسوں میں رقص کی کیفیت میں لے آتے ہیں۔ کچھ صوفیائے کرام عارفانہ کلام پڑھ کر یا محافلِ سماع منعقد کرتے ہوئے کیفیات وجد اور رقص طاری کرنے کے ذریعے سرور اور کیف کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مولانا رومؒ اور علامہ اقبالؒ کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں "رقصِ جاں" یعنی روح کو رقص میں لانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ درج ذیل اشعار سے معلوم ہوگا کہ رقصِ جان کیا ہے اور اس کے حاصل ہو جانے سے انسان کو تسخیر خلق کی قوت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ ؎

رقصِ تن در گردش آرد خاک را　　رقصِ جاں برہم زند افلاک را
(تن کا رقص صرف خاک کو اڑاتا ہے　　لیکن جان کا رقص افلاک میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے)

علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست　　ہم زمیں، ہم آسماں آید بدست

(رقص جاں سے علم و حکمت ہی نہیں ہاتھ آتے بلکہ زمین و آسمان بھی ہاتھ آجاتے ہیں)

فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم ملت ازوے وارثِ ملکِ عظیم

(اس رقص سے فرد جذبِ کلیم حاصل کر لیتا ہے اور ملت اس کی وجہ سے ملک عظیم کی وارث بنتی ہے)

رقصِ جاں آموختن کارے بود غیرِ حق را سوختن کارے بود

(رقص جان سیکھنا کار دارد ہے یہ غیر اللہ کو جلا دینا ہی بڑا کام ہے)

تا زنارِ حرص و غم سوزد جگر جاں بہ رقص اندر نہ آید اے پسر

(جب تک کچھ ملنے کی حرص اور غم نے تجھے ستائے رکھا ہے۔ اے بیٹے! اُس وقت تک تیری روح رقص میں نہیں آسکتی)

رقصِ جاں کی حقیقت کو واضح اور متعیّن کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس کا حاصل ہونا ابتدائی روحانی تصرّف حاصل ہونے کے بعد ہی ممکن ہے اور روحانی تصرّف کی ابتدا سوائے ذکر و فکر اور اتباع شریعت کے ممکن نہیں۔ ذکر ایک ایسی عبادت ہے کہ جس سے قلب میں بے تحاشا حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس کی میل کچیل اور زنگ دور ہو جاتا ہے۔ ذکر سے نفس کی کجی اور خباثت بھی دور ہو جاتی ہے اور نفس اپنی شرارتوں اور بغاوتوں سے باز آجاتا ہے اور غیر اللہ کی رغبت کو جلا دیتا ہے۔ یہ تمام اوصاف ذکر سے ہی نصیب ہوتے ہیں اور آخر کار ذکر الٰہی سالک میں کیفیت جذب اور وجد پیدا کر کے روح کو رقص میں لے آتا ہے۔

ذکر و فکر کے کملات اور اثرات یا کیفیات کا پیدا ہونا کسی شیخ کامل کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلنے کے بغیر ممکن نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب رابطۂ شیخ کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا جائے تو روح کے باقی ماندہ تمام اسرار اور احوال بھی کھلتے جاتے ہیں۔ جب رقص روح کا مرحلہ طے ہو جائے تو یہ رقص علم و حکمت پیدا کر دیتا ہے اور تاج و تخت بھی اسی کے نتیجے میں ملتے ہیں اور زمینوں اور آسمانوں کی اقلیم پر مرد مومن کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ جب افراد کو جذب کلیم مل گیا تو موجودات پر تصرّف حاصل ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف بھی حاصل ہوتا ہے۔ ایسے باکمال لوگوں کو ملکِ عظیم کی وراثت سے کون روک سکتا ہے۔

جب ہم آج کے زمانے میں ٹی۔ وی پر نوجوانوں کے لئے پیش کئے جانے والے راگ و رنگ کے پروگراموں کی فحاشیوں اور شرمناک حرکات کو دیکھتے ہیں تو یہ امر بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ان اخلاق سوز پروگراموں کے ذمہ دار لوگ ہماری نسل کو کون سے مقام پر پہنچنے کا پیغام دے رہے ہیں۔ یقیناً وہ قوم کو تباہی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ قوم کی حالت کو دیکھ کر علامہ اقبالؒ کا یہ شعر آج بھی ہم پر صادق آرہا ہے۔ "سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا"۔ قوم کو تباہی کی راہوں کی طرف رہنمائی کرنے والے لوگ جب خدا کی بارگاہ میں مجرموں کی طرح پیش کئے جائیں گے

تو اس گناہ عظیم سے اپنے ہاتھ رنگنے کے متعلق کیا عذر پیش کریں گے؟ وہ کس قدر گناہ عظیم کر رہے ہیں، یہ بات انہیں قیامت سے پہلے ہی سوچ لینی چاہیے۔

علامہ اقبال ؒ قوم کے جوانوں کے سامنے رقص جاں کے کملات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ میری جانِ ناشکیب کی تسکین اسی میں ہے کہ اگر تمہیں رقصِ جاں نصیب ہو جائے کیونکہ دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا راز اسی میں ہے جو میں نے تمہیں سمجھا دیا ہے۔ ایک اور مقام پر علامہ ؒ نے انہی اصولوں کو نوجوانوں کے لئے حفظِ جان اور حفظِ تن کے قوانین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درج ذیل اشعار میں وضاحت کی ہے:۔

حاکمی در عالمِ بالا و پست جز بہ حفظِ جان و تن ناید بدست

(زمین اور آسمان پر حکومت حاصل کرنا حفظِ جان اور حفظِ تن کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا)

حفظ جاں ہا ذکر و فکرِ بے حساب حفظِ تن ہا ضبطِ نفس اندر شباب

(جانوں کی حفاظت بے شمار ذکر و فکر کرنے سے ہوتی ہے اور جسموں کی حفاظت جوانی میں نفس کی نگہداشت کے باعث ہوتی ہے)

علامہ اقبال ؒ جب تک زندہ رہے ان کی تمام تر کوششیں اس امر میں صرف ہو گئیں کہ قوم کے نوجوانوں کو رقص و سرور کی محفلوں سے روکنے کے بعد ایک دیندار اور باعزت قوم بنتا ہوا دیکھیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی میں اپنی قبر میں تمہارے لئے دعا کرتا رہوں گا۔

اے مرا تسکین جانِ ناشکیب تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب

(اے بیٹے! میری جان ناشکیب کی تسکین اس میں ہے کہ تو اگر رقص جان میں سے اپنا حصہ لے لے)

سرِّ دینِ مصطفیٰ گویم ترا ہم بہ قبر اندر دعا گویم ترا

(یہی دینِ مصطفیٰ کا راز ہے جو میں تجھے بتا رہا ہوں میں قبر میں بھی تیرے لئے دعا کرتا رہوں گا)

طریقِ رابطہ وسیع المعانی کملات کا حامل اور سالک کی روحانی رفعت کا مکمل ضابطہ ہے۔

کسے معلوم کہ طریقِ رابطہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سالک میں کون کون سی طاقتوں کو حرکت میں لایا جاتا ہے؟ اس سوال کا جواب فقط اہل اللہ کے افہام اور دانست سے باہر تلاش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عوام اور عام علماء ان گہرائیوں میں اترنے میں قطعاً دلچسپی نہیں رکھتے۔ طویل گفتگو سے اجتناب کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علامہ اقبال ؒ نے اپنے کلام میں "مردِ مومن" کے لئے جن صفات کا پایا جانا ضروری قرار دیا ہے اور اس مقام تک پہنچنے کی راہ کی وضاحت بھی کی ہے، وہی ایک کامل ولی کا معیار ہے جو ہم کسی مرشد کامل کی رہنمائی میں طریق رابطہ کے ذریعے بآسانی حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس قوم کے ۹۵ فیصد لوگوں نے نہ تو علامہ کے

کلام کی طرف ہی توجہ دی ہے اور نہ ہی کسی مردِ کامل کی معیت میں آنا پسند کیا ہے۔ قارئین کی سہولت کے لئے درج ذیل تحریر میں اس بات پر ایک مختصر لائحہ عمل پیش کیا جارہا ہے کہ طریق رابطہ کے ذریعے ہم مطلوبہ معیار تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں اس گفتگو کو صرف چند نکات میں پیش کیا جارہا ہے۔ مزید تفصیل اگر مطلوب ہو تو دینی کتب کا مطالعہ یا مشائخ کرام سے استفسار کیا جائے۔

i - اپنی دنیاوی اور اُخروی زندگی کی حقیقت حال کو معلوم کرنا

ایسی یافت کو "مَنْ اَنَا" کہا جاتا ہے یعنی میں کون ہوں۔ صوفی شاعروں نے اس پر بہت کلام کیا ہے۔ حضرت بُلھے شاہ ؒ نے کہا "بُلھیا کی جاناں میں کون؟" ایک عام انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ عمر کے جس حصے میں بھی ہو، اس بات کی تحقیق کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کیوں پیدا کیا یعنی اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ ذرا اس طرف بھی غور کرنا ضروری ہے کہ کیا میری زندگی کی روش اسی جانب رواں دواں ہے جس کی خاطر مجھے پیدا کیا یا یہ اس کی مخالفت سمت میں جارہی ہے؟ یہ حقیقت معلوم کرنا بھی نہایت اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں کیا کیا صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں اور ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے میرا مقام کس قدر بلند یا پست ہے؟

ہمارے گردو پیش ایسے لوگوں کی اکثریت نظر آتی ہے جو خدا کے وجود کا زبان سے تو اقرار کرتے ہیں مگر حقیقتاً وہ خدا پر اس قدر یقین نہیں رکھتے کہ جس سے وہ اسلامی احکام پر عمل پیرا ہو جائیں۔ ایسے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی عالم سے ان دلائل اور براہین کا علم حاصل کریں جس سے خدا کی حقانیت (یعنی واقعی کوئی خدا موجود ہے) کا یقین ہو جائے۔ خدا کے وجود کو ثابت کرنے والے دلائل وہ ہوتے ہیں جن کے معلوم ہونے کے بعد حَقُّ الْیَقِیْن پیدا ہو جائے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کی کتاب "نشان منزل" میں تقریباً ۳۵ دلائل ایسے لکھ دیئے گئے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد اکثر قارئین کو خدا پر کامل یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کے جاننے کے بعد یقیناً یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ایک خدا ضرور موجود ہے اور اگر یقیناً ایک خدا موجود ہے تو پھر مرنے کے بعد جنت یا دوزخ میں سے کسی ایک گھر میں جانا ہوگا بلکہ مرنے کے بعد قبر میں ہی جزا اور سزا کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ نافرمانوں کے جسم قبر میں گل سڑ جاتے ہیں اور فرمانبرداروں کے ابدان قیامت تک عین اسی طرح رہتے ہیں جس طرح وہ دنیا میں ترو تازہ تھے۔ ہر ایک کا مرنا یقینی ہے تو پھر یہ خیال کرنا کہ ہم کچھ عرصہ بعد نماز و روزہ کا اہتمام شروع کر دیں گے بالکل احمقانہ خیال ہے کیونکہ کوئی بندہ کسی وقت بھی مر سکتا ہے۔ زندگی اور موت کی اگر ایسی صورت حال ہو تو ہمیں ہر وقت موت کی تیاری میں رہنا چاہئے اور نیک اعمال کو التوا میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ ذرا سوچو کہ اگر آج ہی مر گئے تو خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے؟ اس عیش و عشرت کی زندگی کی خواہش نے غافل لوگوں کو جہنم کے کنارے تک پہنچا دیا ہے۔ یہ عیش اور آرام کی زندگی جو محض چند روز کے لئے

ہے انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کا رنج و غم اور خدا کی ناراضگی تک پہنچا دیتی ہے۔ خیال کریں کہ کیا حال ہو گا جب آخرت کا عذاب ہمیشہ کے لئے ڈستا رہے گا؟ ایسی نافرمانی کی زندگی سے توبہ کریں اور آج سے ہی اللہ کو راضی کرنے کا اہتمام شروع کر دیں۔ وہ راضی ہو گیا تو پھر دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی عیش اور آرام ملتا ہے۔ اس دنیا کے عیش کے لئے دنیا کے سکون اور آخرت کے ابدی انعامات کو داؤ پر نہ لگائیں۔ مذکورہ کتاب "نشان منزل" اس معاملے میں پوری رہنمائی کرتی ہے۔ اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ آج ہی سے اگر توبہ کر لو گے تو خدا فوراً راضی ہو جائے گا۔ اس توبہ کے بعد کیا کرنا ہے اس کی وضاحت اگلے نکات میں ملاحظہ کریں۔

ii انسان میں موجود تمام کملات کا ملاحظہ کرنا. یہ بات ہم سب کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان تمام خوبیوں اور کملات کا ملاحظہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو بحیثیت اپنے نائب منتخب کرنے کے عطا کی ہیں اور ان تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہر پکے اور سچے مسلمان کے لئے مذہبی ذمہ داری ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو وہ صلاحیتیں عطا کر دی ہیں جن کے باعث وہ اللہ تعالیٰ کی طرف پرواز کر سکتا ہے۔ اس پرواز کے باعث ہم بلند روحانی مقامات حاصل کر سکتے ہیں اور آسانی سے اللہ تعالیٰ کا قرب بھی میسر ہو سکتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ کا قرب مل جائے تو اسے ایسے انوار حاصل ہو جاتے ہیں جن سے اس کی شخصیت کامل ہو جاتی ہے اور اس کو پورے عالم پر تصرف حاصل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر ہر انسان کے دل میں اس منزل کو حاصل کرنے کی آرزو، درد، شوق اور اضطراب ودیعت کر رکھا ہے اور یہی اضطراب انسان کو بلندی کی طرف پرواز کرنے کے لئے حرکت میں لاتا ہے، بشرطیکہ وہ اپنے اندر مخفی جذبات کی پرورش کرتا رہے۔ علامہ اقبالؒ "شبنم کے اڑنے کو سورج کی گرمی سے نہیں مانتے کیونکہ سورج کی گرمی سے تو پھول کی ایک پتی بھی اڑ نہیں سکتی، آپ فرماتے ہیں " یہ رفعت کی تمنا ہے جو لے اڑتی ہے شبنم کو" چنانچہ پہلے اپنے دل میں رفعت کی تمنا پیدا کی جائے، پھر آپ دیکھیں گے کہ آسمان بھی آپ کے پروں کے نیچے آجائے گا۔ علامہؒ نے اس موضوع پر بہت کلام کیا ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں ۔

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے　　نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا　　آسمان چیر گیا نالہء بیباک مرا

مقامِ شوق ترے قُدسیوں کے بس کا نہیں　　انہیں کا کام ہے یہ جِنکے حوصلے ہیں زیاد

ہر لحظہ نیا طُور، نئی برقِ تجلی اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

نگاہِ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

iii لذّتِ پرواز کا جذبہ اور اس پرواز کی قوت کو حاصل کرنا۔ انسانی خمیر مٹی سے تیار ہوا ہے اور اس کی فطرت زمین کی طرف مائل ہونا ہے جس کو علامہ نے جذبِ خاک کا نام دیا ہے۔ جو افراد خاکی اثرات سے متاثر ہو جائیں تو ان کا آسمان کی طرف پرواز کرنا ممکن نہیں رہتا بلکہ وہ پست ہمتی کے باعث اخلاق رذیلہ (کینہ، بغض، حسد، تکبر، غفلت وغیرہ) کا شکار ہو جاتے ہیں اور کسی مفید کام کے لئے موزوں نہیں رہتے۔ جب ان کا جسم خاکی اثرات سے آزاد ہو جائے تو آسمانی یا سماوی خصلتیں اور نورانی صفات سے متصف ہو جاتا ہے۔ نفس اور بدن کا تقاضا اور کشش خاکی خصلت کی طرف جھکنا ہے، مگر روح نورانی اوصاف رکھتی ہے اس لئے اس کو نفس کی ہمسائیگی سے بچا کر رکھنا چاہئے۔ روح کے لئے اگر صحیح روحانی تربیت کا انتظام کیا جائے تو اس میں رفعت اور بلند پروازی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بہت بڑے بڑے کام کر جاتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان میں انسانوں جیسی خصلتیں صرف اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب روح کو مناسب تربیت مل جائے اور نفس کو مہذب کر دیا جائے۔ یہ مضمون بہت طوالت طلب ہے لہٰذا راقم الحروف نے نفس کی آفات پر ایک مکمل کتاب "تہذیب نفس" کے نام سے لکھ دی ہے جو ایک الگ کتاب کی شکل میں شائع ہو کر منظر عام پر آ رہی ہے۔ یہاں علامہ کے چند اشعار پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔

جہاں میں لذتِ پرواز حق نہیں اس کا وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز کر سکتا ہے وہ ذرّہ مہ و مہر کو تاراج
ناوک ہے مسلمان! ہدف اس کا ثریا ہے سرِّ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا اے قطرۂ نیساں! وہ صدف کیا، وہ گہر کیا

نفس کی تادیب اور اصلاح کے لئے اتباع شریعت اور مرشد کامل کی صحبت سے بڑھ کر کوئی نسخہ نہیں۔ مرشد سے وقتاً فوقتاً اصلاحی پہلو نمودار ہوتے رہتے ہیں اور طریق رابطہ مرشد سے ربط اور رہنمائی حاصل کرنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔

علامہ اقبال ؒ نے اپنے کلام میں مسلمانوں کو ایسے اسباق دینے کا اہتمام کیا ہے کہ وہ ہمہ وقت اپنی منزل کی طرف محو پرواز رہیں اور اس کی طرف سعی پیہم میں اپنی ہمت اور انہماک کو تازہ

دم کرنے میں مصروف رہیں۔ جب مسلمان اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہنے کی کوشش سے غفلت کا اظہار کرتا ہے تو اس کو اپنا مقصود حاصل کرنے میں ناکامی کا سامنا کرنا ایک لازمی نتیجہ ہو گا۔ علامہ کے نزدیک وصل الٰہی کی تمنا سے غافل نہ ہونا، طلب اور عشق الٰہی سے پہلو تہی نہ کرنا اور خدا کے وصل کو حاصل کرنے کے لئے رات دن سفر میں رہنا ایک مرد مسلمان کو ہمیشہ اپنا شعار بنائے رکھنا چاہئے۔ ایسے مسلمانوں پر افسوس ہے کہ وصل الٰہی کا یہ راستہ ترک کر کے ان مقامات سے محروم رہے جن کا وعدہ ان کے خالق نے روز ازل ان کے ساتھ کیا تھا۔ علامہ کا خیال ہے کہ ایک مومن صرف اسی وقت مومن کہلا سکتا ہے جب اس کے دل میں سوز و گداز کی شمع روشن رہے اور اس کی طبع میں روشن ضمیری، تحمل، ہمت، بردباری، رواداری اور قلندرانہ ادائیں، اتباعِ شریعت کے ساتھ نشوونما پاتی رہیں۔ یہ اوصاف اگر کسی انسان میں پائے جاتے ہیں تو وہ کسی طاقت سے نہیں ڈرتا اور بڑی سے بڑی مشکلات اس کی راہ کو روک نہیں سکتیں۔ اس میں وہ جوش و سوز پوشیدہ ہوتا ہے جو مرنے کے بعد بھی سرد نہیں ہوتا۔ سوز دوام اور سیر مدام اس کی زندگی کا مشرب بنتا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

با مقامے در نمی سازیم و بس ما سراپا ذوقِ پروازیم و بس

(ہم کسی مقام کے ساتھ موافقت نہیں کر سکتے ہم سراپا ذوقِ پرواز ہیں اور بس)

ہر زماں دیدن تپیدن کارِ ماست بے پر و بالے پریدن کارِ ماست

(ہر لحہ دیکھنا اور تڑپتے رہنا ہمارا کام ہے بغیر پروبال کے اڑتے رہنا ہمارا کام ہے)

علامہ فرماتے ہیں کہ انسان کو جب اپنے مقصود سے عشق ہو جائے تو ایسا شخص کبھی آرام اور سکون حاصل نہیں کر سکتا بلکہ اللہ کے جمال کے بغیر آرام نہیں پاتا۔ اپنے مقصود تک پہنچنے کے لئے وہ ہمہ وقت رواں دواں رہتا ہے۔

عشق در ہجر و وصل آسودہ نیست بے جمالِ لازوال آسودہ نیست

(عشق کو ہجر و وصال میں آسودگی نہیں ملتی بلکہ وہ ذات لازوال (اللہ) کے جمال کے سوا آسودہ نہیں ہوتا)

ابتداء پیش بتاں افتادگی انتہا از دلبراں آزادگی

(عشق مجازی کی ابتدا حسنِ بتاں میں گرفتاری ہے اور اس کی انتہا ان حسینوں سے آزاد ہو جاتا ہے)

عشق بے پرواہ و ہر دم در رحیل در مکان و لامکاں اِبْنُ السَّبِیلِ

(عشق بے نیاز ہے اور ہر دم سفر میں رہتا ہے مکان و لامکان میں مسافر کی طرح ہوتا ہے)

کیشِ ما مانندِ موجِ تیزگام اختیارِ جادہ و ترکِ مقام

(ہمارا مسلک موجِ تیزگام کی طرح ہے یعنی ہم ہمیشہ راستہ اختیار کرتے ہیں اور مقام کو ترک کرتے ہیں)

iv لذتِ شوق برقرار رہے تو دیدار کی نعمت ملتی ہے۔

صوفیاء کے نزدیک ایسا شخص انسان ہی نہیں جو اللہ کی یاد (نماز و روزہ وغیرہ) سے غافل ہو اور اللہ کی طرف پرواز (یعنی اس کی تلاش یا سراغ لگانے) کی لگن ہی اس کے دل میں موجود نہ ہو۔ اگر سالک کے دل میں ایسا ذوق و شوق موجود ہو اور اس راہ میں انہماک بھی رکھتا ہو تو وہ نعمتِ دیدار سے ضرور ہمکنار ہوتا ہے۔ لذتِ شوقِ دیدار کا دل میں پیدا ہونا ہی ایک قابل قدر بات ہے کیونکہ یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ شوق دیدار عام طور پر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہی نہیں ہوتا اور جب یہ شوق پیدا ہو جائے تو سمجھیں کہ کسی نہ کسی دن وہ دیدار کی نعمت سے ضرور سرفراز ہو گا۔ یہ شوق جب دل میں پیدا ہو جائے تو اس پر اللہ تعالیٰ سے استقامت طلب کرنا چاہیے اور اس کی پرورش کرنا چاہیے۔ علامہ اقبال ؒ فرماتے ہیں کہ لذتِ شوق علم حاصل ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ علم وہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے جس سے ذوق و شوق اور تمنائے دیدار پیدا ہو۔

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لئے
لذتِ شوق بھی ہے، نعمتِ دیدار بھی ہے

ترا نظارہ ہی اے بوالہوس مقصد نہیں اس کا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو

غلط نگر ہے تری چشمِ نیم باز اب تک
ترا وجود تیرے واسطے ہے راز اب تک

ہے ذوقِ تجلّی بھی اِسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

عالم ہے فقط مؤمنِ جانباز کی میراث
مؤمن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

v اللہ کی ذات کے تصور میں غوطہ لگانا ہی طریق رابطہ کا مفہوم ہے۔

علامہ اقبال ؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے دل میں ہر چیز منعکس ہوتی ہے اور اہلِ نظر اس کو دیکھنے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود کو بھی مومن کے سینے میں سما جانے کی حدیثِ قدسی ہم تک پہنچائی ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنے دل میں غوطہ لگائے اور اس کو ڈھونڈ نکالے، بلکہ علامہ اقبال ؒ نے ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ پر کمند ڈالنے کی طرف اشارہ کیا ہے (یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ) اس موضوع پر علامہ کا کلام طویل ہے چنانچہ اسے یہاں شامل کرنا ممکن نہیں۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو زمانہ (یعنی الدھر) کہا ہے لہٰذا تم اس زمانے میں غوطہ لگاؤ اور یہ غوطہ لگانا ہی طریقِ رابطہ کا مفہوم ہے۔

غوطہ در دِل زن کہ بینی رازِ وقت
نغمہ خاموش دارد سازِ وقت

(ساز وقت کا نغمہ خاموش ہوتا ہے۔ دل میں غوطہ لگاؤ تاکہ تم وقت کے راز کو دیکھ سکو)

علامہ نے دل میں غوطہ لگانے سے مراد دل کی گہرائیوں میں ڈوب جانا لیا ہے یعنی مراقبے میں بیٹھو اور ریاض کرو تو وجدان بتائے گا کہ زمان یعنی وقت کی حقیقتِ اصلیہ کیا ہے۔

vi کسی مردِ راہدان کا طالب ہونا اور مصروفِ ریاضت ہونا۔ جب یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اپنے دل میں ایسی رفعت کا ذوق پیدا کرنا ضروری ہے تو اس طریق کو مکمل کرنے کے لئے کسی بزرگ کا رابطہ حاصل کرنا ایک لازمی امر ہوتا ہے تاکہ لذتِ پرواز حاصل ہونے لگے۔ اس میں مزید کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے کسی مرشد کامل کے زیرِ نگرانی مجاہدات اور ذکر و فکر کی ریاضت میں کمال حاصل کرے ورنہ یہ پرواز ادھوری رہ جائے گی۔ ریاضتوں اور مجاہدوں کے بغیر کام نہیں بنتا۔ ریاضتوں کی تفصیل کے لئے ہماری روحانی کتابوں کے مطالعے اور مشائخ کرام کی صحبت کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ بات مشہور ہے "یہ اللہ والے ہیں جو اللہ سے ملا دیتے ہیں"۔ لہٰذا یہ جو منازل بلند و بالا طے ہوتی ہیں وہ رابطۂ شیخ کے ساتھ ہی طے ہوتی ہیں۔

vii افکارِ روحانی کی پختگی کے لئے خلوت اختیار کرنا۔ خلوت روحانی دنیا کی ضروریات میں سے ہے اور سالکین طریقت کو کچھ دیر تنہائی میں وقت گزارنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ گفتگو راقم الحروف کی کتاب "حضور قلب" میں گزر چکی ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ عاشق لوگ اپنے محبوب سے محض لمحہ بھر کی دوری بھی قبول نہیں کرتے، لہٰذا ہر وقت دل کا جھکاؤ اپنے دوست کی طرف رکھنا ہی بہتر ہے۔ بیکار انسان کا ذہن آوارگی کے باعث شیطان کی غلامی میں آجاتا ہے اور وہ اسے ہمیشہ برے کاموں میں الجھائے رکھتا ہے۔ صوفیاء کا خیال ہے کہ سالک جس حال میں بھی ہو، ہمہ وقت تصورات کی دنیا میں اپنے شیخ کے سامنے رہے کیونکہ محبت کے ساتھ شیخ کی رفاقت (بدنی رفاقت ہو یا ذہنی یا قلبی رفاقت) میں رہنے سے محبت اور فیضان میں اضافہ ہوتا ہے اور اس طرح کرنے سے انسان اللہ کے ساتھ قرب میں اضافہ ہی کرتا چلا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

بجلوت نے نوازی ہائے من بیں ۔۔۔ بخلوت خود گدازی ہائے من بیں

(جلوت یعنی بزم میں میری نغمہ سرائی دیکھو خلوت میں میرا اپنے آپ کو غم میں گھلا دینا دیکھو)

گرفتم نکتۂ فقر از نیاگاں ۔۔۔ بِزسلطاں، بے نیازی ہائے من بیں

(میں نے بزرگوں سے فقر کا ایک نکتہ پایا ہے لہٰذا سلطان سے میری بے نیازی کا عالم دیکھو)

یک لحظہ ازاں دوری نشاید ۔۔۔ کہ از دوری خرابی ہا فزاید

(اس (اللہ) سے ایک لمحہ کی دوری بھی مناسب نہیں کیونکہ دوری سے خرابیاں بڑھتی ہیں)

بہر حالے کہ باشی پیشِ اُو باش ۔۔۔ کہ از نزدیک بودن فضل زاید

(جس حال میں بھی ہو اسی کے سامنے رہو کیونکہ (خدا کے) نزدیک رہنے سے فضل بڑھتا ہے)

viii طریقت کے بنیادی نکات کا لحاظ کرنا۔ طریقت کے تمام سلاسل میں کچھ بنیادی اصول مقرر کیے گئے ہیں۔ ایسے نکات کا لحاظ رکھنا اس قدر ضروری ہے کہ اس راہ میں ان کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ ان نکات کا مفصل بیان انشاء اللہ "اسلام اور روحانیت" کی کتاب میں بیان کیا

جائے گا یہاں پر یہ نکات نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیے جا رہے ہیں۔ حضرت بہاؤالدین نقشبندؒ نے درج ذیل دس نکات کو تصوف کی بنیاد قرار دیا ہے۔

۱۔ اصلاحِ نفس۔ حضرت بہاؤالدین نقشبندؒ فرماتے ہیں کہ سالک کو چاہئے کہ وہ اپنے نفس کو اپنا دشمن تصور کرے اور اسے فرعون سے بھی زیادہ ذلیل اور بدتر سمجھے۔ جب آپ اصحاب کہف کے کتے کے متعلق قرآن میں پڑھتے کہ اُن کا کتا غار کی چوکھٹ پر اپنی کلائیاں پھیلائے بیٹھا ہے تو آپ فرماتے کہ ہم امید کرتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ مقام عطا فرما دیں گے۔

۲۔ ذِکرِ الٰہی۔ آپ ذکر میں اخفا کو ملحوظ خاطر رکھا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ تیر بادشاہ کے ترکش سے لیا جانا چاہئے یعنی ذکر کو کسی کامل ذاکر سے اخذ کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف میں صحبت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ سیرِ انبیاء و اولیاء۔ سالک کو انبیاء اور اولیاء کی صفات کا یوں مطالعہ کرنا چاہئے کہ وہ خود بھی ان کی سیرت میں رنگا جائے۔ آپ کی اس سے مراد یہ ہے کہ جب ان کے ملفوظات کو پڑھے تو ان ملفوظات کے انوار کو اپنے اوپر وارد کرے۔

۴۔ محبتِ فقر اور رزق حلال۔ احادیث میں آیا ہے عبادت کے دس حصوں میں سے نو حصوں کا تعلق فقط رزق حلال سے ہے۔ جب تک کسی کو نماز میں رزق حلال کے یہ نو حصے نصیب نہ ہوں تو نماز میں حضور کیسے نصیب ہو سکتا ہے۔ فقر خالق سے لیتا اور مخلوق میں تقسیم کرتا ہے۔ سالک فقیر کو اپنے اوپر جبری طور پر طاری نہ کرے بلکہ اس کے ساتھ محبت رکھے۔

۵۔ ایثار۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ تحفے لو اور تحفے اضافے کے ساتھ واپس لوٹایا کرو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم تھا کہ جو تمہیں محروم کرے تم اس کو عطا کرو۔ فقراء، بادشاہوں اور امراء کے دروازوں کے سائل نہیں ہوا کرتے۔ فقیر دنیا کے لئے غنی ہوتا ہے۔

۶۔ خلوت در انجمن۔ فرماتے ہیں کہ خلوت در انجمن طریقہ نقشبندیہ کی بنیاد ہے یعنی فقیر کا ظاہر خلق کے ساتھ دکھائی دے اور باطن اللہ تعالیٰ کے ساتھ۔ اس سے آپ کی مراد یہ تھی کہ فقیر بیٹھا جلوت میں نظر آئے لیکن اس کا دل اللہ کے ساتھ مشغول ہو۔ آپ فرماتے تھے کہ جلوت میں شہرت ہوتی ہے اور شہرت نفس کے لئے آفت ہے۔ اس لئے تصوف کسی وضع قطع یا ہیئتِ کذائیہ کا نام نہیں بلکہ خلوت در انجمن کے اصول پر کارفرما رہنے کا نام ہے۔ راقم الحروف کا تجربہ ہے کہ پانچ منٹ کے لئے اگر مراقبہ یا ذکر خفی کیا جائے تو مراقب کے قلب میں انوار الٰہی کا طوفان پیدا ہو جاتا ہے۔

۷۔ نفیٔ وجود۔ آپ فرماتے تھے کہ یہ طریقہ نفیٔ وجود کا اقرب الطرق ہے۔ فرمایا عبادت کرو اور عبادت سے عبودیت تک پہنچو کیونکہ عبادت میں طلب وجود ہے اور عبودیت میں نفی وجود ہے۔ (عبودیت میں بندہ کا مرتبۂ الٰہیہ سے اللہ کی معیّت میں خلق کی طرف لوٹ آنا ہے اور کمالات باطنی کو کماحقہ حاصل کر کے ہدایت خلق کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ عبودیت خاص بندوں کی عبادت کہلاتی ہے اور اس میں مکاشفہ حاصل ہوتا ہے۔ اہل عبودیت اپنے دل پر اللہ کے ساتھ معاملہ میں بخل نہیں کرتے یعنی نفس کی بات نہیں مانتے اور ہر حال میں اللہ کا بندہ بنے رہتے ہیں۔ عبادت گذار خدا کی رضا کا طلبگار رہتا ہے اور جب وہ عبودیت میں آکر عبد بن جائے تو پھر خود رب کائنات اس کا طالب ہو جاتا ہے)۔

۸۔ اتباعِ سنت۔ اِتباعِ سنت اور آثار صحابہ کو لازمی جاننا اور اس میں غفلت نہ کرنا طریقت کی ضروریات میں سے ہے۔ ایسا کرنے سے سالک کو ایسی فتوحات نصیب ہوتی ہیں جو کسی اور چیز سے نہیں ہوتیں۔

۹۔ ادب۔ ادب یہ ہے کہ ماسویٰ اللہ سے قلب اور اذہان کو منقطع کر لے اور ادبِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہے کہ موجودات اور خالق کے درمیان واحد واسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جانے۔ ادب اولیاء یہ ہے کہ ان کی مخالفت نہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کے ساتھ دشمنی مول لینے والے کے ساتھ کھلی جنگ کا اعلان کیا ہے۔

۱۰۔ خدا طلبی۔ آپ فرماتے ہیں کہ سالک اپنے محبوب کا طالب اور جویاں رہے اور اس کی زندگی اور موت کا مقصد محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو پانا ہو یعنی ہر حالت میں اس کا مقصود اللہ تعالیٰ کی ذات ہو اور اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اطاعت کے ذریعے حاصل کرے۔

ix طریقِ رابطہ ہاتھ آجائے تو پھر جہاں تک ہمت ہو پہنچ جاؤ۔ اس کتاب کے مضامین کا واحد مقصد یہ ہے کہ قارئین پر یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ جب کوئی شخص صدق دل سے کسی شیخ کا دامن تھام لے تو وہ اس کی تربیت سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لے گا۔ روحانیت کی راہ میں سالک کی پہلی محبت، محبتِ شیخ ہے جس کو فنافی الشیخ بھی کہتے ہیں اور اس کے بعد اس کا شیخ اسے فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی منزل تک پہنچا دیتا ہے اور رفتہ رفتہ اسے فنافی اللہ کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ فنافی اللہ کی منزل پر براہ راست پہنچنا فقط انبیائے کرام کا نصیبہ ہے یا ان کے طفیلی ہونے کے ناتے سے ان کے چند ایک امتی بھی اس نعمت سے سرفراز ہو جاتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے بھی یہ فرمایا ہے کہ عالم لوگوں کے لئے رابطہ یا وسیلہ شیخ اختیار کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمارے شیخ کی محبت، اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب اور اپنا وصل نصیب فرمائے، آمین بحرمت سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم

تاثرات

(از حضرت پیر علامہ علاؤالدین صدیقی، غزنوی مدظلہُ العالی، آزاد کشمیر)

بہت سے نادر موضوعات پر کتابیں تالیف کرنے کے بعد پیر عبداللطیف خاں نقشبندی نے اس بار "رابطۂ شیخ" پر قلم اٹھایا ہے تو اس تحریر میں بھی آپ نے متعلقہ امور پر اس قدر معلومات جمع کر دی ہیں جو یقیناً طالبان طریقت کے لئے ایک قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس موضوع پر غالباً یہ طریقت کی پہلی کتاب ہوگی۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ طریقت جیسے اہم معاملات پر آجکل بہت سی تصانیف نظر میں آرہی ہیں اور امید ہے کہ اہل ہمت ایسے پیچیدہ اور اہم موضوعات پر اضافہ کرتے چلے جائیں گے کیونکہ طریقت کے مختلف شعبوں میں بھی ابھی بہت سے خزانے مخفی ہیں۔

تصنیفات میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی مشاہدے میں آتی ہے کہ ان کتابوں میں دلچسپی لینے والے حضرات کی تعداد میں بھی کچھ اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے لیکن اس اضافے کی رفتار ہنوز تسلی بخش حدود سے بہت کم ہے۔ میں قارئین سے یہ استدعا کرنا چاہوں گا کہ وہ عوام کو دینی کتب کے مطالعہ میں دلچسپی لینے کی ترغیب دیتے رہیں تاکہ روحانی کتب کی موجودگی سے حسب ضرورت استفادہ ہو سکے۔

زیرِ نظر کتاب میں مصنّف نے نہایت خوبصورت، مدلل اور مستند انداز میں "رابطۂ شیخ پر" اس قدر وضاحت کر دی ہے کہ جس سے اس کے مختلف گوشے مثلاً طریقِ رابطہ، تصورِ شیخ اور توجہ و تصرّف شیخ کا مکمل مفہوم حاصل ہو سکے گا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ رابطے سے متعلق تمام ضروری مضامین کا ایک دلچسپ مجموعہ قارئین کی نذر کر دیا گیا ہے اور اس کتاب کے ایک سرسری جائزے سے معلوم ہو سکے گا کہ طریق رابطہ کیا ہے، رابطہ کو کیسے قائم کیا جاتا ہے. اس کو رائج کرنے کی ضرورت کیوں ہوئی اور اس سے پیدا شدہ اثرات کس قدر بلند نتائج مرتب کر سکتے ہیں؟ طریق رابطہ کے دوران تجلّیات اور انوارِ الٰہی کا سالک پر اثر انداز ہونا کس کس نوعیت سے محسوس ہوتا ہے اور سالک کے دل کو قلب سلیم کا درجہ کن حالات میں میسر آتا ہے؟ کتاب ہذا میں جذبِ کلیم اور مشاہداتِ حکیم کے حوالے سے اللہ کی معیّت کا حاصل ہونا اور انسان کے اندر موجود تجلی زار کا مشاہدہ کرنے کے علاوہ اس حقیقت کی نشاندہی بھی کی گئی ہے کہ انسان کی روح کی غایت دیدارِ الٰہی ہے کیونکہ انسان کی اصل تو دیدِ الٰہی سے تعلق رکھتی ہے جبکہ انسان کا جسم فقط پوست کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس

حقیقت کا انکشاف کہ وصلِ الٰہی اولیائے کرام کا مطمحِ نظر رہا ہے اور یہ کہ قربِ اولیاء میں کس طرح قربِ الٰہی پوشیدہ ہے، اس کتاب کی خصوصی نگارشات میں شامل ہے۔ چونکہ موجودہ اولیائے کرام اور وصال شدہ اولیاء کی ارواحِ مقدسہ سے سالک کو اکثر واسطہ رہتا ہے اس لئے الہام اور کشفُ القبور پر بھی مصنف نے کافی گفتگو کی ہے اور اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اس دنیائے فانی سے پردہ پوش ہو جانے کے بعد بھی اولیائے کرام اللہ کے اذن سے لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں۔

میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ چونکہ مصنف محکمہ موسمیات کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں اور وہ سائنس کے بنیادی علوم سے اچھا خاصا شغف رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے انسانی روح کی تخلیقی قوت پر علامہ اقبالؒ کے کلام کی مناسبت کے ساتھ کافی سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اس بات کو ثابت کیا ہے کہ انسانی روح کو جو "امرِ الٰہی" کا درجہ رکھتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے تخلیقی قوتوں سے بھی نوازا ہے۔ چنانچہ انسان اگر روح کا تصرّف حاصل کر لے تو وہ جس چیز کو چاہے وجود میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ علامہ اقبال کا خیال ہے کہ زندہ قوم کی حیثیت سے اگر دنیا میں رہنا ہو تو ہر شعبۂ زندگی میں تخلیقی کام کرنے کی استطاعت حاصل کرنا ایک ضروری امر ہے اور وقت کا بھی یہی تقاضا ہے۔ مصنف نے اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ اولیائے عظام کے بلند و ارفع روحانی مقامات کے حصول کے لئے ہر سالک کے لئے رابطہ شیخ کا طریقہ اپنانا از حد ضروری اور لوازمات طریقت میں سے ہے۔ مصنف نے حضرت مجدد الف ثانیؒ (جو اس دوسری ہزار صدی ہجری کے سب سے بڑے ولی اللہ تسلیم کئے جاتے ہیں) کے اقوال اور حوالہ جات بطور سند پیش کئے ہیں جس سے مولانا رومؒ اور دیگر قدیم اولیائے کرام کے نظریۂ رابطہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے پندرہ ابواب اور اختتامیہ میں اس قدر مواد اور اسباق موجود ہیں جو قارئین کی کشادگیٔ قلب و نظر کے علاوہ نووارد سالکانِ راہِ طریقت کی راہنمائی کا سبب بنیں گے اور طالبینِ طریقت کی تشنگی کو دور کر سکیں گے۔

جناب عبداللطیف خان صاحب نے محض خدمت اسلام کے نظریئے کے تحت متعدد کتب تصنیف فرمائی ہیں اور ملک کے گوشے گوشے سے عوام نے ان کی کتب کو سراہا ہے بلکہ لوگوں کے دلوں میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا ہوا ہے۔ آپ کی کتب میں پیش کردہ نظریات کو قارئین نہ صرف قبول کر لیتے ہیں بلکہ اپنی زندگیوں کو قرآنی احکامات کے مطابق ڈھالنے کی مکمل کوشش کرنے کا آغاز کر دیتے ہیں۔ تبلیغی کاموں میں آپ کی کاوشوں اور آپ کی تحریروں میں موجود جادو کا سا اثر دیکھتے ہوئے بخدا مجھے قلبی طمانیت حاصل ہوئی ہے اور یہ کہنے کے بغیر چارہ نہیں کہ۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

دعا ہے کہ آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے لاکھوں بھولے بھٹکے مسلمانوں کو خدائے قدوس کی فرمانبرداری نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ ان کی تحریروں کو راہ نوردانِ طریقت کے لئے روحانی منزل کی سراغ رسانی کا ذریعہ بنائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا شرف نصیب فرمائے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں

کہ مصنف کے درجات میں بلندی، عمر میں برکت، صحت میں استحکام اور سلوک میں اعلیٰ مقام نصیب ہو اور ان کے معاونین کی کوششوں کو درجہ قبولیت عطا فرمائے، آمین! بجاہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم و اولیائے امت۔ سَیِّدُ الْمُرْسَلِیْنَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالتَّسْلِیْمَاتِ

مورخہ ۸۔محرم الحرام ۱۴۱۷ھ
بمطابق ۲۶ رمئی ۱۹۹۶ء

پیر علاؤالدین صدیقی غزنوی نقشبندی
سجادہ نشین دربار عالیہ، نیریاں شریف
تراڑ کھیل (آزاد کشمیر)

تبصرہ

زیرِ نظر کتاب کا موضوع طریقت کے عمیق اور پیچیدہ شعبے سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے مضامین کو سمجھنے کے لئے طریقت کے علوم پر دسترس رکھنے کے علاوہ کسی حد تک بصیرتِ باطنی کے حامل ہونے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ طریقت کے حلقوں میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ جب تک کسی سالک کو اولیائے کرام کی جانب سے شخصی راہنمائی میسر نہ ہو تو اس وقت تک اسے رابطۂ شیخ کا مکمل فہم اور دانست حاصل نہیں ہو سکتی۔ طریقت کی تاریخ میں مصنّفِ کتاب نے پہلی بار، رابطۂ شیخ پر عام فہم الفاظ میں اس قدر جامع اور مبسوط کتاب لکھ دی ہے کہ جس کے باعث عوام کے لئے اس مضمون کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہے گی اور اس طرح یہ کتاب جلد ہی عوام میں مقبولیت کا درجہ حاصل کرلے گی۔

زیرِ غور مضمون کو سمجھنے سے پہلے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی اس عظیم کائنات میں کیا مقام حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ کی انسان سے کیا توقعات وابستہ ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اللہ عزوجل کی ایک صفت "الخالق" بھی ہے۔ اس کی یہی صفت ہے جس نے اس کو اس بسیط و عریض کائنات میں ارض و سما کی پہنائیوں میں جلوہ گر کیا ہے۔ اس کی تخلیق کے شاہکار کائنات کے بڑے سے بڑے مظہر اور چھوٹے سے چھوٹے ذرے اور قطرے میں بکھرے پڑے ہیں اور چشمِ بینا کے لئے اس کی اس صفت کے جلوے خدا کے جاہ و جلال، رعنائی اور بانکپن کی بیباک شہادتیں مہیا کرتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ نے سچ ہی فرمایا تھا۔

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار ہر ورق دفتریست زِ معرفتِ کردِگار

(خبردار رہو! کہ سبز رنگ کے درخت اور ان کا ایک ایک پتا جو نظر آتا ہے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ایک پورا دفتر ہے)

لیکن اس سارے مجموعۂ حسن و جمال اور مظاہرِ جاہ و جلال میں اس کی ایک تخلیق ایسی بھی ہے جسے اس نے خود "احسن تقویم" کے زیور سے آراستہ کیا اور وہ ہے ابن آدم کی ذات "انسان" جس کے متعلق اس نے عزت و تکریم کا اعلان فرمایا۔ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (یعنی بیشک ہم نے بنی آدم کو عزت دی۔ بنی اسرائیل ۷۰) اس کی تخلیق کے بڑے جوہر دو ہیں۔ ایک مادیت یعنی جسم مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ یعنی اس (زمین) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا۔ طٰہٰ ۵۵) اور دوسرا

روحانیت یعنی روح جیسے فرمایا قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (فرمادیجئے کہ روح میرے رب کا امر ہے۔ الاسرا: ۸۵) جسم و بدن کے اپنے تقاضے ہیں اور روح و جان کی اپنی خواہشات اور ضروریات ہیں۔ ان دونوں کے درمیان زندگی بلکہ جمال زندگی کا توازن برقرار رکھنے کے لئے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس ارضی دنیا کے خزانوں کے دہانے انسانی عقل کے لئے فراخ کر دیئے ہیں، اسی طرح اس روحانی کائنات کے سفیر ملائکہ طیبین، اس رحیم و کریم کی طرف سے بشارتوں کے دروازے پوری طرح وا کر دینے کی نوید انبیائے کرام اور ان کے متبعینِ خاص یعنی اہل اللہ تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ پس برکت و رحمت ہو ان انسانوں پر جو اپنی دوگونہ عناصر ترکیبی (یعنی جسم و جان یا روح و بدن) کی اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں کو اختیار کر کے پوری صحت اور مکمل توازن کے ساتھ پرورش کرتے ہیں اور جب حضور خداوندی میں حاضر ہوں تو اپنے قلبِ سلیم کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں کیونکہ مقصود تخلیق یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں کو اس کائنات میں اپنی نیابت اور خلافت کا شرف بخشا اور انسان کی روح کو اس قدر طاقت بخشی کہ وہ عقل کی وساطت سے پوری کائنات کی معرفت حاصل کر سکتا ہے، یہاں تک کہ عرفانِ خداوندی اگر کائنات میں کسی حد تک کسی کو حاصل ہے تو وہ انسان کی ذات کو ہی حاصل ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت بھی عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنے خالق کے ساتھ روحانی رابطے کے ذریعے جملہ مخلوقات کو مسخر کر سکتا ہے اور انسان اس طریق رابطہ کے ذریعے جس سے چاہے اپنا ربط قائم کر سکتا ہے، حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب اور وصال حاصل کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔ مصنف کتاب ہذا نے انسان کی اسی قوت رابطہ کو نہایت خوبصورت انداز میں آشکار کیا ہے اور اس کی ضروریات پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ آپ نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ قوانین الٰہیہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط قائم کرنے کے لئے کسی درمیانی واسطے یعنی برزخ کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور انبیائے کرام کا برزخ اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان قائم کیا ہے اور انسانوں سے براہ راست رابطہ قائم نہیں فرمایا۔ کیونکہ اس براہ راست خدائی ربط کا متحمل انبیاء کرام کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرنے کے سلسلے میں، صوفیائے کرام کے خیال کے مطابق، سب سے پہلے رابطۂ بالشیخ قائم کیا جانا ضروری ہے جس کی وساطت سے ربطِ رسالت اور ربطِ خداوندی قائم ہو جاتا ہے۔

جہاں تک جسم انسانی کی ارتقا اور نشوونما کا تعلق ہے تو یہ انسان کی ضروریات و حوائج اور تقاضوں کی تکمیل کے بغیر ممکن نہیں۔ جسمانی ترقی کی راہ میں حائل ہر مرض اور خرابی کا قلع قمع کرنا بھی ضروری ہوتا ہے، لیکن جب ہم روح انسانی کو روحانی مدارج و منازل پر فائز ہونے کی بات کرتے ہیں تو روح کو راستے میں رکاوٹ بننے والی تمام آلائشوں اور بیماریوں سے پاک کرنا بھی اشد ضروری ہوتا ہے۔ پھر جس طرح ہم امراض جسمانی کے سدباب کے لئے ماہر طبیب اور کامیاب معالج کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اسی طرح روحانی بیماریوں کا خاتمہ کر کے روح کو طاقتور بنانے اور قلب کے تصفیہ و

تذکیہ کے لئے بھی ہمیں ایسے روحانی معالج سے رجوع کرنا پڑتا ہے جو روحانیت و طریقت کے تمام مدارج طے کر چکا ہو اور جو ہمارے قلب و باطن میں پیدا ہونے والی تمام بیماریوں، آلائشوں، خرابیوں اور نقائص کو دور کر کے ہماری روح کو واصل باللہ کر دے، ایسا معالج جس کی زیر تربیت ہمیں روحانی بالیدگی کی دولت نصیب ہو، جس کی رہنمائی میں ہم اپنی سرزمینِ دل سے دنیوی جاہ و منصب کالالچ، حرص مال و زر، خواہشِ شہرت اور ناموری، حسد و بغض، کینہ پروری و تعصب پسندی اور عناد و نفرت جیسی بیکار جڑی بوٹیوں کو تلف کر کے اس کی جگہ دولت فقر و غنا، عرفانِ خداوندی، محبتِ الٰہی، رضائے مصطفٰے اور اتحاد و یگانگت جیسے پاک بیج بو سکیں اور پھر اس پاک بیج سے نشوو نما پانے والا پودا سرسبز و شاداب درخت بنے، جس پر عرفانِ خودی اور معرفت الٰہیہ کے پھل پھول لگیں، جس کی طمانیت بخش ٹھنڈی چھاؤں سے سالکینِ راہِ طریقت استفادہ کر سکیں اور بھٹکی ہوئی انسانیت سکھ کا سانس لے سکے۔

انسان اگر اپنی روحانی دنیا کو مادی دنیا کی آلائشوں سے مکمل طور پر پاک کر لے تو پھر اس کے لئے عرفانِ نفس کی دولت سے سرفراز ہونا کوئی مشکل کام نہیں رہتا اور جسے معرفتِ نفس کا خزینہ مل جائے اسے معرفتِ خداوندی کی دولت لازوال مل جاتی ہے۔ مگر یاد رہے کہ قلب و باطن کو جذب و سوز دروں کی کیفیات، عرفانِ خودی اور بالآخر معرفتِ ربانی جیسی نعمتیں انفرادی طور پر لاکھ عبادت و ریاضت اور محنت و مجاہدہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتیں بلکہ ان نعمتوں کے حصول کے لئے کسی نگاہ کیمیا اثر کے حامل شیخ کامل کے ساتھ اپنے روحانی اور وجدانی تعلق کو مضبوط و مستحکم کرنا ضروری ہے۔ گویا اللہ رب العزت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے "رابطۂ شیخ" از بس ضروری امر ہے اور راہ طریقت و معرفت کا جزو لاینفک ہے۔ شیخ کامل کی وساطت سے یہ سالک بارگاہ رسالت میں شرف باریابی پاتا ہے اور پھر بارگاہِ ایزدی میں جاکر فنائیت کے مقام پر جا پہنچتا ہے۔ لہٰذا "رابطۂ شیخ" عرفان ربانی کے لئے پہلی سیڑھی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں چند ایسی خصوصیات موجود ہیں جن کی طرف قارئین کو متوجہ کرنا میں اپنا فرض منصبی سمجھتا ہوں۔ اس کتاب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ عوام جو آج تک رابطۂ شیخ کے علم سے تقریباً نا آشنا ہیں ان کے لئے غالباً پہلی بار رابطۂ شیخ پر اس قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے جس کے باعث ان کو مشائخ سے استفادہ کرنے کی سعادت میسر ہو سکتی ہے جب کہ آج سے پہلے یہ علم صرف چند خوش قسمت اور مخصوص صوفیائے کرام کی دانست تک ہی محدود تھا۔ اس کتاب کی دوسری خصوصیت جو قابل ذکر ہے وہ یہ کہ آج سے پہلے تصوّر شیخ یا رابطۂ شیخ کا موضوع چند علماء کے مخصوص نقطۂ نظر کے باعث تنازعات اور اختلافات کا نشانہ بنا رہا لیکن مصنّفِ کتاب نے تصوّرِ شیخ کی اباحت، عزیمت اور جملہ فوائد کی نہایت سہل طریقے سے وضاحت کر دی ہے اور یہ بتایا ہے کہ حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ جیسے بلند پایہ بزرگوں کا ذاتی عمل اور آپ کے اقوال، تصوّرِ شیخ کو ثابت کرنے کے لئے ایک مستند دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں جب کہ مخالفین کا اپنا علم اور روحانی مقام ان بلند پایہ ہستیوں کے مقابلہ میں دور کی

نسبت بھی نہیں رکھتا۔ تیسری اہم دلیل جو صاحب کتاب نے بالصّراحت رابطۂ شیخ پر مہیا کی ہے وہ یہ ہے کہ طریق رابطہ کو اپنانے سے وہ کملات، مقامات اور درجات حاصل ہوتے ہیں جن کو صرف ایسے لوگ ہی ضروری تصور کرتے ہیں جن کو طریقت میں جنیدؒ اور بایزیدؒ بسطامیؒ جیسے بلند و بالا مقامات حاصل کرنا مطلوب ہوں اور عشّاقان الٰہی اسی طریقے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ جل شانہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ طبعًا یہ کہا جاسکتا ہے کہ طریقت میں طریق رابطہ کو اتنا ہی بلند مقام حاصل ہے جس قدر جنیدؒ اور بایزیدؒ کو دنیائے اسلام میں بلند مقام حاصل ہے لہٰذا اس طریقے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس طریق کے بغیر جن لوگوں نے طریقت کی راہ پر چلنا چاہا وہ قطعًا اولیائے کرام کے فیضان سے مستفید نہ ہوسکے۔ مشائخ کبار کا قول ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی اسی طریق کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسلک رہتے تھے اور اب بھی منسلک ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین کو روحانی درجات کے ارتقاء کے طریقوں کی تفصیل ملتی ہے اور بہت سے روحانی معاملات کے اسرار و رموز کا سبق دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مصنف نے اس بات پر تسلی بخش گفتگو کی ہے کہ ہر انسان میں ایک تجلّی زار موجود ہے، تجلیات الٰہی کا ورود کس طرح ہوتا ہے، قلب سلیم کی خصوصیات کیا ہیں، قربِ الٰہی کے حصول کے ذرائع کیا ہیں، اولیائے سابقین کس طرح امداد کرتے ہیں اور کشف القبور کس طرح کیا جاتا ہے؟ آج بھی اور آج سے پہلے بھی اولیائے کرام کے ہاتھوں سے کچھ ایسے نادر الوجود افعال یعنی کرامات کا صدور ہوتا رہا ہے جو عام لوگوں کی دید و شنید میں بھی آتا رہا ہے، مگر ان نادر امور کے وجود میں آنے کا معاملہ عام لوگوں کے فہم سے بالاتر تھا۔ اس کتاب میں بزرگوں کے ہاتھوں پر ایسے کاموں کے سرزد ہونے کی وضاحت کی گئی ہے اور اس حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ اولیائے کرام کو کثرتِ عبادت اور مجاہدات کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تخلیق کا ملکہ عطا کر دیا جاتا ہے اور وہ جس چیز کو چاہیں اپنے تصرّف سے تخلیق کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ احسن الخالقین ہے اور اس نے اپنی خلّاقی صفت کسی حد تک اِن برگزیدہ ہستیوں کو بھی عطا کی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی محنت کے بل بوتے پر کفار بھی خلاقی صفت (استدراج) کی کچھ نہ کچھ یافت حاصل کر لیتے ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ روحانیت کے مذکور بالا کملات کو حاصل کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ عوام کے لئے نہایت نفع بخش ثابت ہوگا۔ آج کے دور میں مسلمانوں کو جس قدر عملِ تخلیق کی ضرورت ہے وہ پہلے کبھی نہ تھی کیونکہ اب جب کہ سائنس نے بام عروج کو چھونا شروع کر دیا ہے تو ان حالات میں اپنی قومی سلامتی اور ایمان کے تحفظ کو یقینی بنانا مسلمانوں کے لئے ایک نہایت اہم مسئلہ بن چکا ہے۔ اگر مسلمان محنت اور جاں فشانی سے کام لیں تو اپنے ایمان کی اضافی قوت سے (جس سے کفار محروم ہیں) دنیا بھر کے ممالک پر حاوی ہونے کی صلاحیت حاصل کر سکتے ہیں۔ کاش مسلمان مادی دنیا اور عیش و عشرت کے دلدادہ ہونے کے بجائے تعمیری اور تخلیقی امور کی طرف توجہ دیں تو

(یقیناً اس کتاب میں بیان کردہ اصولوں کی راہنمائی میں) ان کو وہ مقام حاصل ہو سکتا ہے جس پر پہنچ کر وہ پوری دنیا کو امن اور سلامتی کا سبق دے سکیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو استقامت اور تعمیرِ ملت کا ذوق و شوق عطا فرمائے آمین بِحُرْمَتِ سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

مورخہ یکم نومبر ۱۹۹۵ء

خادم الفقراء
عبدالمجید خان
ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل (ر)
لاہور

حرفِ آغاز

از مصنّف

تصوف میں شیخ طریقت سے اخذ فیض اور حصولِ توجہ کے لئے ایک سالک کا اعتماد علی الشیخ اور اس سے روحانی طور پر منسلک رہنا نہایت ضروری امر ہے کیونکہ سلاسلِ روحانیہ میں بزرگوں کے فیوضات کا وارد ہونا القائی اور انعکاسی عمل سے وابستہ ہے۔ سالک کا اس طرح ہمہ وقت اپنے شیخ کے ذریعے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کے ساتھ منسلک رہنے کو طریق رابطہ سے منسوب کیا جاتا ہے اور چونکہ سالک اس تعلق کی ابتدا اپنے شیخ کے ساتھ ربط قائم کرنے کے ذریعے حاصل کرتا ہے اس لئے اس پورے طریقے کو رابطۂ شیخ بھی کہا جاتا ہے۔

علمِ طریقت کے حصول کے تین ذرائع ہیں۔ ایک حواس کے ذریعے، دوسرا عقل کے ذریعے اور تیسرا نورِ بصیرت کے ذریعے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کے حواس کی حسیت کی پرورش درست طریقے سے نہ کی گئی ہو تو اس کے لئے اس کے ذریعے سے اس علم کا حاصل ہونا ممکن نہیں ہوتا اور اگر کسی کو عقل سلیم حاصل نہ ہو تو عقلِ عام بھی گمراہی کا سبب بن جاتی ہے اور اس سے بھی علمِ حاصل نہیں ہو سکتا۔ بصیرت باطنی کا پیدا ہونا محض مخصوص طرز سے زندگی گذارنے اور مجاہدات شاقہ کے ذریعے تزکیہ نفس کے بعد ہی ممکن ہوتا ہے، چنانچہ علمِ طریقت کے حصول کے لئے مذکور بالا تینوں ذرائع کی درستگی مقصود ہوتی ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے کسی شیخِ کامل کی راہنمائی لازم خیال کی جاتی ہے۔ حواس ظاہری سے جو علم حاصل کیا جاتا ہے اس کی بنیاد احساس اور مشاہدہ پر ہوتی ہے اور عقل معلوم اشیاء کی ماہیت کو سمجھ کر نتیجہ اخذ کرتی ہے جب کہ نور بصیرت کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس آخری قسم میں طریق رابطہ کے علاوہ وحی، وجدان، علم لدنی، مشاہدہ، کشف اور الہام وغیرہ بھی شامل ہیں۔ وحی متلو کے علاوہ باقی تمام ذرائع کشف اور الہام کے زمرے میں شامل ہیں۔

جو حضرات روحانی علوم سے کچھ رغبت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ انسان کا جوہر روح ہے اور اس کے تمام تر روحانی کمالات کی وابستگی روح کی صحت، قوت اور تصرف پر موقوف ہے۔ انسان کا بدن روح کے مقابل میں پوست کا حکم رکھتا ہے لہٰذا بدن کو حرکت

دینے والی چیز روح ہے۔ روح کو حرکت اور زندگی نور سے ملتی ہے کیونکہ روح نورانی شئے ہے اور اللہ کا "امر" ہے جب کہ نور کو حیات دینے والا اور حرکت دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس حقیقت کے مقام کو کماحقہ سمجھنا محال ہے۔ حضرت عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اس روح کی حقیقت کو سمجھنا ہو تو رات دن ذکر و فکر، سیرِ ملکوتی اور عالمِ بالا میں پرواز کرنے کے بغیر اس میدان میں قدم رکھنا بے سود ہے اور یہ تمام کام بغیر کسی مرشد کامل کی راہنمائی اور توجہ کے ممکن نہیں۔ ربط کامل کو حاصل کرنا مذکورہ ریاضتوں کے بعد ہی ممکن ہوتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کی تحریر میں مخصوص نقطہ نظر اس ضرورت کو محسوس کرانے پر موقوف ہے کہ جو لوگ بھولے سے بھی خدا کی یاد کی طرف متوجہ نہیں ہوتے وہ صوم و صلوٰۃ کی پابندی حاصل کریں اور اسلام کے بنیادی احکامات کی بجاآوری کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے رشتے کو اس طرح استوار کرلیں کہ بندے اور آقا کے درمیان ہمہ وقت عبودیت اور محبت کا ربط قائم ہو جائے۔ اگر وہ ایسا ربط قائم کرلیں تو دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس ربط کو قائم کرنے کے کچھ قوانین اور نکات مشائخ کرام کی طرف سے واضح کیے جاچکے ہیں اور جو طالبین حق واصل باللہ ہونا چاہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ طریق رابطہ کو اختیار کریں اور کسی شیخ کامل کا واسطہ حاصل کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک ربط حاصل کرلیں۔ اس طریقۂ کار کو اپنانے سے وہ ایسی زنجیر سے منسلک ہو جائیں گے کہ جو ان کو رابطہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنے خالق اور مولیٰ کے ساتھ ربط قائم کر دے گی۔ ایسا ربط قائم کرنے کے لئے ایک طالب کو جن مضامین کا فہم حاصل کرنا لازمی ہے اس کا ایک مختصر اور آسان خاکہ اس کتاب کے مختلف ابواب میں ظاہر کر دیا گیا ہے تاکہ متمنی حضرات کے لئے راہنمائی کا سبب بن سکے۔ طریقِ رابطہ میں ایسی کوئی دشواری حائل نہیں البتہ اس راہ پر چلنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی لگن کو ہمیشہ بڑھتے رہنے والی خواہش، لغزش ناآشنا عزم اور سعی پیہم کی بنیاد مہیا کریں۔ اس بات کا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ حق تعالیٰ ایسے طالبوں کو اپنی نصرتوں، استعانتوں اور معاونتوں کے ساتھ شادمان کرتے اور نوازتے ہیں۔

راہ سلوک میں قدم رکھنا مقصود ہو اور اگر کوئی اس میں کامیابیاں حاصل کرنا چاہئے تو پہلے کسی مرشد کامل کی رفاقت اور ہمراہی اختیار کرنا ایک لازمی جزو ہے اور اس کے بعد مرشدِ کامل اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ سالک پابندی شریعت کا اہتمام کرے۔ یاد رہے کہ طریقت میں شریعت کی اتباع کے بغیر کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ شریعت سے دور ہٹنے والے راستوں پر چلنے سے سوائے گمراہی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ طریقت کی ابتداء میں ہی سالک کو تصورِ شیخ یا رابطۂ شیخ کی تعلیم کے ساتھ ذکر و فکر اور ریاضت و مجاہدات کا سبق مرید کے مزاج کے مطابق دیا جاتا ہے۔ صحبت شیخ میں رہتے ہوئے مرید اپنے آپ کو شیخ کے بتائے ہوئے امورِ طریقت پر ڈھال لیتا ہے، حتیٰ کہ وہ ایسی شخصیت اختیار کرلیتا ہے کہ راہِ طریقت میں شیخ کی راہنمائی کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کرنے لگے۔ طریقت کے مقامات

حاصل کرنے کے لئے رابطۂ شیخ اور محبت شیخ کو بڑا منام حاصل ہے۔

طریقِ رابطہ کا لفظ اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں طالب کا مطلوب کے ساتھ ربط قائم کیا جاتا ہے۔ ایسا ربط قائم کرنا صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب سالک اتباع شریعت کے ساتھ تصفیہ قلب کر لے اور اپنے نفس کو مہذب بنا لے۔ ان منازل کو طے کرنے کے لئے سالک کو صرف عزم سلوک کو پختہ رکھنا ہوتا ہے اور کسی کو کامیابیوں سے ہمکنار کرنا اس کے شیخ کی نگاہوں کے تاثرات سے ممکن ہوتا ہے۔ حضرت نصیرالدین" چراغ دہلوی کا ارشاد ہے کہ شیخ کامل یہ جانتا ہے کہ مرید کو راہ سلوک میں چار عوالم سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ اول عالمِ ناسوت سے جو حیوانات اور نفس کی دنیا ہے۔ اس میں حواسِ خمسہ سے افعال صادر ہوتے ہیں۔ سالک اپنی ریاضت اور مجاہدہ کے ذریعے اس عالم سے گزرتا ہے تو دوسرے عالم یعنی عالم ملکوت میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اس کے افعال تسبیح، تہلیل، قیام، رکوع اور سجود تک محدود ہوتے ہیں۔ عالمِ ملکوت کے بعد سالک عالمِ جبروت میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں شوق، ذوق، محبت، اشتیاق، طلب، وجد، سکر، صحو، مجد (بزرگی، عظمت) اور محو (کھو جانا یا عادات بشری کے اٹھنے) کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ چوتھا عالم جس میں سالک داخل ہوتا ہے، عالم لاہوت کہلاتا ہے، جو لامکان میں شامل ہے، جہاں نہ گفتگو ہے اور نہ جستجو۔

عالم ناسوت جو کہ عالم ملکوت سے نیچے ہے نفس کی صفت ہے اور جب سالک نفس پر عبور حاصل کر لے اور اوصافِ ذمیمہ زائل ہو جائیں تو سمجھ لیں کہ سالک عالمِ ناسوت سے گزر کر عالم ملکوت میں پہنچ گیا ہے۔ عالم ملکوت دل کی صفت ہے۔ جب دل کا تزکیہ ہو گیا تو سمجھو سالک عالم ملکوت میں داخل ہو گیا۔ یہاں سالک میں فرشتوں کی سی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ عالمِ جبروت روح کی صفت پر ہے۔ جب ذکر روح شروع ہو جائے اور حق تعالیٰ کا قرب میسر ہو جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ سالک کی اس عالم میں رسائی ہو گئی۔ عالمِ لاہوت نظرِ رحمٰن کی صفت ہے، یعنی جب سالک کے تمام اعمال یعنی اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا وغیرہ اللہ کے لئے ہو جائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی نظر کا مستحق ہو جاتا ہے اس میں سالک پر حیرت غالب ہو جاتی ہے اور اسے خود سے رہائی مل جاتی ہے۔

حضرت نصیرالدین" چراغ دہلوی فرماتے ہیں کہ حصولِ شریعت سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے۔ اس کے لئے کم کھانا اور رات کے وقت نوافل کی ادائیگی ضروری ہے۔ حصول طریقت سے تزکیۂ دل ہوتا ہے۔ اس کے لئے نماز پڑھنا، روزے رکھنا، ذکر جلی کرنا لازمی ہے۔ حصولِ حقیقت سے تجلیۂ روح ہوتا ہے اور اس کے لئے روزے کی کثرت اور ذکر خفی کرنا ضروری ہے اور تجلی روح سے سات گوہر روشن ہو جاتے ہیں مثلاً گوہر ذکر، عشق، محبت، سر، روح معرفت اور فقر۔ انسان کا نفس شیطان کی جگہ ہے اور دل فرشتوں کا مقام ہے اور روح محل نظر رحمٰن ہے۔ دل کی متابعت سے جنت ملتی ہے۔ روح کی فرمانبرداری سے اللہ کا قرب ملتا ہے۔

اَلْمُنْقِذُ مِنَ الضَّلَالِ میں امام غزالی" فرماتے ہیں طریق سلوک کی ابتداء ہی

مشاہدات اور مکاشفات کا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ سالک کو عالم بیداری میں بھی انبیاء کی ارواح اور ملائکہ کا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ سالکین راہِ طریقت ارواح کا کلام سنتے اور ان سے فوائد حاصل کرتے ہیں۔ حضرت حسن بصری ؒ نے بیت المقدس کے ایک صخرہ میں خلوت اختیار کی اور آپ فرماتے ہیں کہ ایک دن دو فرشتے صخرہ کے اوپر بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے۔ ایک فرشتے نے دوسرے سے پوچھا کہ اس صخرہ میں کون ہے۔ دوسرے نے کہا کہ اس میں حضرت حسن بصری ؒ ہیں۔ پہلے فرشتے نے پوچھا کہ کون حسن بصری ؒ۔ دوسرے فرشتے نے کہا "یہ وہ حسن بصری ہیں کہ جس نے کل کوفے کے بازار سے کچھ کھجوریں خریدیں اور ایک کھجور وزن شدہ کھجوروں کے علاوہ دوسرے ٹوکرے سے لڑھک کر وزن شدہ کھجوروں میں گر گئی اور اس شخص نے دیکھ لینے کے باوجود اس کھجور کو اپنی کھجوروں میں شامل کر لیا" پہلے فرشتے نے کہا "ہاں ہاں میں سمجھ گیا" یہ گفتگو طویل ہے اس کو یہاں شامل کرنا ضروری نہیں۔ روایات میں ملتا ہے کہ حضرت بایزید بسطامی ؒ جب ذکر کے لئے بیٹھتے تو فرشتوں کی تسبیح کو سنتے اور اپنی تسبیح کے اثرات اہل عرش پر مرتب ہوتے ہوئے ملاحظہ فرماتے۔ یہ تمام باتیں عام آدمی کے بس سے باہر ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش ؒ فرماتے ہیں کہ صفائے قلب یہ ہے کہ سالک کو ایسا حضور نصیب ہو جائے جو ضائع ہونے والا نہ ہو اور نہ ہی سالک کے پاس بلا احتیاج (بلا ضرورت) کچھ ہو۔ آپ نے کشف المحجوب میں زید بن حارثہ ؓ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گفتگو کو نقل فرمایا ہے، جس میں حضرت زید بن حارثہ ؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "میں نے اپنی جان کو دنیا سے علیحدہ کر لیا ہے اور اپنا منہ دنیا سے موڑ لیا ہے۔ اب مری نظر میں دنیا کا پتھر، سونا، چاندی اور کوڑا کرکٹ سب برابر اور یکساں ہیں اب میں مکاسب دنیا میں مخلوق پر نگاہ نہیں رکھتا۔ رات کو اپنے رب کو یاد کرتا ہوں اور دن کو روزہ رکھتا ہوں۔ میں اب مقامِ اقصیٰ (یعنی انتہائی درجہ تک پہنچ گیا ہوں) اور مجھے یہ منصب حاصل ہے کہ گویا میں رب العلیٰ کے عرش بریں کا مشاہدہ بلا حجاب کر رہا ہوں"۔ انہوں نے عرض کیا "میں اہل جنت کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ سیر و تفریح میں ہیں اور جہنمیوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ تڑپ رہے ہیں"۔ ایک جگہ آیا ہے کہ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جہنم میں دیکھ رہے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عرفت" یعنی تو نے اب پہچان لیا ہے اور اب اس منصب کی محافظت کرو"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ ایسا بندہ ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے منور فرما دیا ہے۔ اس روایت سے یہ استنباط کیا جاتا ہے کہ اصلِ ایمان اطمینان قلب ہے اور حقیقتِ ایمان اطمینانِ قلب کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اطمینان قلب ذکر الٰہی سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

قرآن اور احادیث میں بھی انسانوں اور فرشتوں کی مدد، اعانت اور تصرّف کا ذکر ملتا ہے۔ سورۂ البقرہ آیت ۲۵۳ میں ہے وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ای تَغْلِیْبُ مَلَکِیَّتِہٖ عَلٰی بَشَرِیَّتِہٖ (ہم نے عیسیٰ ؑ کی تائید روح پاک سے کی یعنی وصفِ ملکیت کو بشریت پر غالب کر دیا) فرشتوں کی

اعانت اور تصرف کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ حسان بن ثابتؓ جب منبرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بیٹھ کر نعت پڑھتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے اَللّٰھُمَّ اَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (یعنی اے اللہ تعالیٰ ان کی مدد جبرئیلؑ سے فرما۔) یہاں پر جبرئیلؑ کا حسان بن ثابتؓ کے باطن پر تصرف، تائید اور تاثر باطنی کا ہونا ثابت ہوتا ہے اور حضرت جبرئیلؑ کے القاء سے حضرت حسان بن ثابتؓ کفار کی توہین بیان کرتے اور نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت ان میں پیدا ہو جاتی۔

قرآن میں تصرفِ باطنی کی کچھ مثالیں ملتی ہیں۔ سورہ آل عمران آیت ۱۰۳ میں مومنوں کے دلوں میں الفت ڈالنا اور فرشتوں کو اللہ کی طرف سے ایمان والوں کی ہمت بڑھانا اور مومنوں کے دل کو قوی کرنا تاکہ وہ پوری دل جمعی سے کفار کا مقابلہ کریں۔ ان تمام آیات سے تصرّف باطنی کا ثبوت ملتا ہے۔

بخاری شریف کی ایک مشہور حدیث (جیسے حدیث فعلی بھی کہتے ہیں) میں حضرت جبرئیلؑ کے پہلی وحی لانے کا ذکر ہے اور جب آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا "اقراء" یعنی پڑھو۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا اَنَا بِقَارِئٍ 'یعنی میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ جبرئیلؑ نے یہ کلمات تین بار کہے اور تین بار ہی آپ نے یہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ تیسری بار جبرئیلؑ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سینے سے لگا کر بھینچا اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھنا شروع کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن علی جمرہؒ نے لکھا ہے "اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دبانے والے کا اتصال (متصل ہونا یا سینے کے ساتھ لگانا) اس کے جسم سے ہوا جسے بھینچا گیا، جو ایک طریقہ حصول فیض کا ہے۔ اس اتصال سے جسم میں ایک قوت نورانیہ پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے دوسرا شخص اس کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اولیاء کرام جو نبوت کے وارث ہیں، نے فیض دینے کا یہی معانقے کا طریقہ جاری کیا ہے اور اب تک چلا آ رہا ہے۔ تحفہ القاری جلد اول صفحہ ۲۱ میں ہے کہ اس حدیث کے بارے میں علمائے ظواہر کہتے ہیں کہ جبرئیلؑ کا بھینچنا ایک تنبیہ تھی کہ آپ کا دل القاء قبول کرے۔ مگر اولیائے کرام کا قول ہے کہ جبرئیلؑ کا دبانا حصول فیض کے لئے باطنی توجہ دینا تھا اور بشریت پر ملکیت کو غالب کرنا مقصود تھا۔ جب کہ صوفیائے باطنی کا خیال ہے کہ پہلی بار دبانا دل کو دنیا کی محبت سے خالی کرنا تھا، دوسری بار کا دبانا وحی کے لئے دل کو فارغ کرنا تھا اور تیسری بار دبانا مرتبۂ انس و محبت پیدا کرنے کے لئے تھا۔ لہٰذا تصرفِ باطنی قرآن و سنت سے ثابت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حکم فرمایا گیا کہ وہ مسلمانوں کو القاء اور توجۂ باطنی کے ذریعے ثابت قدم رکھیں۔

مشکوٰۃ میں ابی بن کعبؓ کا واقعہ ان کی اپنی زبانی بیان کیا گیا ہے، جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ اسلام کی تکذیب زمانہ جہالت سے بھی زیادہ میرے دل میں واقع ہو گئی تھی لیکن ایک دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا اور میرے سینے پر ہاتھ مارا تو میں پسینہ پسینہ ہو گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ گویا اب میں اپنے رب کو دیکھ رہا ہوں۔ مرقات میں ہے کہ اس ہاتھ مارنے کی برکت

سے ابی بن کعب ؓ کے دل کی غفلت دور ہو گئی اور فوراً ہی اسے مقام حضور اور مشاہدہ حاصل ہو گیا۔
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غفلت دور کرنے سے نور ایمان تیز ہوتا ہے اور توجہ دینے سے انکشاف کا ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ سالہا سال کے مجاہدات اور ریاضت سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا شیخ کی تھوڑی سی توجّہ کا اثر ہوتا ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ ابی بن کعب ؓ کی طرف نہ ہوتی تو ان کی منازل سلوک طے نہ ہوتیں کیونکہ منازل سلوک صرف مجاہدات کر لینے سے طے نہیں ہوتیں۔ اس سے یہ بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ توجہ کے لئے قلب میں فیض کو قبول کرنے کی استعداد کا ہونا ضروری ہے۔

ایک مشہور اور مستند روایت سے جو تقریباً ہر سیرت کی کتاب میں منقول ہے اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں اپنے دل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو ہر چیز سے زیادہ پاتا ہوں مگر اپنی جان سے زیادہ نہیں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے سینے پر ہاتھ رکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ چلا اٹھے کہ اب میں اپنے دل میں اپنی جان سے بھی زیادہ آپ کی محبت کو پاتا ہوں۔ اس کیفیت کا تبدیل ہونا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کے باعث تھا۔ ابن کثیرؒ نے فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجِدِيْنَ (پس سجدے میں گرے جادوگر الشعر آء ۴۶) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ فرعون کے جادوگروں نے جو موسیٰ ؑ کے مقابلہ کے لئے آئے تھے، موسیٰ ؑ کے عصا کا معجزہ دیکھ کر سجدے میں گر گئے اور سجدے سے اس وقت سر اٹھایا جب جنت، دوزخ اور عذاب و ثواب دیکھ لیا۔ ان جادوگروں نے موت کو بخوشی اختیار کرنے کا اعلان کیا کیونکہ جب جنت اور دوزخ کا مشاہدہ ہو جائے تو دنیا کی ہر سزا اس کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے۔ مفسّرین یہ بھی لکھتے ہیں کہ جادوگروں نے موسیٰ ؑ کا ادب کرتے ہوئے ان سے یہ دریافت کیا کہ کیا وہ اپنا معجزہ پہلے ظاہر فرمائیں گے یا ہم اپنی رسیوں کو پہلے ڈالیں، لہٰذا اس ادب کے اعتبار سے انہیں ایمان کی دولت نصیب ہوئی، لیکن چونکہ جادوگر ایک پیغمبر کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے تو اس بے ادبی پر ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے گئے۔

ایک سالک کی تربیت کے دوران اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اس میں اخذ فیض کی استطاعت موجود ہے کیونکہ اخذ فیض اور توجہ کو قبول کرنے کے لئے سالک کے قلب میں قبولیت کی استعداد کا ہونا ضروری ہے ورنہ اس کے دل میں بیعت سے پہلے موجود کدورتوں کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ میاں شیر محمدؒ شرقپوریؒ کے متعلق یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک دن آپ لاہور ریلوے سٹیشن سے باہر تشریف لائے تو آپ کی نظر ایک سکھ پر پڑی۔ آپ نے اس کی داڑھی کو دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے فرمایا "یہ داڑھی تو مسلمانوں جیسی داڑھی ہے" اس بات کا کہنا تھا کہ اس سکھ نے فوراً کلمہ پڑھ لیا اور خوشی سے اسلام کو قبول کر لیا۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اس وقت حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ پر ایک خاص کیفیت طاری تھی اور مذکور بالا سکھ کے دل میں بھی قبولیت فیض کی استعداد موجود

تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے فوراً اسلام قبول کر لیا، ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو حضرت میاں صاحبؒ صبح سے شام تک ہر سکھ کی داڑھی پر ہاتھ لگاتے جاتے اور سب کو مسلمان کرتے جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں میں کامل توجہ موجود ہونے کے باوجود ہر کافر مسلمان نہ ہو سکا کیونکہ ہر کافر میں قبول توجہ کی استطاعت نہیں پائی جاتی۔ روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ کا تعارف جب شیعہ فرقہ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص حضرت نور الحسن شاہ صاحبؒ سے ہوا تو آپ نے ان کا نام پوچھا۔ جب ان کا نام نور الحسن بتایا گیا تو آپ نے ان کے کپڑے کو پکڑ کر کہا "کیا تمہیں میں نور نہ بنا دوں؟ اتنا کہنے کی دیر تھی کہ شاہ صاحب میاں صاحبؒ کے پیچھے ہو لئے اور ان سے بیعت حاصل کرنے کے بعد آپ کے خلیفہ اول ہونے کا مقام حاصل کیا۔

شرح بخاری فتح الباری میں حدیث جبریلؑ (جس میں حضرت جبریلؑ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان اور احسان وغیرہ کے متعلق سوال کئے) کی بابت علماء فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جبریلؑ کی مذکورہ گفتگو صدیقین، سالکین، عارفین اور صلحاء کے خزانۂ ادب میں سے ہے اور صلحا کی مجالس میں حاضر ہونے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس گفتگو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اولیاء اللہ کی مجالس سالکین کے دلوں میں عیوب و نقائص کے پیدا ہونے سے روکتی ہیں۔ اسی لئے نیک لوگوں کا احترام اور ان سے حیاء کرنا سالکین راہ طریقت کے لئے ضروری ہے۔

بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت یعلیٰؓ سے پوچھا کہ تو دیکھنا چاہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو ان کا کیا حال تھا۔ ان کے اس سوال کے جواب میں حضرت یعلیٰؓ نے کہا کہ ہاں!۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت یعلیٰؓ کے اوپر لپٹا ہوا کپڑا ایک جانب سے اٹھایا تو انہوں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غَطِیۡطٌ یعنی حبس دم کی حالت میں تھے۔ صوفیائے کرام اپنے مریدوں کو اب بھی جسم پر چادر لپیٹ کر ذکر کرواتے ہیں اور حبس دم کر کے ذکر کرنے کی اصل بھی اس حدیث سے ملتی ہے۔ صوفیائے کرام اپنے مریدوں کو مراقبہ بھی کرواتے ہیں۔ جس کا مطلب فیض الٰہی کا انتظار کرنا ہے۔ روایات میں آتا ہے یہی انتظار کی کیفیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نزول وحی کے وقت ہوتی تھی۔ نزول وحی کے آثار نمودار ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموشی سے بیٹھتے اور احکام الٰہی کے نازل ہونے کا انتظار فرمایا کرتے تھے۔

طریقِ رابطہ میں سالک اپنے مطلوب سے ہمہ وقت ربط قائم کر سکتا ہے۔ اس کا ربط اس کے شیخ کے ساتھ ہو، خواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو۔ ربط ایک ایسا تعلق ہے جو وصال شدہ بزرگوں میں سے جس کے ساتھ بھی سالک چاہے تو قائم ہو سکتا ہے۔ وصال شدہ بزرگ کا مقبرہ اس کے قریب ہو یا بعید، ربط کے لئے فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ایسا رابطہ جو صاحبِ مزار کے ساتھ رکھا جائے اس کو طریقت کی زبان میں کشف القبور کہا جاتا ہے اور اس موضوع پر زیرِ نظر کتاب میں اچھی خاصی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اس موضوع پر اولیائے کرام نے بھی کافی بحث کی

ہے اور یہاں اس کا مختصر سا خاکہ پیش کر دینا قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہو گا کیونکہ طریق رابطہ اختیار کرنے والوں کے لئے کشف القبور اہم ضروریات میں سے ہے۔

کچھ علماء کشف القبور کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں کہ کشف القبور بدعت ہے اور سماع موتیٰ ایک ناممکن سی بات ہے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں واصل جہنم ہونے والے کفار کے مدفن پر کھڑے ہو کر حضرت عمر رضی تعالیٰ عنہُ کی موجودگی میں گفتگو کی ہے جو بخاری شریف کی ایک حدیث میں منقول ہے۔ بہت سے ایسے بزرگوں کی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اور دیگر اولیائے کرام سے ان کے وصال فرمانے کے بعد روحانی تربیت حاصل کی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ ؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کی تعلیم اور فیوض باطنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست حاصل کئے ہیں۔ آپ فیوض الحرمین اور تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں "اگر سچ پوچھو تو میں نے روح نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے بلاواسطہ قرآن مجید بھی پڑھا ہے جیسے فیض باطنی حاصل کیا"۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تربیت کا ذکر مع حوالہ بھی زیر نظر کتاب میں موجود ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی ؒ فرماتے ہیں کہ اہل منطق جسے حسیات کہتے ہیں کشف اس کے زیادہ قریب ہے، اور جسے وہ وجدانیات کہتے ہیں، الہام اس کے زیادہ قریب ہے۔ کشف بہ نسبت الہام اقرب الی الصواب ہے کیونکہ کشف سے مراد کسی شے سے حجاب کا اٹھنا ہے اور الہام سے مراد دل میں کسی مضمون کا القاء ہونا ہے۔

کشف، یا کشف القبور کی حقیقت کا اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ انسان جو کہ تمام کائنات پر اللہ تعالیٰ کا نائب مقرر کیا گیا ہے، اسے اس کائنات پر حکمرانی کرنے کے لئے ہر چیز اور ہر جگہ کے حالات کا علم ہونا ضروری ہے اور کشف اس کام کے لئے ایک آلہ ہے۔ ایک عام انسان کو مخفی باتوں کا علم نہیں ہوتا کیونکہ اسے نیابت کا درجہ حاصل نہیں۔ صوفیائے کرام جانتے ہیں کہ عام آدمی کی نگاہ ظاہر صورت تک پہنچ کر رک جاتی ہے، کیونکہ اس کی حد وہی ہے۔ مگر نگاہ باطن یا بصیرت باطنی اشیاء کی صورت سے گزر کر حقیقت تک پہنچ جاتی ہے، اور نگاہ وہی ہوتی ہے جو حقیقت کی تہ تک پہنچ جائے اور حقیقت کا پتہ چلائے علامہ اقبال ؒ نے فرمایا ہے۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے خرد کیا ہے چراغِ راہگزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا چراغِ راہگزر کو کیا خبر ہے

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن جو شئے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

اولیائے کرام کو حاصل ہونے والے کشف کو سمجھنا ہو تو اس کے لئے قرآن اور حدیث کی رو سے عالم برزخ کا مطالعہ کرنے سے بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ صوفیہ فرماتے ہیں کہ دنیا اور

آخرت کے درمیانی عرصے کو عالمِ برزخ کہتے ہیں اور اس میں محسوس ہونے والی حالت برزخی کہلاتی ہے۔ اس میں میّت پر دونوں جہانوں کے حالات منکشف ہو جاتے ہیں۔ اولیائے کرام بھی چونکہ اپنے انبیاء کے نور نبوّت سے اپنے دلوں کو روشن کر چکے ہوتے ہیں، اس لئے ان کو بھی یہ حالت نظر آجاتی ہے۔ اولیائے کرام پر دنیا میں بیداری اور نیند کی حالت کے علاوہ ایک درمیانی حالت بھی طاری ہوتی ہے، جسے سُکر کہتے ہیں۔ اس حالت میں ان کو بہت سے معاملات اور واقعات نظر آتے ہیں۔ ولی اللہ جو دیکھتا ہے وہ اپنے نبی کے نور سے دیکھتا ہے جس کا وہ تابع ہے۔ انبیاء علیہم السلام پر نزول وحی کے وقت بھی یہی حالت طاری ہوتی ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ فتح الربانی میں فرماتے ہیں کہ جس شخص کا ایمان قوی اور یقین جم جاتا ہے تو وہ قیامت کے معاملات قلب کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور جنت و دوزخ، صور، فرشتوں اور دیگر اشیاء کو اپنی اصلی حقیقت میں دیکھتا ہے۔

"فیض الباری" میں بھی مذکورہ بالا بات تفصیل کے ساتھ لکھ دی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اولیاء اللہ بہت سی چیزوں کو ظہور میں آنے سے پہلے ہی دیکھ لیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت بایزید بسطامی ؒ نے حضرت ابوالحسن خرقانی ؒ کی پیدائش کی خبر ان کے پیدا ہونے سے تقریباً ۳۰۰ سال پہلے اپنے مریدوں کے سامنے بیان کر دی تھی اور ان کا نام، ولدیت، شکل و صورت اور اوصاف کی تفصیل کو من و عن بیان کر دیا تھا۔ ایسا ہی ایک اور واقعہ حدیث شریف میں ملتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ میں یمن کی طرف سے تجلّیات باری کو دیکھتا ہوں چنانچہ وہاں حضرت اویس قرنی ؒ کا ظہور ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فتح ایران کی خوشخبری اور اسامہ بن زید ؓ کے ہاتھ میں قیصر و کسریٰ کے کنگن پہننے کی خبر اس واقعہ کے ظہور میں آنے سے بہت پہلے بیان کر دی تھی۔ ایسے ہی حضرت نعمت شاہ ولی ؒ نے ہندوستان اور پاکستان کے متعلق کچھ حادثات کا ذکر ۳۰۰ سال پہلے ہی اشعار میں لکھ دیا تھا۔ صوفیاء کا خیال ہے کہ کسی چیز کے ظہور میں آنے سے پہلے اس کا روحانی وجود ہوتا ہے، جو شخص اس کے دیکھنے کی استطاعت رکھتا ہو دیکھ لیتا ہے۔

"روح المعانی" جلد اول (صفحہ ۲۳۳) میں ہے کہ اولیائے کرام دنیا کی زندگی میں بھی جنت کی سیر کرتے ہیں۔ عوام جن چیزوں کا مشاہدہ خواب کی حالت میں کرتے ہیں، انہیں اولیائے کرام بیداری کی حالت میں دیکھ لیتے ہیں۔ نیند کی حالت میں آنکھ، ناک، منہ اور کان بند ہو جاتے ہیں اور اگر یہ کیفیت بیداری کی حالت میں طاری ہو جائے تو انسان بیداری کی حالت میں بھی خواب کی طرح مغیبات کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر صوفیائے کرام اپنے اوپر کشف کی حالت طاری کرنے کے لئے ذکر کے دوران اپنے آپ کو ایک چادر میں ملبوس کر لیتے ہیں اور پھر حالت واقعہ میں بہت سے معاملات ان کو نظر آتے ہیں۔

رابطہ کا طریق اور روحانی دنیا کے تمام معاملات اس وقت تک طے نہیں ہو سکتے جب تک باطن صاف اور بیدار نہ ہو اور کشف بھی ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جن کے حواس باطنی بیدار

ہوں۔ جیسے انسان ظاہری حواس سے ظاہری علوم حاصل کرتا ہے، ایسے ہی قلب، باطنی حواس کے ذریعے علوم باطنی کا ادراک کرتا ہے۔ ان علوم کا ادراک وھبی ہوتا ہے۔ جو لوگ شریعت حقہ کی اتباع کریں ان کو ذکر و فکر سے کسبی کشف مل جاتا ہے اور جن کو قلب سلیم میسر ہونے کے ساتھ ساتھ اتباع شریعت کا شرف بھی حاصل ہو تو انہیں القائے روحانی سے نوازا جاتا ہے۔ جو لوگ دروغ گو اور بد کار ہوں ان پر شیطان القاء کرتا ہے۔ جوگیوں، پنڈتوں اور بے دینوں پر اسی طرح شیطان کا القاء ہوتا ہے۔ اگر کشف وحی قطعی کے خلاف ہو تو ایسا کشف مردود اور ناقابل قبول ہے اور کشف جس کا شریعت اثبات کرے وہ کشف مثبت ہے۔ کشفِ صحیح اور القائے ربانی کا انکار دین کے متواترات (جو اعمال تواتر سے ثابت ہیں) کا انکار ہے۔

امام غزالیؒ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ کشف کا دروازہ اس کے لئے کھلتا ہے جو وصف کے ساتھ ذکرِ الٰہی پر مداومت اختیار کرتا ہے۔ امام رازیؒ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ مکاشفات کا دروازہ ان بندوں پر کھلتا ہے جن کو شیخ کامل میسّر آجائے۔ جو سالک طلبِ صادق اور مکمل عزم و استعداد بھی رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ اسے اعلیٰ مرتبے پر پہنچا دیتا ہے۔

فیض الباری میں ہے کہ خواب میں جو چیزیں دیکھی جاتی ہیں، بیداری میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں، بشرطیکہ خواب کی طرح انسان کی آنکھیں، ناک، کان اور منہ بند ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ حالت طاری ہوتی جو موت کے بغیر برزخی حالت میں ہوتی ہے اور اس میں برزخی حالات (نیند اور بیداری کے درمیان) منعکس ہوتے ہیں۔ اولیائے کرام بیداری کی حالت میں اندھیرے کمرے میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور خیالات کو ہر طرف سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر لیتے ہیں (اور بموجب حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے شیخ کی صورت کی طرف متوجہ ہو کر اس سے توجّہ طلب کرتے ہیں)۔ ملا علی قاری نے مرقاۃ میں لکھا ہے کہ مکان میں تاریکی کا ہونا ذکر کے دوران دلوں کو بہت جلا بخشنے والی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذکر کے حلقوں میں روشنیوں کو بند کر دیا جاتا ہے، بلکہ اکثر اولیائے کرام اپنی خلوت کے لئے تنگ حجروں کا انتخاب کرتے ہیں تاکہ خیالات منتشر نہ ہونے پائیں۔

کشف کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے قرآن اور احادیث میں واضح دلائل موجود ہیں۔ جن کو یہاں بیان کرنا طوالت کا باعث ہو گا۔ اس جگہ ان چند آیات کی طرف اشارہ کر دینا ہی کافی ہے جن سے کشف ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی ملاقات کے دوران ہونے والے تینوں واقعات کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں کشف کے استدلالی ثبوت موجود ہیں۔ (دیکھئے سورہ کہف آیات ۶۰ تا ۸۲) آل عمران آیت ۴۲ میں اس بات کا ذکر ہے کہ حضرت مریمؑ کے سامنے ایک فرشتہ انسان کی شکل میں آیا اور ان کو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام جہان کی عورتوں میں سے ان کو منتخب کیا ہے اور پاک بنایا ہے۔ اس واقعہ میں بھی کچھ حقائق کو حضرت مریم علیہ

السلام پر کھولا گیا۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پر اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہونا کہ وہ اللہ کے رسول ؐ پر ایمان لائیں سورہ المائدہ آیت ۱۱۱ میں موجود ہے۔ حضرت طالوت علیہ السلام کے لشکر کو نہر کے پانی کو پیٹ بھر کر نہ پینے کا حکم سورۃ البقرہ کی آیت ۲۴۹ میں موجود ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات دلائل عقلیہ سے ثابت ہے کہ کشف کے حجاب کا عذاب، آگ کے عذاب سے شدید تر ہے۔ کافر لوگ دنیا میں بھی حجاب میں رہتے ہیں اور آخرت میں بھی حجاب میں ہوں گے۔ کفار چونکہ لذت دنیا میں غرق ہوتے ہیں اس لئے انہیں دنیا کے عذاب کا شعور نہیں رہتا۔ بے حسّی یا مخدّر ہونے کی حالت میں وہ اس عذاب کو محسوس نہیں کرتے۔ کشف کا نور ایک ایسا نور ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے عطا فرما دے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لکھا ہے کہ بعض مشقتوں اور بھوک کی ریاضتوں کو برداشت کرنے کے ذریعے کفار اپنے نفس پر صفائے نفس کی پتلی سی جلد چڑھا لیتے ہیں جو دیرپا نہیں ہوتی، کیونکہ کشف کا تعلق صفائے نفس سے نہیں، صفائے قلب سے ہے حضرت مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ صفائے قلب کے حصول کا بہترین طریقہ احکام شریعہ پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ صفائے قلب چونکہ کفار کو حاصل ہو ہی نہیں سکتی تو پھر ان کو کشف کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟

رابطۂ شیخ

(رابطۂ شیخ بہ طریقِ تصوّرِ شیخ)

سالکینِ راہ طریقت کو ابتدائی مراحل میں ہی رابطۂ شیخ کی تعلیم دینا نہایت ضروری تصور کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے بغیر سلوک کی منزلوں کو طے کرنا اگرچہ ناممکن تو نہیں لیکن اس راہ پر تنہا چلنے والے مسافروں کو تصوف میں حائل گھاٹیوں اور دشوار گزاریوں کا سامنا ضرور کرنا ہوتا ہے اور منازل تصوف کی ترقی کا حصول شیخ کے ساتھ باقاعدہ ربط نہ ہونے کے باعث بہت متاثر ہوتا ہے۔ رابطۂ شیخ ایک ایسا موضوع ہے جس کے بغیر طریقت کا پودا ثمر آور نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس مضمون کی اہمیت کے پیش نظر اس کتاب کی تصنیف، طریقت کی راہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں رابطۂ شیخ کے مضمون کو کافی تفصیل سے تحریر کیا گیا ہے تاکہ راہروان طریقت کی تشنگی کو بجھانے کا مکمل سامان فراہم کیا جا سکے۔

تصوّرِ شیخ کی ضرورت کیوں؟

تصوّف یا روحانیتِ اسلام، اسلام کا ایک ایسا عالی مقام شعبہ ہے، جس میں ایک مسلمان کو اسلام کے بلند ترین مقامات پر فائز ہونے کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور اس راہ پر چلنے والے بندگان خدا جنید وبایزید رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْهِمَا جیسی ہستیاں بن کر رہتی دنیا پر چمکتے ہیں۔ روحانیت کے اس طرزِ حیات کی شناخت صرف وہی مخصوص لوگ کر سکتے ہیں جن کو روحانیت کا شعور حاصل ہو یا جنہوں نے روحانی زندگی کی لذتوں کا ذائقہ کبھی چکھا ہو۔ جو لوگ روحانیت سے قطعاً نابلد ہوں یا اس

علم کی الف اور با کی شناخت کرنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے، وہ شعبۂ روحانیت کے متعلقہ امور میں مداخلت کے ہرگز مجاز نہیں۔

اہل علم اس بات پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ گزشتہ کئی صدیوں سے یہ روحانی علم صرف پاک لوگوں کے سینوں سے دوسرے پاک لوگوں کے سینوں میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے اور جب کبھی اہل ظواہر میں سے کسی نے اس کا سطحی مطالعہ کیا تو یہ علم ان کے سروں سے اوپر ہوتا ہوا گزر گیا اور نتیجتاً انہوں نے زعمائے اسلام اور مشائخ عظام پر نکتہ چینی کرنے کی کوشش کی، حالانکہ اُن مشائخ کبار کو مقربین بارگاہِ الٰہی کا درجہ حاصل تھا۔ درج ذیل مضامین میں قارئین کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرائی جارہی ہے کہ تصورِ شیخ جیسے دقیق مسئلہ میں صرف اُن لوگوں کی آراء قابل قبول ہو سکتی ہیں جن کی زندگیاں روحانیت کے معیار پر پوری اتر چکی ہیں اور آنے والی نسلوں کے لئے جن کی حیاتِ پاک کو مشعلِ راہ سمجھا جاتا ہے۔ اس سے ہماری مراد حضرات جنید بغدادی، بایزید بسطامی، شیخ عبدالقادر جیلانی، سلطان العارفین سلطان باہو، خواجہ معین الدین چشتی، فریدالدین گنج شکر، نظام الدین اولیاء رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْھِمْ اَجْمَعِیْن وغیرہ جیسے مشائخ عظام کی ہستیاں ہیں۔ اس مسلک سے نااہل اور ناآشنا لوگوں کے لئے بقول علامہ اقبال ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

وہ عناصر جن کے باعث انسان کو ربط یعنی "خدا دوستی" کے لئے چنا گیا

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس غرض سے تخلیق فرمایا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عشق و محبت کا ربطہ قائم رکھ سکے اور پھر اس کے ذریعے باقی ماندہ مخلوق پر بھی اللہ تعالیٰ کی نیابت قائم ہو سکے۔ علامہ ثناء اللہ پانی پتی" نے بھی سورۂ الاحزاب کی آیت "اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ" کے تحت یہ لکھا ہے کہ وہ امانت جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو سونپی ہے اس سے عبادات شرعیہ مقصود نہیں بلکہ نورِ عقل اور عشق کا عطا کرنا مراد ہے کیونکہ نورِ عقل کے ذریعے انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتا ہے اور نارِ عشق سے ان تمام حجابات کو جلا دیتا ہے جو بندے اور خدا کے درمیان حائل ہوتے ہیں۔ راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ اس امانت سے مراد "بندے کی خدا دوستی" کے سوا اور کچھ نہیں اور نورِ عقل اور نارِ عشق اس دوستی کے متقاضیات میں شامل ہیں۔ رابطۂ شیخ خدا دوستی کا پہلا زینہ ہے۔ اس نظریہ کی وضاحت کہ انسان کو خدا دوستی کے لئے کیوں چنا گیا، نیچے پیش کئے گئے نکات میں کی جارہی ہے۔

۱۔ انسان میں اس امانت کو اٹھانے کی اہلیت ہونا جس کا مخلوق میں کوئی متحمل نہ ہو سکا۔

وہ امانت جس کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے سپرد کرنا چاہا، بندے اور مولا کے درمیان محبت اور عشق کا پیمان قائم کرنا، خدا سے روحانی تعلق کا استوار ہونا، ہر چیز سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط کا رونما ہونا اور بندے کا صرف اپنے رب کے لئے کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، مرنا جینا اور دیگر امور کا مربوط ہونا مراد ہے۔ ان امور میں کسی اور کا شریک ہونا ہی عبودیت کی خلاف ورزی اور شرک کے متہم ہونے کے عین مترادف ہے۔ ایسا شخص جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خالص محبت کو استوار کرے، وہ اللہ تعالیٰ کی دوستی یا ولایت کا حقدار سمجھا جاتا ہے۔ ان صفات کے حامل انسان کو ولی اللہ کہتے ہیں۔ ایسے اولیاء اللہ اپنے تمام معاملات میں ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ رہنے کے اہتمام کو لازمی تصور کرتے ہیں۔ "بندے اور مولیٰ" کی یہ دوستی ہی وہ امانت تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات پر پیش کیا۔

۲۔ انسان میں روحانیت کے نادر المثال اوصاف اپنانے کی اہلیت ہونا

بندے اور خدا کی دوستی کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ایک ولی اللہ کی روحانی دنیا کے لوازمات، معمولات، متعلقات اور تقاضوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ایسے ولی اللہ کی سی زندگی گزارنے کے انداز کو اہل تصوف نے طریقت کا نام دیا ہے۔ طریقت ہی وہ راستہ ہے جس کی وساطت سے ایک صوفی کا تعلق اور نسبت اللہ تعالیٰ سے قائم ہو سکتے ہیں اور طریقت کے طرز سے بہتر نسبت کا قائم ہونا بعید از ممکنات ہے۔ روحانیت اور تصوف کی وضاحت راقم الحروف کی کتاب "بیعت کی تشکیل اور تربیت" میں مناسب حد تک بیان کر دی گئی ہے اور اس کی مزید تفصیل عنقریب شائع ہونے والی ہماری کتاب "اسلام اور روحانیت" میں شامل کر دی گئی ہے، لیکن پھر بھی زیر غور مضمون کی وضاحت کے لئے ایک ولی اللہ کی مختصر سی شناخت اور اس کا تعارف کروانے کی غرض سے نفس مضمون پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ بندے کی خدا دوستی ہی وہ غایت تھی جس کے باعث انسان کا چناؤ اس امانت کے لئے کیا گیا جس کا بیان اوپر ہوا ہے اور بالآخر وہ امانت اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کو سونپ دی۔ حافظ شیرازیؒ اسی امانت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

آسماں بار امانت نہ توانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

(آسماں امانت کا بوجھ نہ اٹھا سکا، تو مجھ دیوانے کے نام انہوں نے فال کا قرعہ نکال دیا)

۳۔ صوفیانہ آداب اور احوال کے حامل ہونے کی صلاحیت ہونا

اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ انسان کو اس امانت کے لئے کیوں مخصوص کیا گیا تو یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ انسان میں ظلمت و عدمی اور جہل از غیر اللہ کی صفات (خیر اور شر کی جبلتوں کا فطرتاً حاصل ہونا) اس کی تخلیق کے باعث تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اولیاء اللہ کے وجود کو علامہ اقبال نے "مردِ مومن" کا نام دیا ہے اور کچھ لوگ ایسے پاکیزہ نفوس کو انسانِ کامل کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کامل ہستیوں کا کسی جگہ اور کسی وقت میں پایا جانا کامل بزرگوں کی صحبت سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ ایسے صوفیاء کا نمودار ہونا طریقت کی منازل کو طے کرنے کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

ولایت کی تکمیل کے لئے ایک صوفی کے تربیتی نظام میں چند باتوں کا اہتمام کرنا لازمی امر ہے۔ ایسے صوفی کے لئے ضروری ہے کہ وہ رموز خودی و بے خودی، اناشکنی، خدا شناسی، اپنے معاملات کی خدا سپردگی اور تادیب نفس کے آداب جیسے امور سے مکمل طور پر آگاہ ہو۔ صوفیائے کبار کے صحبت یافتہ لوگ، اعلیٰ اخلاق کے حامل، صوفیانہ ادب سے آشنا، احوال و استغراق، کیفیاتِ جذب و جنون اور رسم عاشقی کے اسباق کے حامل ہوتے ہیں۔ ایسے راہروانِ طریقت جن کو اللہ تعالیٰ اپنی دوستی کا شرف بخشتے ہیں وہ اپنے نفس کے عیوب سے آگاہ ہوتے ہوئے نفس کی آفات پر قادر ہونے کی استطاعت حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ اخلاق نبویؐ کا نمونہ پیش کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشاد کردہ طریقت کے اصولوں کو اپنانے کے خواہاں رہتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم تھا کہ اگر کوئی ان سے تعلقات کو توڑے تو وہ اس سے جوڑیں، جو انہیں محروم کرے وہ اسے عطا فرمائیں اور جو اُن پر ظلم کرے وہ اسے معاف فرما دیں۔ ایک ولی اللہ کے کردار میں بھی ایسے اخلاق کا پایا جانا طریقت کی توقعات میں شامل ہے۔

۴۔ طریقت کے مختلف منازل اور مقامات پر پہنچنے کا اہل ہونا

طریقت کی راہ پر گامزن ہونے والے اولیائے کرام اپنے مریدوں کو خالقِ کون و مکان کو پہچاننے والی نظر عطا کرتے ہیں، انہیں کردار سازی اور آشنائے حقیقت کے رموز سے آگاہ کرتے ہیں، طالبان حق کے دلوں کے دروازے معرفت الٰہی کے لئے کھول دیتے ہیں۔ ایسے تربیت یافتہ صوفی اپنے معاملات کی عمدگی کے باعث لوگوں کے دلوں میں اتر جاتے ہیں اور عوام کو وہی طریقے تعلیم کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے مشائخ سے اخذ کئے ہوں۔ چنانچہ ایک صوفی کی نظر چوروں، بدمعاشوں اور قلاشوں کو واصل باللہ بننے کی سعادت عطا کر دیتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی نگاہوں میں شفا ہوتی ہے

اور جو کسی پر ایک نگاہ ڈال دیں تو اس کی تقدیر بدل جائے۔ ایک ولی اللہ مصافِ زندگی میں اپنے معتقدین کو آہنی بازو عطا کرتا ہے، دنیا میں مسکنت، غربت اور لاچاری کی زندگی کو ترک کرنے کے بعد طوفانِ مصائب اور مشکلات سے مقابلہ کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ساحل پر زندگی گزارنے یا زمانہ سازی کے بجائے موجوں سے ٹکرا جانے اور با زمانہ ستیز ہونے کا حکم دیتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔ ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا ۔ نوائے زندگانی نرم خیز است
(ساحل پر بزم آرائی نہ کر کیونکہ اس جگہ زندگانی کی ہوا کی رفتار بہت مدھم ہوتی ہے)
بہ دریا غلط و با موجش در آویز ۔ حیاتِ جاوداں اندر ستیز است
(دریا کی موجوں سے دست و گریباں ہو جا، کیونکہ غیر فانی زندگی تصادم اور مقابلہ کرنے میں ہے)

۵۔ اہل اللہ میں عشق اور بے مثل محبّت کے جذبات کا پایا جانا

صوفیاء کی زندگی خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک بے مثل محبت اور عاشقی کا نام ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثاروں نے اس بات کا ثبوت مہیا کیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے مقابلے میں جان و مال، عزت و آبرو، الغرض اپنی دنیا کی ہر شئے کو قربان کر دیتے تھے۔ صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر محبت اور احترام کا مظاہرہ کرتے کہ ایسی عزت دنیا کے بڑے بڑے سلاطین کو حاصل نہ ہوئی۔ ایک صحابی کا سینہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں کلیوں سے زیادہ صاف اور آفتاب کی روشنی سے زیادہ تابندہ نظر آتا، جس کی نظیر آج تک کسی آنکھ نے نہیں دیکھی۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق پر مرمٹنے والے یہ پروانے راتوں کو شب خیزی اور آہ و گداز کے ہنگاموں میں بسر کر دیتے جب کہ ان کے دن جذبۂ جہاد سے سرشار اسلام کی سربلندی کے لئے میدان جنگ میں بسر ہوتے۔ ان کی راہ پر چلنے والے صوفی آج بھی ان صحابہ کرام کی زندگیوں کو مشعلِ راہ بنائے ہوئے، اپنی راتوں کو مناجات اور دعائیہ الفاظ میں اس طرح ڈھال دیتے ہیں کہ ان کے الفاظ کی جنبش عرشِ اعظم کے کناروں تک پہنچ کر فرشتوں میں وجدانی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ یہ لوگ سخاوتِ بے بخل، رضائے بے بدل، صبر و قناعتِ مستقل، مناجات کناں در بارگاہ عز و جل، غربت بلا خواہشِ عمارت و محل، خرقہ پوشیٔ فقر بے مثل، تجرد بلا آرزو و بلا امل کے اصولوں پر چلنے کے ہمیشہ خواہاں رہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ایک مسلمان کے لئے مطلوبہ عشق و محبت پر کافی طویل کلام کیا ہے۔ چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں۔

تازہ کن پیمانِ صدیقؓ و عمرؓ
چوں صبا بر لالۂ صحرا گزر
(تو بھی صدیقؓ اور عمرؓ جیسا پیمان باندھ صبا کی طرح صحرا کے لالہ سے گزر جا)

عصرِ خود را بنگر اے صاحب نظر
در بدن باز آفریں روحِ عمرؓ
(اے صاحبِ نظر اپنے زمانے کا جائزہ لے اور اپنے بدن میں حضرت عمرؓ جیسی نظر پیدا کر).

زرسم و راہِ شریعت نہ کردہ ام تحقیق
جز ایں کہ منکرِ عشق است کافر و زندیق
(میں نے شریعت کی رسم و راہ کی اس سے زیادہ تحقیق نہیں کی، کہ عشق کا منکر کافر و زندیق ہوتا ہے)

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے
(عشق کی وادی بسا اوقات طویل و عریض ہوتی ہے، لیکن کبھی (اس کی وجہ سے) سو سالہ راہ ایک آہ بھرنے میں طے ہو جاتی ہے)

علامہ اقبالؒ نے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز ادا کرنے کو ہی صحیح نماز کا طریقہ بیان کیا ہے اور یہی عشق و محبت، رابطہ شیخ کے لئے بھی مطلوب ہے۔ علامہؒ نے اپنی عبادات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کے پائے جانے کو ذیل کے اشعار میں انتہائی محبت کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ ۔

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے وجود سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب

شوق راہِ خویش داند بے دلیل
شوق پروازے بہ بالِ جبرائیلؑ
(شوق اپنا راستہ بے حیل و حجت دریافت کر لیتا ہے۔ شوق تو بالِ جبرائیلؑ سے پرواز کرتا ہے)
شوق را راہِ دراز آمد دو گام
ایں مسافر خستہ گردد از مقام
(شوق کے لئے دور دراز کی راہیں دو قدم کی طرح ہیں۔ شوق کا یہ مسافر قیام میں تھک جاتا ہے)

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں، بتکدۂ تصورات

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

۶۔ اہلِ طریقت کے فیضانِ نظر سے لوگوں کی کائنات کا بدل جانا

وہ بندے جو مولائے کریم سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں ان کی پاکیزہ زندگیوں میں ہمیں وہ اسلام نظر آتا ہے جس میں رہبانیت، جلاوطنی، شوقِ تنہائی، ترکِ علائق و موالات، عالمِ سکر میں مدہوشی، خود اختیار کردہ چلہ کشی، صحرانوردی، عورتوں سے تجرد، اپنی ذات کی نفی اور دنیا کے کاروبار سے گریز جیسے غیر اسلامی امور سے بچتے رہنے کے تاثرات پائے جاتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ نے اگرچہ ان غیر اسلامی اعمال کو اختیار کیا مگر اسلام میں ان تمام غیر اسلامی عادات کا بدل نماز، روزہ، جہاد، تقویٰ، شب بیداری، خلوت، اعتکاف، حج اور زکواۃ وغیرہ کی شکل میں موجود ہے اور یہ اسلامی امور یہود و نصاریٰ کے مذکورہ اعمال سے زیادہ موثر اور روح پرور ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی وضاحت مکتوبات شریف میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ (جس کا اس جگہ بیان کرنا طوالت کا باعث ہو گا) ۔ اگر صرف چلہ کشی کو ہی لیا جائے تو حضرت مجدد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ ان کا ایک فرض کو ادا کر دینا، غیر شرعی اور خود اختیار کردہ ہزاروں چلوں سے بہتر ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک فرض کی ادائیگی اور چلوں کے اعمال میں قطرہ اور سمندر کی بھی نسبت موجود نہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے مرشد کامل کی ایک نظر سے وہ فیض پایا ہے جو دوسروں کو چالیس دن کی چلہ کشی میں بھی میسر نہیں آسکتا۔ میں نے ان کی گفتگو میں وہ کچھ پایا ہے جو دوسرے برسوں میں بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

۷۔ ضروریات طریقت کا فہم اور ماموراتِ اسلام پر عمل کی رغبت کا پایا جانا

حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ مغیبات کا علم حاصل کرنا اور اپنی کرامات کی طرف توجہ دینا ضروریات طریقت میں شامل نہیں۔ محیّر العقول کام کرنا، ہوا میں اڑنا، پانی پر مصلّی گزارنا، کشتی کے بغیر دریا کو عبور کرنا، آزار نفس کو ترجیح دینا، اپنے بدنوں کو طرح طرح کی اذیتیں دینا، دوسرے لوگوں کے سینوں کی جاسوسی کرنا اور ان کے سینوں کو ٹٹولنا، اپنی کرامات کا اظہار کرنا۔ یہ سب امور حقیقتِ تصوف سے خارج ہیں۔ اس کے برعکس نفس کی آلائشوں، کمینی دنیا کی آرزوؤں کو دل سے نکال پھینکنا،

ماسویٰ اللہ سے علیحدگی اختیار کرنا، حب جاہ و منصب، دنیا کو دل میں جگہ نہ دینا، مفادات عاجلہ کی خواہش نہ کرنا، وطن کو کسی ایک مقام میں ہی محدود نہ جاننا، مال و جان کی بجائے اسلامی اوامر اور نواہی کو اہمیت دینا یہ تمام امور اصل شریعت اور عین اسلام ہیں۔ طریقت انہی امور کا حکم دیتی ہے اور شیخ کی گفتگو اور صحبت بھی اپنے معتقدین کو ماموراتِ اسلام کا ذوق عطا کرتی ہے اور نواہی سے متعلق دل میں بیزاری پیدا کرتی ہے۔ ان خصائل کے حامل لوگ ہی مولا دوستی کے لائق ہوتے ہیں۔

۸۔ سالک کا مثالی اخلاق اور سیرت سازی کے لئے موزوں ہونا

سالک راہ طریقت کو اس نہج پر تربیت دی جاتی ہے کہ وہ صبر و تحمل، بردباری، عجز و انکساری اور تواضع کو دل میں جگہ دے اور حاکموں کے غلط فیصلوں کے خلاف سینہ سپر نظر آئے۔ ایک ولی اللہ اپنے عصر کی عائد شدہ مزاحمتوں، عداوتوں اور مخالفتوں کے طوفانوں میں بھی حق بات پر ڈٹا رہتا ہے اور ہمت و مردانگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے ہرگز گریز نہیں کرتا۔ اہل اللہ باطل کے سامنے اپنی گردن نہیں جھکاتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان پر استقامت اختیار کرتے ہیں۔ جس قدر اذیتیں اور مصائب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر آئے وہ کسی پر بھی نازل نہیں ہوئے، چنانچہ ایک ولی اللہ بھی اسی نبوی عزم اور استقلال کے ساتھ جادۂ حق پر گامزن رہنے کا قصد کرتا ہے۔ وہ تعداد اور اسباب کی قلت کے باوجود تمام ہنگامہ خیز مرحلوں میں مکمل عزم و ثبات کے ساتھ حالات کے مقابلے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ایک کامل ولی جب خدائے لم یزل کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے تو اس کی ہیبت سے پہاڑوں میں رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ اولیائے کرام کی حیات طیبہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس قدر بلند درجہ مقبولیت رکھتی ہے کہ قرآن میں جابجا ان کی صلاحیتوں، محبتوں اور ایثار پسند روشوں کی تعریف فرمائی گئی ہے۔ یہ حقیقت قابل غور ہے کہ اللہ کے ولی اس انہماک سے نماز ادا کرتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی لکڑی گاڑ دی گئی ہو۔ ان لوگوں کا طرز زندگی ایسا رہا کہ جب اذان ہوتی تو تمام کاروبار معطل ہو جاتے اور وہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عبادت الٰہی میں مستغرق ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور کی آیت میں ان لوگوں کی شان میں فرمایا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کو دنیاوی کاروبار اور خرید و فروخت، اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتے۔ قرآن میں ایک اور جگہ ذکر ہے کہ "یہ لوگ اللہ کی رضا کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے" اور قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کا اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ "اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔" حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنگ تبوک پر اپنا تمام ساز و سامان اللہ کے نام پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں نچھاور کر دیا۔ اولیائے کرام کی قربانیوں اور جانثاریوں کی لاکھوں داستانیں ان کی خدا دوستی کا بین ثبوت ہیں۔ یہی وہ صفات ہیں جن کی خاطر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی دوستی کے لئے چنا۔

۹۔ فقر میں "مولیٰ دوستی" کے نمایاں پہلو کا مظاہرہ

بندے کی اپنے مولا کے ساتھ دوستی کا ایک نمایاں پہلو فقر ہے، جسے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ فقر تصوف کی جان ہے۔ اکثر اولیائے کرام نے فقر کو اپنا شعار بنایا ہے، حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے فقر پر فخر فرمایا ہے۔ اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ۔ (الحدیث) فقر صرف دعویٰ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک خاص نوعیت کے طرز حیات کو اپنانا ہوتا ہے۔ فقیر کا ہاتھ خالی بھی ہو تو وہ دل کا غنی ہوتا ہے۔ فقر میں فقط لباس ظاہری، جبہ سائی اور دعویٰ پارسائی نہیں ہوتا۔ یہ زندگی گذارنے کا ایک خاص شعار ہے، جس میں خود اپنے آپ سے دوری اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ پیار کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ محض بے سروسامان ہونا فقر نہیں بلکہ فقر میں ہوسِ زر، شان و شوکت اور اغیار پر انحصار کرنے کی رغبت سے دل کو کلیتاً پاک رکھنا ہوتا ہے۔ فقر کی تشریح اس مختصر تحریر میں ممکن نہیں (اس موضوع کے لئے ہماری تصنیف "اسلام اور روحانیت" کا مطالعہ فرمائیں جس میں فقر اور درویشی کے موضوع پر تقریباً چار سو صفحات کا مضمون شامل کیا گیا ہے۔) فقر کو صرف وہی جان سکتا ہے جس نے فقر کا ذائقہ چکھا ہو یا جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فقر عطا کیا گیا ہو۔ فقراء کی نظر میں دونوں جہانوں کی بادشاہی نہیں جچتی مگر ان کی شان اور تمکنت کا دبدبہ اس قدر حاوی ہوتا ہے کہ سلاطین وقت ان کی شان کو دیکھ کر لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔ اہل فقر کے دل نہ تو فاقوں سے گھبراتے ہیں اور نہ ہی مال کی کمی یا فراوانی ان کی زندگی کے احوال کو متاثر کرتی ہے۔ ان کا سب کچھ اللہ کے لئے ہوتا ہے۔ ان کے پاس کچھ نہ ہونا بھی غنا اور خدا دوستی کی غمازی کرتا ہے۔ اگر عنان حکومت ان کے سپرد کر دی جائے تو اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ وَالْحُکْمُ لِلّٰہِ (بادشاہت بھی اللہ کے لئے اور حکم بھی اللہ کا ہونے) کا اصول ان کی حکومت کا آئین ہوتا ہے۔ فقر کی شان میں علامہ اقبالؒ کے چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں جن سے فقر کی شان کا اندازہ ہوتا ہے۔

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے — خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے
خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری — وگرنہ شعر مرا کیا ہے؟ شاعری کیا ہے

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو — ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں — ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

اس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی جو فقر ہوا تلخیٔ دوراں کا گلہ مند
جو معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی اس دور میں بھی مرد خدا کو ہے میسر

صوفیا کے نزدیک فقر کے لئے یہ امر ضروری نہیں کہ وہ خرقہ پوشی اختیار کرے یا سرتراشیدہ ہونے کے ناتے سے فقیر کہلائے۔ شجرہ، چادر اور کلاہ فقر کی علامات نہیں۔ فقیر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ تسبیح بدست ہو، اس کے انداز اور احوال میں وجد ہو اور اس کے اردگرد ارادت مندوں کا حلقہ ہو۔ فقیر نہ ہی خلوت پسند، نہ مردم بیزار اور نہ ہی "حق ہُو" میں مست رہتا ہے۔ فقیر اپنے اوصاف، صفات، احوال اور قلندرانہ اداؤں سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کا مطلوب فقط قرب الٰہی اور رضائے حق میں زندگی گزارنا ہوتا ہے۔ اس کا وجود پورے جہان کے لئے باعث رحمت اور بنی آدم کے لئے انسانیت کے پیغامبر کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کا فقر پر کچھ مزید کلام ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں!
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں!
سب کچھ اور ہے جسے تو خود سمجھتا ہے زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں!
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں!

فارسی میں فقر پر علامہؒ کا کلام بہت ملتا ہے۔ کبھی آپ فرماتے ہیں کہ مسلمان میں وہ دبدبہ پیدا ہونا ایک ضروری امر ہے جس کے باعث فقیر راہ نشین تختِ کیکاؤس کے مقابل کھڑا ہو جاتا ہے۔ (بوریائے رہ نشینے درفتد با تختِ کے۔ ارمغان حجاز) اور کبھی وہ مصر کے بادشاہ فاروق کو کہتے ہیں کہ وہ اپنی بادشاہی میں فقر کی شان پیدا کرے (کہ خود در فقر و سلطانی بیامیز۔ ارمغان حجاز)۔ زبور عجم میں فرماتے ہیں کہ فقر وہ ہے جو دلوں کی سینکڑوں مملکتوں کو فتح کرتا ہے (آں فقر کہ بے تیغ صد کشور دل گیرد) جاوید نامے میں فرماتے ہیں کہ فقرِ اصل شہنشاہی ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔ ؎

از شکوہِ بوریا لرزد سریر باسلاطین درفتد مردِ فقیر
(مرد فقیر بادشاہوں سے مقابلہ کرتا ہے۔ فقیر کے بوریا کی شان سے بادشاہوں کا تخت لرز جاتا ہے)

فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر از نہیبِ او بلرزد ماہ و مہر
(جب اس کا فقر زمانے میں نمودار ہوتا ہے، تو اس کے خوف سے مہر و ماہ لرز جاتے ہیں۔)

کُلّیۂ طریقت کہ ہمہ وقت صحبتِ شیخ کے لئے رابطہ ایک ضروری امر ہے

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے، جن کو خدا دوستی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے، ان کے اوصاف کے متعلق درجِ بالا مضمون میں مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنی دوستی کے لئے کیوں منتخب کیا اور اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا کہ یہی لوگ کائنات کی بہترین مخلوق میں شامل ہیں اور یہی وہ ہستیاں ہیں جو معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کے لائق ہو سکتی ہیں۔ وہ زندگی جس میں ایسی حیاتِ طیبہ کا رنگ ہو کسی اہل دل شیخ کی صحبت میں رہنے کے بعد ہی متصور ہو سکتی ہے۔ صحبتِ شیخ کا ہر وقت میسر ہونا بسا اوقات ممکن نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں سالکِ راہ طریقت، رابطۂ شیخ کے ذریعے اپنے مرشد کے ساتھ ہمہ وقت منسلک رہ سکتا ہے۔ اس طریق میں نزدیکی اور دوری کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ رابطۂ شیخ کے ذریعے معنوی صحبت حاصل کرنے کی راہ میں کوئی چیز کسی وقت حائل نہیں ہوتی۔ حقیقتِ رابطہ کی اصل اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لِیْ مَعَ اللہِ وَقْتٌ لَایَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَكٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ

میرا اللہ کے ساتھ ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ جس میں کسی مقرب فرشتے یا نبی مرسل کی گنجائش نہیں ہوتی۔

انہی وجوہات کی بنا پر مشائخ کبار ہمیشہ طریقت کی راہ پر چلنے والے صوفیوں کو ابتدائی مرحلوں میں رابطۂ شیخ کا حکم دیتے ہیں۔ رابطۂ شیخ کو اس قدر اہمیت کیوں حاصل ہے؟ اس کی وضاحت آئندہ صفحات اور ابواب میں کی جارہی ہے۔ رابطہ قائم کرنے کا اول اور آخری مقصود ہمہ وقت اپنے دوست سے قرب حاصل کرنا ہے۔

یک لحظہ زکوئے دوست دوری در مذہب عاشقاں حرام است

(اپنے یار کے کوچے سے ایک لمحہ بھر کی دوری عاشقوں کے مذہب میں حرام ہے)

فقہی اختراعات سے اجتناب ضروری ہے

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ اسلام پر مسلمانوں نے بہت ظلم کیا ہے۔ آپ کے نزدیک دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم قرآن پاک ہے کیونکہ ہر شخص نے اسلام اور قرآنی احکام کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور بعض لوگوں نے تو قرآن کے مفہوم کو اس طرح بدل ڈالا کہ ان کی پیش کردہ تاویلوں سے جبرائیلِ امین بھی حیرت کناں ہو جاتے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں کہ اس

زمانے کے ہر نااہل شخص نے اپنی غلط تاویلوں کے باعث ہم پر دین کے راستے کو بہت تنگ کر دیا ہے۔ ؎

تنگ برما رہگزارِ دیں شد است　　ہر لیئمے راز دار دیں شد است

(دین کا راستہ ہم پر تنگ ہو گیا ہے　　کیونکہ ہر کم ظرف دین کا راز دار بن بیٹھا ہے)

دین میں ایسی بے جا دخل اندازی سے مذہب کے ہر مسئلے میں بے حد اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اور لوگ کئی گروہوں میں بٹ گئے ہیں، جس کا فائدہ دشمنان اسلام کو پہنچتا ہے۔ اس اختلاف کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ موضوع کتاب "رابطہ اور تصور شیخ" کو حضرت مجدد الف ثانیؒ اور دیگر مشائخ کبار نے تو بہت مبارک اور نیک فال قرار دیا ہے لیکن کچھ علماء نے کم فہمی کے باعث شیخ کے تصور کو شرک کے تجاوزات میں شامل کر دیا ہے۔ علامہ اقبالؒ اس موضوع پر فرماتے ہیں۔ ؎

زمن برصوفی و مُلّا سلامے　　کہ پیغامِ خدا گفتند مارا

(میری طرف سے صوفی اور ملا پر سلام ہو　　کیونکہ وہ ہم کو خدا کا کلام سناتے ہیں)

ولے تاویلِ شاں درحیرت انداخت　　خدا و جبرئیلؑ و مصطفےؐ را

(لیکن ان کی پیش کردہ تاویل حیرت میں ڈال دیتی ہے،　　خدا، جبریلؑ اور مصطفےؐ کو)

دینِ حق از کافری رسوا تر است　　زانکہ مُلّا مومن کافر گر است

(دین حق کافری سے زیادہ رسوا ہو گیا ہے کیونکہ ملا ایک ایسا مومن ہے جو کافر بناتا ہے)

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے　　نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق

حلقۂ شوق میں جرأتِ اندیشہ کہاں　　آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں　　ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

شرک فی التوحید سے بچو

اسلام میں توحید کو اولیں حیثیت حاصل ہے۔ صرف ایک خدا کو معبود مان لینا ہی توحید نہیں اور نہ ہی توحید صرف بتوں کی پوجا نہ کرنے کا نام ہے بلکہ توحید کے دائرے میں اور بھی ایسے تقاضے شامل ہیں جن کو ہم روزمرہ کی زندگی میں عام طور پر محسوس بھی نہیں کرتے اور ان کو شرک تصور نہیں کرتے۔ حدیث میں ہے کہ شرک چیونٹی سے بھی زیادہ باریک ہے کیونکہ یہ عام لوگوں کو محسوس نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ، بزرگوں سے استمداد کرنے اور ان کی توجہات طلب کرنے کو بھی توحید کے منافی تصور کرتے ہیں حالانکہ کسی ولی اللہ کے پاس لوگوں کا دعا کے لئے جانا توحید کے منافی کیونکر ہو سکتا ہے۔

(اس سلسلے میں قارئین کی سہولت کے لئے اس کتاب کے آواخر میں اولیاء اللہ سے استمداد پر ایک مفصل باب شامل کر دیا گیا ہے۔)

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ جو باتیں توحید کی اصل ہیں ان کے متعلق نہ تو علماء اور فقہا کی ایک اچھی خاصی جماعت توجہ دیتی ہے اور نہ ہی عوام کو توحید کے اس پہلو سے روشناس کیا جاتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ سلاطینِ وقت، امرا، وزراء، صاحب حیثیت اور متمول حضرات سے توقعات وابستہ رکھنا، مقتدر طبقے سے خائف رہنا، سونے چاندی اور مال و منال کی محبت میں گرفتار ہونا، نفس کی خواہشات میں منہمک رہنا، حاکموں کی خوشنودی کے باعث ان کے دروازوں کا طواف کرنا اور چند ٹکوں کے لئے یہود و نصاریٰ کی قصیدہ گوئی کرنا وغیرہ یہ سب امور شرک میں شامل ہیں اور توحید کے سخت منافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی معرفت حاصل کرنے کے لئے پیدا فرمایا اور وہ اپنی عبادت، معرفت اور محبت میں کسی کی شرکت کو پسند نہیں فرماتا، حتیٰ کہ نماز کی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ کرنا خدا کی محبت اور توجہ کے منافی ہونے کے باعث شرک کی ایک صورت ہے۔ ایک حدیث پاک کے مطابق اللہ تعالیٰ ایسے نمازی سے انحراف فرمالیتا ہے جو نماز میں اپنی توجہ کا مرکز اللہ تعالیٰ کے بجائے کسی اور شے کی طرف موڑ لے۔ نمازی کی توجہ کے انحراف کی خاطر شیطان نمازی کے دل پر قبضہ کر لیتا ہے اور اس کی نماز میں لازمی طور پر خلل اور نسیان طاری کر دیتا ہے۔ قرآن میں نفسانی خواہشات کی طرف مائل ہونے والوں کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ کچھ لوگ جو اپنی خواہشات میں گرفتار ہیں، انہوں نے اپنے نفوس کو خدا بنالیا ہے۔ (دیکھئے سورہ الجاثیہ آیت ۲۳) سورہ ابراہیم آیت ۳۵ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا موجود ہے جس میں انہوں نے خود اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے بتوں کی پوجا نہ کرنے کی التجا کی ہے۔ یہاں بتوں کی پوجا سے پناہ نہیں مانگی جارہی بلکہ سونے چاندی کے بتوں کی پوجا کرنے سے پناہ مانگی جارہی ہے کیونکہ انبیاء اور ان کی اولاد سے پتھر کے بتوں کی پوجا کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ آج اگر ہماری نمازوں میں اثر نہیں پایا جاتا تو اس کی وجہ یہی بت پرستی ہے۔ انسان کی سب سے زیادہ آبرو والی چیز پیشانی ہے اور اگر یہ خدا کے سامنے جھکنے کے بعد امراء کے سامنے بھی جھک جائے تو ایسے سجدے کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے اور نماز کے متوقع اثرات اس نمازی میں کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں؟ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

از منات و لات و عزیٰ و ہبل   ہر یکے دارد بتے اندر بغل!

(آج ہر مسلمان اپنی بغل میں لات و منات و عزیٰ و ہبل جیسے بت رکھتا ہے)۔

زبان سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل   بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی   مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

تصورِ شیخ کے متعلق کچھ غلط تصورات لوگوں کے ذہن میں بس چکے ہیں، جنہیں انشاء اللہ آئندہ صفحات میں واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس کے ساتھ تصورِ شیخ کی غرض و غایت اور اہمیت کو بھی بیان کیا جائے گا تاکہ اس سے مکمل استفادہ ہو سکے۔

رابطۂ شیخ کے معنی و مفہوم

لغت

امام راغبؒ نے مفردات میں لکھا ہے کہ رَبْطُ الفَرَسِ کے معنی گھوڑے کو کسی جگہ حفاظت کے ساتھ باندھ دینے کے ہیں۔ رُبَاطُ الجَیْشِ کا مطلب فوج کا کسی جگہ متعین کرنا ہے۔ رِبَاطُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں حفاظتی دستے متعین رہتے ہوں مُرَابَطَۃٌ کے معنی حفاظت کے ہیں۔ سورہ آل عمران میں رَابِطُوا کے معنی "مقابلے کے لئے تیار رہنا" کے ہیں۔

لغت میں مُرَابَطَۃ کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ اسلامی ممالک کی سرحدوں کے دفاع کے لئے پہرہ دینا اور دوسرا نفس کو ناجائز خواہشات سے روکنا۔ نفس کو اس کی خواہشات سے روکنا مجاہدۃ النفس کہلاتا ہے جو جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے۔ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا بھی رَبَطٌ کہلاتا ہے۔ سورہ الانفال کی گیارہویں آیت میں لِیَرْبِطَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنوں کے دلوں کی ڈھارس بندھانا ظاہر کیا گیا ہے۔ محاورۃ رَابِطُ الْجَاءِشُ سے مراد مضبوط دل شخص کے ہیں۔

اَلْمُنْجِد میں رَابَطَہٗ، رِبَاطًا وَمُرَابَطَۃً فِی الْاَمْرِ کے معنی کسی امر پر ہمیشگی اختیار کرنا ہے اور اَلرِّبَاطُ وہ شئی ہے جس سے کوئی چیز باندھی جائے، یہ لفظ دل، گھوڑے اور قلعہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اَلرَّبَطُ کا لفظ راہب یا دنیا سے کنارہ کش ہونے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ دل کا کسی مطلوب (یعنی اللہ تعالیٰ یا کسی شیخ) کے ساتھ بندھے رہنے کو رابطہ کہتے ہیں۔ رابطہ میں انسان کو غیر اللہ کے تمام لشکروں سے اور نفس کو سرکشی سے حفاظت میں رکھنا مطلوب ہوتا ہے۔ دوسرے معنوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس طرح کرنے سے انسان کا دل تمام آفات دنیوی سے محفوظ رہتا ہے اور شیخ کی طرف سے توجہ ملنے کے باعث روحانی قوت حاصل کرتا ہے۔

مذکورہ بالا معانی کے علاوہ ربط کا استعمال، ربط و ضبط ملت، ربط و نظام، ربط و سلسلہ، ربط افکار، ربط و معانی وغیرہ کے اظہار کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں   موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

طریقت میں "رابطہ اور تصورِ شیخ" اوّلین سبق ہے

رابطۂ شیخ سے مراد یہ ہے کہ مرید اپنے شیخ کی صورت کو اپنے سامنے یا اپنے دل میں ایسے رکھے جس طرح کوئی چیز ہر وقت نگاہ میں رکھی جاتی ہے یا اپنی صورت کو شیخ کی صورت ہی تصور کرے، اگرچہ اس کا شیخ سامنے نہ ہو۔ چنانچہ مرید اپنے شیخ کی حرکات کو پیش نظر رکھے گا اور اپنے ہر کام کو عین اسی انداز میں کرے گا جس طرح اس کے شیخ کا انداز ہو بلکہ اپنی ہر حرکت کو شیخ کی حرکت ہی تصور کرے گا۔ جب رابطے کا غلبہ ہو جائے تو مرید اپنے آپ کو شیخ کے روپ میں دیکھتا ہے اور خود کو اس کے لباس میں ملبوس اور اسی کی صفت سے متصف پاتا ہے۔ وہ جدھر دیکھتا ہے اپنے شیخ کی صورت کو ہی دیکھتا ہے۔ ایسے مرید کو "فنافی الشیخ" کہتے ہیں اور یہ "فَنَافِی الشَّیخ" کا مقام "فَنَافِی اللہِ" کا مقدمہ (ابتداء) ہے۔ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ

در و دیوار چو آئینہ شد از کثرتِ شوق   ہر کجا می نگرم روئے ترا می بینم

(میرے کثرت شوق کے باعث در و دیوار آئینہ بن گئے ہیں۔ جدھر بھی دیکھتا ہوں آپ کا چہرہ ہی نظر آتا ہے)

دل میں تو، آنکھوں میں تو، خیالوں میں تو   بجز تیرے اب خیالات میں کون آتا ہے؟

رابطہ بھی صحبت کی مانند ہر وقت وصول الی اللہ حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ اس سے شیخ اور پھر حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے انوار کا انعکاس یا انصباغ حاصل ہو جاتا ہے اور شیخ کے ساتھ نہایت درجہ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی مناسبت کی وجہ سے سالک اپنے شیخ کے باطن سے فیض حاصل کر لیتا ہے۔ اس حقیقت کی بنا پر حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ نے فرمایا کہ "پیر کا سایہ ذکر حق سے بہتر ہے" یعنی شیخ سے رابطہ رکھنا ذکر کرنے سے زیادہ نفع بخش ہے کیونکہ سالک اپنی ابتدائی حالت میں اللہ عز و جل کے ساتھ اپنی مناسبت قائم کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔

زاں روئے کہ چشمِ تست احول   معبودِ تو پیرِ تست اوّل

(جب تیری آنکھ ابتداء میں کج بین ہے۔ لہٰذا تیرا اول قبلہ تیرا مرشد ہے)

جس طرح حضرت اویس قرنیؒ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا تصور باندھ کر فیض لیتے تھے اسی طرح ہم اولیاء کرام کی زندگی میں اور بعد میں ان کے مزارات سے فیض لے سکتے ہیں، مگر چونکہ مبتدی ایسا نہیں کر سکتا لہٰذا ابتداء میں اپنے شیخ کو درمیان میں رکھتا ہے۔

رابطہ اللہ کی صحبت کے لئے راہ ہموار کرتا ہے

طریقِ رابطہ کے پہلے درجے میں اپنے شیخ سے فیض حاصل کیا جاتا ہے اور پھر یہ رابطہ اللہ سے قائم ہو جاتا ہے۔ صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پہلی ہی صحبت میں ایسا

باکمال مقام حاصل کر لیا تھا جو اولیائے امت کو طویل عبادات کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ایک جلوۂ باکمال کے ساتھ صحابہ کرام کے لطائف سے کدورتوں کے پردے دور ہو گئے اور ان کو اللہ تعالیٰ کا وصل بے مثال حاصل ہو گیا۔ حضرات نقشبند نے اب بھی انعکاس کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فیض حاصل کرنے کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے جس کو طریقِ رابطہ کہا جاتا ہے۔ اس طریقے سے سالکینِ راہ طریقت غائبانہ صحبت کے ذریعے واصلینِ باللہ کے دلوں کے انوار میں رنگے جاتے ہیں اور شیخ کی توجہ سے انوار الٰہیہ کا انعکاس حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کو انصباغ (حصہ لینا یا کسی چیز کے لئے کھڑا ہونا) بھی کہتے ہیں۔ اس حصول فیض کے لئے شیخ کامل کی صحبت کے آداب ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہیں۔

صوفیائے کرام کا قول ہے کہ وصول الی اللہ کے لئے چلّوں کی نسبت توجہ کا راستہ (رابطہ) بہت قریب ہے۔ حضرت خواجہ ابو یوسف ہمدانی ؒ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صحبت میں رہو۔ اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو اس بزرگ کی صحبت میں رہو جو اللہ کی صحبت میں رہتا ہے، کیونکہ اس کی صحبت کی برکت ہی تمہیں اللہ کی صحبت تک پہنچا دے گی۔ مولانا روم ؒ فرماتے ہیں۔

ع ہر کہ خواہد ہمنشینی با خدا گو نشیند در حضورِ اولیاء

(جو اللہ کی ہمنشینی چاہتا ہے اسے کہو کہ وہ اولیاءاللہ کے حضور بیٹھا کرے)

حضرت سائیں توکل شاہ صاحب ؒ سے فَنَافِی الشَّیخ کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ فنافی الشیخ میں بہت جلدی فائدہ ہوتا ہے۔ واصل باللہ ہونے کا آسان اور جلدی طے ہونے والا راستہ یا طریقہ یہی ہے کیونکہ وہ کملات اور تجلیات جو پیشوا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے (بلاوسیلہ یا بنفس نفیس) وارد ہوتی ہیں وہ شیخ کے ساتھ محبت ہونے کی وجہ سے بالتَّبعَ (طفیلی ہونے یا پیروی میں) مرید پر بھی وارد ہونے لگتی ہیں۔ گویا اس طرح پیشوا کے ساتھ ساتھ مرید کی بھی ترقی ہونے لگتی ہے۔ فرماتے ہیں تصور کو یہاں تک پکانا چاہئے کہ مرید کی حرکات و سکنات نشست و برخاست غرضیکہ ہر فعل میں پیشوا کی ادائیں آجائیں اور آخر کار پیشوا کی صورت کے مشابہ ہو جائے۔ اسی سے پھر آگے راستہ کھل جاتا ہے۔

نظریۂ رابطہ کی وضاحت

رابطۂ شیخ کوئی ایسی نئی چیز نہیں جس کو مشائخ نے اپنی مرضی سے اختیار کر لیا ہو بلکہ قرآن میں سورۂ المائدہ کی آیت وسیلہ (آیت نمبر ۲۵) میں شیخ کا وسیلہ اختیار کرنے کا ذکر آیا ہے اور وسیلے کو اختیار کرنے والے کے لئے ربط کا پیدا کرنا ایک ضروری امر ہے۔ یہ رابطہ کیا نوعیت رکھتا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے، شیخ کا اس میں مرکزی کردار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ شیخ کے ذریعے کس طرح کھلتا ہے؟ ان تمام امور اور ان سے متعلقہ معاملات کی وضاحت اس باب میں پیش کی جا رہی ہے۔

روح اپنے وطن کی تلاش میں رہتی ہے

مولانا روم ؒ کی مثنوی کا پہلا شعر اس قدر معنی خیز ہے کہ اس کے ایک شعر پر ایک ہزار صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب (بحر العلوم) لکھی جا چکی ہے اور وہ شعر درج ذیل اشعار میں سے پہلا شعر ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند — وز جدائی ہا شکایت می کند

(بانسری سے سن کیا حکایت سناتی ہے۔ اور ہجر و فراق کی (کیا) شکایت کرتی ہے)

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

(کہ جب سے مجھے جنگل سے کاٹ کر جدا کر دیا گیا ہے۔ میرے نالے سے مرد و زن روتے ہیں)

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

(میں ایسا سینہ چاہتی ہوں جو فراق سے پارہ پارہ ہو چکا ہو۔ تا کہ میں اسے اپنا درد شوق کھل کر سناؤں)

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش — باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

(جو کوئی اپنے اصل وطن سے دور ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ایامِ وصل کو پھر تلاش کرتا ہے)

درج بالا اشعار میں "نے" سے، مومن، متقی، صالح، ولی یا نبی کی روح مراد ہے جو وصلِ محبوب یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے بے قرار ہے۔ روحِ انسانی، جو اپنی سرشت کے اعتبار سے پاک و نورانی مخلوق ہے، اس کا اصل وطن عالمِ ملکوت یعنی عالمِ ارواح ہے، جہاں وہ ذاتِ حق کی محبت اور ذکر و فکر کی سعادت سے بہرہ ور تھی اور تمام روحانی عیوب اور اخلاقی رذائل سے پاک تھی۔ ان رذائل کا گھر عالم ناسوت میں انسان کا جسم ہے۔ جب روح عالم اجسام میں آئی تو ملکوتی سعادتوں میں کمی کا آنا لازم تھا اور عالم ناسوت میں روحوں کی اکثریت بغض و نفاق، نزاع و فساد، تکبر و کینہ، رذائل غضبیۃ، حسد و طمع، ریاء و فخر، بخل و خیانت اور عیوب شہویہ میں ملوث ہونے لگی اور ماسوائے چند نفوس کے عام لوگ ان رذائل کا شکار ہونے لگے۔ جو شخص قلبِ بصیر اور نفس عبرت گیر رکھتا ہے یا کسی پیر کامل کی صحبت نے اس کے دل سے حجابِ غفلت اٹھا دیا ہے، اس کی روح اس بات سے آگاہ ہوتی ہے کہ وہ کن سعادتوں سے الگ ہو گئی ہے اور اس دنیا میں کن آلودگیوں میں گھر گئی ہے۔ صالحین کی ارواح ان آلودگیوں میں ملوث نہیں ہوتیں۔ ان کو عالم ارواح کے ایام کی یاد ستاتی ہے تو وہ لوگ پھر انہی ایام کی لذّت کو حاصل کرنے کے لئے ہمہ وقت ذکرِ الٰہی اور محبتِ الٰہی میں مشغول اور منہمک رہتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی ولی کامل کے ساتھ بیعت کا رشتہ قائم کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو ان پر وصل الٰہی اور فیضان الٰہی کے دریاؤں کے دہانے کھول دیئے جاتے ہیں اور وہ اس دنیا میں ہوتے ہوئے عالم ملکوت کی لذتوں سے سرشار ہونے لگتے ہیں۔ ان کی ارواح اپنے وطن کی طرف مائل پرواز ہونے لگتی ہے، حتیٰ کہ ان کو عالم ارواح کی تمام کیفیات محسوس ہونے لگتی ہیں۔ ایسی روحوں کو زمان و مکاں پر تصرف حاصل ہو جاتا ہے اور وہ جب چاہیں، جہاں چاہیں ایک آنکھ کے جھپکنے کی دیر میں پہنچ جاتی ہیں۔ اس سفر کی پہلی منزل تصور شیخ ہوا کرتی ہے اور رفتہ رفتہ اہل معرفت کی ارواح واصل بالحق ہو جاتی ہیں۔ وصال الٰہی کے لئے وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کا سینہ فراق یار میں پارہ پارہ ہو چکا ہو اور وہ مقصود کے حصول کے لئے مشکل سے مشکل منزلوں کو اپنے حسنِ ذوق و اشتیاق کے باعث طے کر لیتے ہوں۔ یہ سب کچھ اہل طریقت کی وساطت سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ مولانا رومؒ کے مذکورہ بالا اشعار اسی حقیقتِ دردِ عشق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

انسان محض جسم نہیں بلکہ دیدۂ حق بین بھی ہے

مثنوی کے دفتر ششم میں مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ انسان خود تو گوشت پوست سے مرکب ہے مگر اس کی قدر و قیمت اس کی طاقت دیدار یا شعورِ انسانی پر انحصار کرتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ع آدمی دیدست و باقی لحم و پوست ہر چہ چشمش دیدہ است آں چیزِ اوست

(آدمی دیدہ ور ہونے کا نام ہے، باقی تو گوشت پوست ہے۔ آدمی کی چیز وہی ہے جو اس کی آنکھ نے

دیکھ لیا)

مولانا فرماتے ہیں کہ چیونٹی جو ایک دانے کو دیکھ لیتی ہے تو بس اسی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ اس کو اس بات کی عقل نہیں کہ اس جہانِ دنیوی میں دانوں کے بڑے بڑے ذخیرے بھی موجود ہیں۔ وہ اپنی کم عقلی اور اندھے پن سے ناچیز کو چیز سمجھ بیٹھی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ انسان جسم کے اعتبار سے ایک حقیر ذرّہ ہے لیکن روح کے اعتبار سے سب سے اونچا زحل ستارہ ہے۔ انسان جسم کے اعتبار سے ایک لنگڑی چیونٹی کی طرح ہے اور روح کے اعتبار سے شاہ سلیمان کی طرح ہے۔ انسان کو جان لینا چاہئے کہ وہ محض ایک جسم ہی نہیں ہے بلکہ وہ دیدۂ حق بیں ہے (جو خدا کا مشاہدہ کر سکتا ہے) انسان کی حقیقت دید حق کا آلہ یعنی روح ہے اور بقیہ محض گوشت پوست ہے۔ انسان کی ملکیت وہی ہے جو اس کی آنکھ دیکھ سکے ورنہ باقی ہر شے تو ناچیز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک جگہ مولاناؒ نے آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی آنکھ سے تعبیر کیا ہے۔

ع۔ بود آدم دیدۂ نورِ قدیم

خدا تک لے جانے والے راستوں میں طریقہ نقشبندیہ سب سے اقرب طریق ہے

حضرت مجدد علیہ الرحمہ مکتوبات شریف میں تحریر فرماتے ہیں کہ طریقۂ نقشبندیہ سب طریقوں سے اقرب ہے کیونکہ اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وسیلہ ہیں۔ طبعاً وسیلہ جس قدر قوی ہو گا راہِ وصول بھی اتنا ہی اقرب ہو گی اور قطع منازل (منزلوں کا طے ہونا) اتنا ہی جلدی ہو گا۔ چونکہ ہماری نسبت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ہے جو تمام پیغمبروں کے بعد افضل البشر ہیں اس لئے ان کے ساتھ نسبت (یعنی دوام آگہی یا دوام حضور) یقیناً سب آگاہیوں اور نسبتوں سے افضل ہے۔

حضرت مجدّد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ درج بالا طریق موصل ہے (وصل حاصل کرانے والا) اور یہاں عدم وصولی کا احتمال نہیں کیونکہ نقشبندی سالکوں کا پہلا قدم جذبہ ہے جو وصول الی اللہ کی دہلیز ہے اور سالک فوراً (پہلے قدم پر ہی) وصول الی اللہ کی دہلیز پر پہنچ جاتا ہے۔ اس طریق میں سلوک اور جذبہ دونوں ملے جلے رہتے ہیں کیونکہ اس میں نہ سلوک خالص ہے اور نہ جذبہ محض ہے۔ شیخ کی صحبت میں رہ کر سالک اگر وہ شرائط جو مشائخ نے ضروری قرار دی ہیں بجالائے تو سالک واصل ہو جاتا ہے۔ (جذبہ و سلوک میں فرق نیچے ملاحظہ فرمائیں)۔

خواجگانِ نقشبند رحمتہ اللہ علیہم لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہٗ نے بارگاہ رب العزت میں دعا کی تھی کہ مجھے ایسا طریقہ عطا فرمایا جائے جو اقرب اور موصل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی

دعا کو قبول فرمایا اور آپ کو راہ سلوک پر جذبہ کی تقدیم کا الہام ہوا (یعنی مریدوں میں سلوک سے پہلے جذبہ پیدا کیا جائے) جبکہ دوسرے طریقوں میں سلوک کو جذبے پر مقدم کرتے ہیں اور پہلے محنت شاقہ اور ریاضتوں میں ڈالتے ہیں، یعنی اربعین بیداری (چالیس دن رات جاگنے) اور گرسنگی (بھوکا رہنے) کا حکم دیتے ہیں۔ دوسرے طریقوں میں پہلے مرید کے خصائل اور نفس کو مصفا کیا جاتا ہے اور جب مرید نفس کی طہارت کے بعد اپنے سے باہر عالم مثال میں دیکھتا ہے مثلاً ستارہ یا ہلال یا ماہ ناقص یا ماہ کامل یا آفتاب تو اس کے بعد شیخ اس کو فنا اور تصفیۂ نفس کی بشارت دیتا ہے۔ اس طریقے کو سلوک کہتے ہیں اور اس سیر کو سیر آفاقی کہتے ہیں۔ (کیونکہ مرید احوال اور انوار میں سے جو کچھ دیکھتا ہے آفاق میں دیکھتا ہے)

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ شیخ اپنے مرید کو اسمِ ذات کا ذکر تلقین کرتا ہے اور محض اپنی توجہ سے ہی مرید کے عالم امر کے لطائف کے تزکیہ میں مشغول ہوتا ہے، یہاں تک کہ مرید فنا اور بقا کی صفت سے متصف ہو جاتا ہے۔ اسے جذبہ کہتے ہیں اور اس سیر کو سیر انفسی کہتے ہیں کیونکہ اس سیر میں طالب جو کچھ استنارت (نور طلب کرنا) ترقی اور وصولی و فنا دیکھتا ہے اپنے اندر دیکھتا ہے۔ حضرت مجددؒ علیہ الرحمۃ اس سیر کو انفسی اس لئے فرماتے ہیں کہ انفس، اسماء و صفات باری تعالیٰ کے ظلال و عکوس کے آئینے ہو جاتے ہیں، نہ یہ کہ سالک کی سیر نفس میں ہوتی ہے۔ (یہاں ظلال کی سیر انفس کے آئینوں میں ہوتی ہے)

عام آدمی، جس کو کشف نہیں ہوتا، اس کی دعا کی قبولیت کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اس کو دعا میں لذت آتی ہے اور دل لگتا ہے۔ جن لوگوں پر انکشاف ہوتا ہے وہ یا تو اللہ کی طرف سے کوئی ندا سن لیتے ہیں کہ تمہاری دعا قبول کی گئی ہے یا ان پر قبولیت کی تجلیؔ جو لذت اور سرور والی ہو وارد ہونے لگتی ہے اور وہ اس کو دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ دعا قبول ہو گئی ہے۔

جذبہ اور سلوک میں فرق

خواجگان نقشبند قُدِّسَ سِرُّهُمْ کے طریقے میں اسمِ ذات (اللہ) کا ذکر سکھنے سکھانے اور نفی اثبات کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا قول (حضرات القدس ص ۱۶۸ جلد دوم پر) نقل کیا گیا ہے کہ جو کچھ ہم کو کشف سے معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اسم ذات کو جذبے سے زیادہ مناسبت ہے جبکہ ذکر نفی اثبات کو سلوک سے منسوب کرتے ہیں۔ چونکہ جذبے کا مقام مبتدی کے حال کے زیادہ مناسب ہے اس لئے طریقۂ نقشبندیہ کے مبتدیوں کے لئے اسم ذات یعنی لفظ "اللہ" کے تکرار کرنے کی تاکید کی جاتی ہے اور یہی ان کے لئے بھی بہتر ہے۔ جب کوئی سالک راہ سلوک میں قدم رکھے تو اس وقت نفی اثبات لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کا ذکر اس کے حال کے مطابق ہوتا ہے اور اس وقت اس ذکر کو بڑھا دیا جاتا ہے۔

روحِ انسانی کا خدا سے رابطہ

حیات انسانی کا رابطہ حیات الٰہی سے کس انداز پر قائم ہے، اس کو پوری طرح نہ تو

فلسفہ واضح کر سکا ہے اور نہ کوئی مثال۔ دونوں متصل بھی ہیں اور منفصل بھی۔ مگر ان کے مابین مادی یا منطقی علت و معلول کا سا رابطہ نہیں۔ یہ تعلق وجدانی اور حقیقی ہے، لیکن کسی استدلال سے واضح نہیں ہو سکتا۔ مولانا روم نے اس رابطے کو دریا اور ماہی کا باہمی تعلق ہونا ظاہر کیا ہے۔ فرماتے ہیں خدا اور انسان کی مثال دریا اور مچھلی کی سی ہے کیونکہ مچھلی اپنی زندگی کے لئے دریا کی محتاج ہے، وہ اس کے اندر غرق رہتی ہے لیکن پھر بھی پانی پانی ہے اور مچھلی مچھلی ہے۔ دونوں میں کمال درجے کا اتصال ہے لیکن دونوں کا جنسوں میں جو فرق اور فصل ہے وہ قائم رہتا ہے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا اور بندے کا یہ اتصال خدا کے ساتھ رابطہ استوار رکھنے کے باعث ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

روحانی معراج، رابطہ اور قربِ الٰہی وغیرہ مکانی نہیں

مولانا روم ؒ نے لکھا ہے کہ روحانی حقائق نہ زمانی ہیں اور نہ مکانی ہیں۔ روح کا سفر اور اس کا عروج و زوال بھی کوئی مکانی حیثیت نہیں رکھتا۔ ذات و صفات الٰہیہ اور روحانی حقائق کے لئے اگرچہ مادی دنیا کے اعتبار سے سمجھانے کو زمانی اور مکانی تشبیہوں میں بیان کیا جاتا ہے مگر حقیقت میں ان پر زمان و مکاں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ خدا کے پاس جانے یا اس کا قرب حاصل کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مادی افلاک کو عبور کر کے اس کے پاس پہنچنے کی ضرورت ہے۔ مولانا ایک جگہ فرما چکے ہیں۔ ؎

عشق نے بالا نہ پستی رفتن است — عشقِ حق از جنسِ ہستی رستن است

(عشق یہ نہیں کہ کوئی اوپر جائے یا نیچے — خدا کا عشق اپنی ہستی کی جنس سے الگ ہوتا ہے)

مولانا فرماتے ہیں کہ روح کا سفر ارتقائی ہوتا ہے۔ ایک ادنیٰ حالت سے دوسری بہتر حالت تک ترقی کرنے کو رجعت الی اللہ کہتے ہیں۔ مولانا اس سفر کو سمجھانے کے لئے ایک مثال پیش کرتے ہیں کہ انسان کی نطفہ سے لے کر پیدائش اور بلوغ تک جو ترقی ہے وہ سیر و سفر مکانی نہیں۔ دنیا کے زمان و مکان تو مادی دنیا کے حقائق کو سمجھانے کے لئے آلات ہیں۔ عالم ملکوت اور عالم لاہوت کی باتوں کو دنیاوی مثالوں سے واضح نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا روم ؒ فرماتے ہیں۔ ؎

ایں دراز و کوتہ اوصافِ تن است — رفتنِ ارواح دیگر رفتن است

(یہ دراز اور کوتاہ ہونا جسم کے اوصاف ہیں — روحوں کا جانا اور ہوتا ہے (جسم کا جانا اور ہوتا ہے)

سیرِ جاں بےچوں بود در دور و دیر — جسمِ ما از جاں بیاموزید سیر

(روح کی سیر بے مثال ہوتی ہے اور اس میں دور اور دیر کی اصطلاحیں نہیں۔ ہمارا جسم روح سے سیر کرنا سیکھتا ہے)

اہلِ طریقت کا خیال ہے کہ ہر انسانی چیز کی نشوونما روح کی قوت پر منحصر ہے۔ روح درست ہے تو جسم بھی درست ہوتا ہے۔ بیماری پہلے روح کو لگتی ہے اور بعدازاں جسم میں منتقل ہوتی ہے۔

شیخ کا چہرہ ہی مرید کے تصورات کا آئینہ ہے

مولانا رومؒ دفتر دوم حصہ اول میں فرماتے ہیں کہ تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا ۔ یعنی ہر چیز کی معرفت اور پہچان اس کی ضد کے مقابل میں آنے سے ہوتی ہے۔ مولانا رومؒ اس سے یہ بھی مراد لیتے ہیں کہ جب کوئی مرید اپنے آپ کا معائنہ کرنا چاہے تو اسے اپنے مرشد کے آئینہ میں دیکھنا ہو گا۔ کیونکہ ایک حدیث کے مطابق ایک مومن دوسرے کے لئے آئینہ ہے۔ ایسا کرنے سے وہ اس آئینہ میں اپنے نقائص کا معائنہ کرلے گا۔ اس انداز کے ساتھ اپنا جائزہ لینے کو معرفت نفس کہتے ہیں اور یہ معرفت نفس ہی معرفتِ الٰہی کا زینہ ہے۔ چنانچہ اگر اپنے آپ کو دیکھنا ہو تو اپنی دنیاوی حیثیتوں یا نفسانی صورتوں کو نہ دیکھا جائے بلکہ اپنے عیوب پر نگاہ رکھی جائے۔

ابراہیمؑ کی ستاروں کی طرف توجّہ ان کو خدا تک لے گئی

مولانا رومؒ نے درجِ بالا کلام کو مثنوی میں بہت طول دیا ہے لیکن مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا رومؒ اس نظریہ کے حامل ہیں کہ مرید کو اپنی روحانی صورت کا معائنہ کرنے کے لئے اپنے مرشد کا آئینہ درکار ہے، کیونکہ اس سے بہتر کوئی آئینہ ممکن نہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کا احسان ہے کہ جب مرید کو مرشد کا خیال آجائے تو مرید کو اپنا خیال نہیں رہتا بلکہ تصورِ شیخ قائم ہو جاتا ہے. حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تصور تک پہنچ جاتا ہے۔ اپنی اس بات کو واضح کرنے کے لئے وہ حضرت ابراہیمؑ کی مثال پیش کرتے ہیں کہ جب وہ خدا کی تلاش میں نکلے تو پہلے پہل آپ نے ستارے کو دیکھ کر کہا "ھٰذَا رَبِّیْ" (یعنی یہ میرا رب ہے) یہ ایک ایسا دعویٰ تھا جو بظاہر بت پرستی پر مبنی تھا لیکن ستارے کو ماننا حقیقتاً ستارے کے انکار کا باعث بنا اور یہ خیال آپ کو وجود باری تعالیٰ کے اثبات کی طرف لے گیا۔ لہٰذا ان کی بت پرستی دراصل بت شکنی تھی۔ بعض لوگوں کو تصورِ شیخ بظاہر بت پرستی نظر آتی ہے، لیکن تصور شیخ سے ہمیں اپنے نفس کی حقیقت معلوم ہوتی ہے اور اس کے ذریعے معرفت خداوندی حاصل ہوتی ہے۔

اپنے شیخ سے والہانہ محبت کی ایک خوبصورت مثال حضرت امیر خسروؒ سے ملتی ہے۔ جسے وہ خود اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ "خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند" (یعنی مخلوق کہتی ہے کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے) اور وہ اپنے شیخ سے بت پرستی کی حد تک محبت کرتا ہے۔ لوگوں کے

اس اعتراض پر حضرت امیر خسروؒ نے بجائے اپنی صفائی پیش کرنے کے نہایت بے باکی سے فرمایا "آرے آرے می کنم باخلق و عالم کار نیست" (یعنی ہاں ہاں میں بت پرستی کرتا ہوں لیکن مخلوق کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے) مولانا رومؒ حضرت ابراہیمؑ کے ستارے کو خدا ماننے کے عمل کا یوں ذکر فرماتے ہیں۔

چوں خلیلؑ آمد خیالِ یارِ من　　　صورتش بت گر و معنی بت شکن
(میرے یار کا خیال خلیل اللہ کی طرح ثابت ہوا اس کا ظاہر بت پرستی اور اس کی حقیقت بت شکنی ہے)

شکرِ یزداں را کہ چوں اُو شد پدید　　　در خیالِ او خیالِ حق رسید
(خدا کا شکر ہے کہ وہ (مرشد) جب ظاہر ہوا، تو اس کے تصور میں اللہ تعالیٰ کا تصور حاصل ہوا)

اس کلام سے مولانا رومؒ کی مراد یہ ہے کہ تلاشِ حق کے لئے مرشد کا زینہ در کار ہے۔ جو شخص اپنے مرشد کے در کی خاک سے بے نیاز ہے۔ اس کا سر ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے۔ اپنے آپ کو پیر کے آئینہ میں دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ انسان کو دیکھنا چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کے لائق ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو ہی پسند کرتا ہے۔ قرآن میں پاک عورتوں کو ہی پاک مردوں کے لئے مخصوص ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر چیز اپنے ہم جنس کے ساتھ ہی چل پھر رہی ہے۔ گمراہ لوگ گمراہوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جو گمراہ نہیں وہ ہدایت یافتہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

ناریاں مر ناریاں را جاذب اند　　　نوریاں مر نوریاں را طالب اند
(اہل آتش، اہل آتش کو اپنی طرف بلاتے ہیں　　　نوری لوگ نوریوں کے طالب ہیں)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ سیاہ فام لوگ سیاہ فام لوگوں کے رفیق ہوتے ہیں اور رومیوں کو رومیوں کے ساتھ ہی کام پڑتا ہے۔

وہ اثرات، جو توجّہ الی الشیخ اور فنافی الشیخ ہونے سے مترتّب ہوتے ہیں

مثل مشہور ہے کہ ایک اکیلا اور دو گیارہ۔ جب مرید اپنے اشغال میں شیخ کی ذات کو اپنی ہمراہی میں لے لیتا ہے تو اس کی معیت کے باعث پیر کے تمام اثرات اس پر وارد ہونا شروع ہو جاتے ہیں، جن میں سے کمترین مرتبہ یہ ہے کہ مرید کا احساس تنہائی ختم ہو جاتا ہے اور اگر دو ہستیاں ایک کام میں شامل ہو جائیں تو اس کی کیفیت اکیلے ہونے سے بہر حال بہتر اور قوی تر ہو جاتی ہیں۔

راقم الحروف کی کتاب "حضور قلب" میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ

جب کوئی شخص کسی مرشد یا نبی یا ذات باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس ہستی کا فیضان ایک جھروکے کی راہ سے مرید کی طرف آنا شروع ہو جاتا ہے اور سالک اس فیض رساں ہستی سے اس کی صفات اپنے اندر جذب کرنے لگتا ہے۔ ان صفات کا جذب کرنا سالک کی اپنی ہستی اور کشش کے مطابق ہوتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے تو یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ بعض اوقات فیض رساں ہستیوں کی روحیں سالک کے پاس حاضر ہو کر اعانت فرماتی ہیں۔ بعض لوگوں کی تربیت ایسی روحوں کے ذریعے ہوتی ہے جو تربیت لینے والے کے زمانے سے کئی سو سال قبل وصال کر چکی تھیں۔

صوفیاء سے منقول ہے کہ جو لوگ فنا فی الشیخ ہو جاتے ہیں وہ اپنی صفات سے فنا اور بالآخر شیخ کی صفات سے بقا حاصل کر لیتے ہیں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت باقی باللہؒ کے چند مرید رات گئے آپ کے آستانے پر پہنچے تو آپ نے فرمایا "جو شخص ان کو کھانا کھلائے گا ہم اسے خوش کریں گے"۔ آپ کے باورچی نے ان مسافروں کے لئے کھانا تیار کیا اور سب کو کھلایا۔ دوسرے روز اس شخص نے جب اپنا انعام طلب کیا تو حضرت باقی باللہؒ نے فرمایا "مانگو کیا مانگتے ہو؟" باورچی نے عرض کیا کہ حضور اپنے جیسا بنا دیں۔ آپ نے فرمایا کہ تو اس بات کا متحمل نہیں ہو سکے گا، لیکن اس کے اصرار پر آپ نے باورچی کو اپنے سینے سے لگایا اور جب الگ کیا تو دونوں کا حال ایک سا نظر آیا مگر فرق یہ تھا کہ حضرت باقی باللہؒ تو باہوش تھے اور وہ باورچی بے ہوش و حواس تھا۔

رابطۂ شیخ میں شیخ کی صحبت میسر ہو جاتی ہے

راقم الحروف کی کتاب "اسلام اور روحانیت"، "حضور قلب" اور "حسنِ نماز" میں صحبتِ شیخ سے حاصل ہونے والے فیوض کا کافی حد تک ذکر آچکا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ رابطۂ شیخ ایک ایسا عمل ہے کہ جس میں جس ہستی کے ساتھ رابطہ قائم کیا جائے اس کا فیض ایسے آنا شروع ہو جاتا ہے جیسے کوئی چھوٹا سا مٹکا یا چھوٹی سی ندی ہو (یعنی مرید) جو کسی بڑے دریا (یعنی پیر) کے ساتھ مل جائے۔ مرید کی ایسی چھوٹی سی ندی کا پانی کبھی ختم نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک بہت بڑا پہاڑ بھی غرق ہو سکتا ہے۔ ظاہر بین آنکھ تو فقط یہ دیکھ رہی ہے کہ پانی مٹکے میں سے گزر رہا ہے حالانکہ وہ مٹکا نہیں خود ایک سمندر ہے۔ ان دونوں کو الگ سمجھنا نظر کا قصور ہے ورنہ حقیقتاً دونوں میں اتحاد ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ تم مٹکے کو نہ دیکھو بلکہ اس میں سموئے ہوئے لامحدود سمندر کو دیکھو۔ اس قول سے آپ کی مراد یہ ہے کہ انسان کامل کے اندر بھی فیوض الٰہی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جو اپنی وسعت کے اعتبار سے لامحدود ہے۔ جو شخص ان فیوضات خداوندی سے محروم ہے وہ قہر الٰہی اور عذاب خداوندی میں گرفتار ہے۔ ایسے واصلینِ حق کی بدولت ہی تو یہ ارض و سما اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ ان کا ذات حق کے ساتھ اس قدر اتصال ہو چکا ہے کہ دوئی کا تصور نہیں کیا جاتا۔

مولانا رومؒ "دل را بہ دل رہیست" (دل کو دل سے راہ ہوتی ہے) کے بڑی

شدت سے قائل ہیں۔ بصورتِ اتصال جسموں میں تو کچھ دوری یا بعد ہو سکتا ہے لیکن ارواح جب مل جائیں تو مکانی بُعد ممکن نہیں رہتا۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے دو چراغ ایک ہی کمرے میں الگ الگ جل رہے ہوں تو ان کی روشنیاں ممزوج و متصل (ملی ہوئی) اور ناقابل تقسیم ہوتی ہیں۔ اسی طرح جب شیخ کے ساتھ رابطہ قائم ہو جائے تو دونوں کی روحیں جذبِ باہمی کی حد تک مل جاتی ہیں اور فیض رسانی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ خدا کی محبت کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر تمہارے دل میں خدا کی محبت پیدا ہو جائے تو سمجھ لو کہ خدا کے دل میں بھی تمہاری محبت ضرور موجود ہے۔

اپنے آپ کو کسی اہل اللہ کی صحبت میں جذب اور ضم کر دینے سے کس طرح صفات میں تبدیلی آتی ہے، اس کی مثال مولانا رومؒ یوں پیش کرتے ہیں کہ ہلیلہ جس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے لیکن اسے قند کے مرتبان میں کچھ عرصہ رکھا جائے تو دیکھنے میں اگرچہ وہ اب بھی ہلیلہ ہی نظر آئے گا لیکن ذائقہ میں لذت اور شرینی آجاتی ہے۔ مثل مشہور ہے "مربی بیار و مربّہ بخور" (یعنی کوئی مربّے والا لے آؤ تو مربہ کھاؤ) لہٰذا اگر کسی کو روحانی فیض مل جائے تو وہ اپنی سیرت میں اخلاق کی شیرینی پیدا کر لیتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جب حضرت اویس قرنیؒ اپنی صفت سے فانی ہو گئے تو آسمانی (یعنی روحانی) بن گئے۔

فیض تو عام ہے مگر قبولِ فیض بقدرِ استطاعت ہے

اللہ کی رحمت ہر شے پر محیط ہے۔ اس لحاظ سے قرب خدا تو ہر ہستی اور ہر شے کو حاصل ہے لیکن اس قرب کے فوائد اور نتائج حسب استعداد ہوتے ہیں۔ انبیاء کو اس قرب سے وحی کی سعادت اور عشق کا انعام عطا ہوتا ہے، لیکن جس شخص کے دل میں استعداد قبولیت نہیں اس کو اس قرب سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سورج کا نور ہر جگہ پڑتا ہے لیکن اس سے کہیں کوئلہ، کہیں سونا، کہیں لعل وغیرہ بنتے ہیں اور دوسری جگہ درختوں کو نشوونما ملتی ہے۔ ہری شاخ سے سورج کا قرب پھل پیدا کرتا ہے، مگر سوکھی شاخ کو یہی قرب اور بھی سوکھا کر دیتا ہے۔

سالک کا آئینۂ دل ہی وہ آلہ ہے جس پر تصورِ شیخ کا انحصار ہوتا ہے۔ انسان کے آئینۂ دل میں بھی تمام کائنات منعکس ہوتی ہے۔ لیکن اس انعکاس کے لئے لازمی ہے کہ دل کا آئینہ صاف ہو۔ حرص و ہوس اور دنیا داری کا تردد اور حُبُّ الشّہوَاتِ اس آئینے کو زنگ آلود کر دیتے ہیں۔ عام انسانوں کے قلوب زنگ آلود ہونے کی وجہ سے حقیقت کو دیکھ نہیں سکتے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ "جاؤ تم پہلے دل کے رخ کو زنگار سے پاک کرو پھر اس میں نور الٰہی کا ادراک کرو"۔

رو تو زنگار از رخِ او پاک کن   بعد ازاں آں نور را ادراک کن

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ جب دل کا آئینہ پاک اور شفاف ہو جائے تو ایسا دل حقیقی مسجد اور خانہ خدا بن جاتا ہے اور اس جگہ خدا کے نور کے جلوے بھی ضوفگن ہونے لگ جاتے ہیں۔

جو لوگ ایسے لوگوں کے دلوں میں ہوتے ہیں وہ بھی فیضان الٰہی حاصل کرنے کی استطاعت حاصل کر لیتے ہیں۔

مسجدے کو اندرونِ اولیاست سجدہ گاہِ جملہ است، آں جا خداست
(وہ مسجد جو اولیاء کے باطن میں ہے وہ جملہ مخلوق کی سجدہ گاہ ہے اسی میں خدا بھی ہے)
تا دلے مردِ خدا نامد بہ درد ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد
(جب تک مرد خدا کے دل کو تکلیف نہ پہنچی۔ خدا نے کسی قوم کو رسوا نہیں کیا)

بالواسطہ یا بلاواسطہ اکتساب نور

مولانا فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ صفات الٰہیہ سے اسی طرح متصف ہو جاتے ہیں جس طرح لوہا آگ میں تپ کر آگ کی اکثر صفات کا حامل ہو جاتا ہے۔ گویا اگر کوئی چاہے تو براہ راست خدا سے بھی نور حاصل کر سکتا ہے اور اولیاء اللہ کے واسطے سے بھی۔ عموماً انبیائے کرام اور ان کے چند طفیلی اول قسم کے فیض سے مستفیض ہوتے ہیں۔ خورشید کی روشنی خورشید سے بھی حاصل ہوتی ہے اور بذریعہ چاند بھی ملتی ہے۔ ستاروں سے بھی مسافر راہ تلاش کر لیتے ہیں۔ اس لئے صحابہ کو نجوم سے تشبیہ دی گئی ہے۔ انسانوں کو جو فیض اولیاء سے حاصل ہوتا ہے، اسے فیضان الٰہی ہی تصور کیا جاتا ہے کیونکہ ان کا سرچشمہ بھی خود خدا ہے۔ ایک چراغ سے ہزاروں چراغ جل سکتے ہیں۔ تم پہلے چراغ سے نور حاصل کرو یا آخری سے، نور وہی ہے جس کی بدولت دیئے سے دیا جلتا ہے۔

نور خواہ از مہ طلب خواہی زخور نورِ مہ ہم زآفتاب است اے پسر
(روشنی خواہ چاند سے حاصل کرو یا خورشید سے، اے بیٹے چاند کی روشنی بھی آفتاب کے ہی باعث ہے)
چوں چراغِ نور شمع راکشید ہر کہ دید آں را یقیں آں شمع دید
(جب چراغ کا نور شمع کو کھینچتا ہے، تو جس نے بھی اس، (چراغ) کو دیکھا یقیناً اس نے شمع کو دیکھا)

دل میں درد و اضطراب ہو تو ربط دائمی ہوتا ہے

وہ دل جس میں درد اور اضطراب نہ ہو صوفیائے کرام ایسے دل کو "دل زندہ" تسلیم نہیں کرتے۔ دل کی ایک سرد آہ میں حشر سے پہلے ہی قیامت خیز ہنگامہ بپا کر دینے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ سورۂ النمل کی آیت ۶۲ میں دلِ مضطر سے نکلی ہوئی دعا کی فوری اجابت کا خصوصی ذکر آیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے پُردرد اور مضطرب دل کا اپنے کلام میں جابجا ذکر کیا ہے اور اسے کامیاب زندگی کی علامت تصوّر کیا ہے۔ اُن کے نزدیک جو دل اضطراب سے خالی ہو وہ زندہ نہیں بلکہ وہ اسے مردہ قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ۔

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا　　زندگی ہے موت کھو دیتی ہے جب ذوق خراش

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے　　مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں
دل نہیں شاعر کا، ہے کیفیتوں کی رستخیز　　کیا خبر تجھ کو درونِ سینہ کیا رکھتا ہوں میں؟
آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے　　مضطرب ہوں، دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں
زندگی الفت کی درد انجامیوں سے ہے مری　　عشق کو آزادِ دستورِ وفا رکھتا ہوں میں
گریۂ سرشار سے بنیادِ جاں پائندہ ہے　　درد کے عرفان سے عقلِ سنگدل شرمندہ ہے

سوز و درد و آرزو اور اضطراب علامہ اقبالؒ کے کلام کا ایک خاص پہلو ہے لیکن اس جگہ آپ کے ایسے کلام کے نمونے پیش کرنا بہت طوالت کا باعث ہو گا۔ راقم الحروف کی کتاب "حضور قلب" میں اس موضوع پر علامہ کا خاصہ کلام شامل کر دیا گیا ہے۔ علامہ کے فارسی کلام میں بھی ہمیں اس موضوع پر بہت کلام ملتا ہے، مگر یہاں چند اشعار پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔ ؎

دلِ من روشن از سوزِ دروں است　　جہاں بیں چشمِ من از اشکِ خون است
(میرا دل میرے اندر کے سوز سے روشن ہے۔ میری آنکھ انہی خون کے آنسوؤں کے باعث جہاں بین ہے)

داغے بہ سینہ سوز کہ اندر شبِ وجود　　خود را شناختن نتواں جز بہ ایں چراغ
(اپنے سینے میں داغِ محبت روشن رکھ کیونکہ شبِ ہستی میں اس چراغ کے بغیر اپنی پہچان ممکن نہیں)

فقر سوز و درد و داغ و آرزو ست　　فقر را درخوں تپیدن آبروست
(فقر، سوز و درد و داغ اور آرزو کا مرکب ہے۔　　اپنے خون میں تڑپنا فقر کی آبرو ہے)

جب ہم اولیائے کرام کی زندگیوں پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں یہی سوز و اضطراب ان کے ہاں بھی نمایاں حیثیت میں نظر آتا ہے۔ جس شخص کے دل میں قوم کا درد اور غم اثر انداز نہ ہو وہ دل اس قابل نہیں کہ وہ رفاہی اور اصلاحی پہلوؤں کا مداوا کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اولیائے کرام ریاضتوں اور مشقتوں کو برداشت کرتے ہیں اور خود کو کمالِ صفا کے مقام تک پہنچاتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا ہے کہ جب سالک کی روح قوی ہو جاتی ہے اور کمالِ صفا کو پہنچ جاتی ہے تو وہ قلب کو جذب کر لیتی ہے (یعنی قلب بھی قوت حاصل کر لیتا ہے) اور جب قلب قوی ہو جائے تو قالب (جسم) کو بھی جذب کر لیتا ہے۔ ان دونوں (قلب اور قالب) کے اتحاد کے ذریعے جو کچھ قلب پر گزرتی ہے یا وارد ہوتی ہے اس کا اثر قالب (یعنی جسم) پر بھی ظاہر ہوتا ہے اور وہ قوم کے بار کو اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے جب سالک کی روحانیت بلند مقام تک پہنچ جائے۔ ویسے بھی صوفیا کا قول ہے کہ بیماری پہلے روح کو لگتی ہے اور اس کے بعد جسم میں منتقل ہوتی ہے۔

حضرت نظام الدین" فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت سکندر کیتھلی" میرے پاس آئے تو میرے ایک نو عمر خادم نے ان کی شان میں بے ادبی کر دی تو میں نے اسے ایک چھڑی مار دی۔ اس پر مولانا کیتھلی" نے ایسی درد بھری چیخ ماری جیسے چوٹ انہیں لگی ہو۔ وہ میری اس حرکت پر رونے لگے اور کہا کہ یہ میری شامت تھی جو اسے یہ تکلیف پہنچی۔ حضرت نظام الدین" نے فرمایا کہ ان کی رقت اور شفقت سے میرا دل بھی ہل گیا۔ دوسروں کے دکھ کا اثر دل پر اسی وقت ہوتا ہے جب قلب اور قالب میں جذب یا اتحاد قائم ہو جائے۔ دوسرے کی تکلیف کا اثر اسی وقت ہو سکتا ہے جب دل میں درد اور اضطراب پیدا ہو جائے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر" جب کسی کو دعا دیتے تو فرماتے۔

"خدائے عز و جل ترا درد دے دہاد" (خدائے عز و جل تمہیں درد دل عطا فرمائے)

یہ درد دل ہمیشہ اولیائے کرام کا مطمع نظر اور دلی خواہش رہی ہے۔ شیخ عطار" نے اپنے کلام میں ارشاد فرمایا ہے کہ

کفر کافر را و دیں دیندار را ذرہٗ دردے ، دلِ عطّار را

(کفر کافر کو اور دیندار کو دین (مبارک) ہو۔ عطار کے دل کو تو ایک ذرہ بھر درد درکار ہے)

درد دل فقراء کی گرانمایہ دولت ہے

صوفیائے کرام کا فرمان ہے کہ اہل تصوف کے لئے درد دل ایک گراں مایہ دولت ہے اور وہ ہمیشہ غم عشق سے سرشار رہتے ہیں۔ دنیا کی مصیبتوں کو بخوشی جھیلتے ہیں کیونکہ انسان کے دل کی منزلیں درد اور اضطراب کے بغیر طے نہیں ہوتیں۔ حضرت غلام علی دھلوی فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت پر تو صرف چند دن کا رونا دھونا ہوتا ہے اور اس کے بعد انسان عام حالت پر آجاتا ہے کیونکہ وقت دل کے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ مگر دنیا کے مصائب کے برعکس تصوف میں تو عمر بھر کا رونا ہے۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ جب تک دنیا کے اور اہل دنیا کے غموں کو برداشت نہ کرے تو اس وقت تک درویشی کا حاصل ہونا ممکن نہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے متعلق لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ آپ کو مکمل فراغت اور دنیاوی سہولتیں حاصل ہیں اور آپ کے پیچھے دنیا کا کوئی جنجال نہیں بلکہ آپ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جب کسی نے آپ کو اس گفتگو سے آگاہ کیا تو آپ آبدیدہ ہو گئے اور فرمانے لگے "جس قدر غم و اندوہ مجھے لاحق ہوتا ہے، اس جہاں میں کسی کو بھی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ مخلوق خدا جب میرے پاس آکر اپنا غم و اندوہ بیان کرتی ہے تو سب کا غم میرے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ وہ مسلمان کس قدر عجیب ہے کہ جو اپنے مسلمان بھائیوں کا درد سنے اور اس پر اس کا کوئی اثر نہ ہو"

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر" کے ایک مرید شاہ محمد غوری آپ کی خانقاہ میں بہت عقیدت سے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دن وہ بہت پریشان اور حواس باختہ نظر آئے۔ حضرت نے اس

کی وجہ دریافت فرمائی توانہوں نے عرض کیا کہ میرا ایک بھائی اس وقت سکرات موت کے عالم میں ہے اور شاید میری واپسی تک وہ جاں بحق ہو جائے یا اب تک جاں بحق ہو گیا ہو۔ عرض کی میں اس وجہ سے سخت بے چینی کے عالم میں ہوں کہ وہ گھر کو سنبھالتا تھا اور میں فراغت دل کے ساتھ خانقاہ میں ذکر اور شغل کیا کرتا تھا۔ اب شاید یہ سب کچھ ممکن نہ ہو۔ حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا "محمد شاہ جو کیفیت اس وقت تمہاری ہے، میں ساری عمر اس کیفیت میں رہا ہوں، البتہ کسی پر ظاہر نہیں کرتا" فرمایا "جاؤ تمہارا بھائی اچھا ہو جائے گا" جب وہ گھر آئے تو دیکھا کہ اس کا بھائی کھانا کھا رہا تھا۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں

در غمِ دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز — گفتمت روشن حدیثے. گر توانی دار گوش

(دوسروں کے غم میں خود جلو اور دوسروں کو بھی جلاؤ۔ میں تم سے یہ روشن بات کہہ رہا ہوں، اگر ہو سکے تو اس پر کان دھرو)

درج بالا عبارت سے معلوم ہو گا کہ جو عقلِ سلیم کا مالک ہو وہ شخص بھی دوسروں کی ابتلا سے آزردہ ہوتا ہے مگر صوفیائے کرام کے پاس عقلِ سلیم کے علاوہ علم اور عشق کے آئینے کی طرح شفاف دل بھی موجود ہوتے ہیں، جس کے باعث انہیں اہلِ عقل پر فوقیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ ان کے شفاف قلب نے ان کے قالب کو بھی اپنا تابع بنا لیا ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام کے ہاں لطائفِ ستّہ اس قدر ضیا پاشی کرتے ہیں کہ یہ لطائف ان کو بیشتر اوقات کائنات کی عمیق گہرائیوں کی خبر دیتے ہیں۔ ان روحانی شخصیتوں کی روح فضا کی طرح بسیط اور پر انوار ہو جاتی ہے جس سے ان کے شعور و آگہی، ادراک و احساس، عشق و دردمندی اور دلسوزی کی کیفیات کے نہایت اعلیٰ رتبے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک صوفی کی یہی صفات اس کے اپنے شیخ اور اللہ تعالیٰ سے ربط قائم کرنے میں مددگار اور معاون بن جاتی ہیں۔ طریق رابطہ میں ایک صوفی کے لئے درجِ ذیل اشعار میں بیان کردہ چند صفات کا ہونا ضروری ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

چہ باید مرد را طبعے بلندے مشربِ نابے — دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے. جانِ بیتابے

(ایک مردِ مومن کی ضروریات کیا ہیں؟ طبعِ بلند، عمدہ مشرب. دلِ گرم، نگاہِ پاک بین اور ایک بیتاب روح)

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا — مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

وہ سجدہ، روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی — اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

حدیثِ جبریلؑ سے بھی ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ تم نماز کو اس طرح ادا کرو کہ جس میں نمازی کو درجہ احسان حاصل ہو جائے۔ یعنی اطاعات اور عبادات میں نہ تو خوفِ سزا ہو اور نہ ہی جزا کی طمع ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اگر

یہ نہ کر سکو تو یہ سمجھو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ احسان (جس کا درجہ حدیث جبریلؑ میں بیان ہوا) ایک ایسی نیکی ہے جو کسی لالچ، غرض یا کسی ذاتی معاوضے کے لئے نہ ہو۔ اس طرح ادا ہونے والی نماز استقامت کے زمرے میں داخل ہوتی ہے اور استقامت کے لئے فرمایا گیا ہے۔ اَلْکَرَامَۃُ هِیَ الْاِسْتِقَامَۃُ عَلٰی بَابِ الْغَیْبِ یعنی غیب کے دروازے پر استقامت کا ہونا ہی کرامت ہے، اور یہ "باب غیب" ہی "احسان" ہے۔ (یہاں باب غیب سے مراد یہ ہے کہ ان دیکھے استقامت پر ڈٹے رہنا)۔

صحبتِ مرشد میں دلجمعی اس لئے ہے کہ پیر کے ذریعے مرید کا رابطہ ملکوت سے ہو جاتا ہے

مولانا رومؒ ایک نہایت پُر بصیرت نکتہ پیش کرتے ہیں کہ جب تم آنکھ بند کر لیتے ہو تو تمہارے دل کو بے قراری محسوس ہوتی ہے، کیونکہ آنکھ کی بصارت کو روشنی سے تازگی ملتی ہے اس لئے تم آنکھ کھولنا چاہتے ہو۔ اس کے کھولنے کا سبب یہ ہے کہ نورِ بصارت اور نورِ آفتاب میں انس اور موافقت رکھی گئی ہے، اس لئے قوتِ باصرہ (دیکھنے کے نور) کا آفتاب کے نور کی طرف میلان ہونا آنکھ کو کھول دینے پر مجبور کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً روشنی کی موجودگی میں نیند نہیں آتی، مگر جب اندھیرا ہو تو فوراً نیند آجاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اندھیرے میں نیند آنے کی وجہ یہ ہے کہ روح چونکہ نورانی چیز ہے لہٰذا نور کی طرف اس کا میلان ایک فطری امر ہے۔ جب بیرونی فضا منور ہو تو روح اس کی طرف متوجہ رہنا چاہتی ہے اور یہ توجہ اس میں انبساط اور خوشی پیدا کرتی ہے، جو نیند کی مانع ہے۔ جب باہر اندھیرا ہوتا ہے تو اندھیرے سے گھبرا کر روح سورج کی روشنی کی بجائے انسان کے باطن کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے جو اس کے لئے سکون اور استراحت کا موجب بنتی ہے۔ یہی نیند ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر روشنی میں آنکھیں کھلی ہونے کی حالت میں بھی تم کو گھبراہٹ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے دل کی آنکھ کو بند کر لیا ہے لہٰذا دل کی آنکھ کو کھول دو۔ اس نوعیت کی گھبراہٹ دل کی آنکھیں بند ہونے کے تقاضے سے ہے کیونکہ یہ دل کی آنکھیں لاانتہا روشنی چاہتی ہیں۔ اس کا بھی تدارک کرنا چاہئے اور وہ تدارک یہ ہے کہ چشمِ ظاہر کے کھولنے کی طرح چشمِ باطن کو بھی کھول دو۔

مولانا فرماتے ہیں کہ وہ لاانتہا روشنی جس کو دل کی آنکھیں دیکھنا چاہتی ہیں وہ انوار الٰہی کی کشش ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمارا مطلوب (اللہ) ہم کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ جب یہ حقیقت معلوم ہو جاتی ہے تو انسان یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ میں خوبصورت اور لائقِ قرب و وصل ہوں یا بدصورت اور لائقِ نفرت۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ اپنی حالت کو اور روح کی کیفیت کو دیکھنے کے لئے ایک

آئینہ درکار ہے اور اس سے مراد وہ آئینہ نہیں جسے آئینہ آہن یا زنگار کا آئینہ کہا جاتا ہے بلکہ وہ آئینہ یار کا چہرہ ہے۔ اُس یار کا چہرہ جو عالم ملکوت سے تعلق رکھتا ہے یعنی مرشدِ کامل۔ مرشد کے چہرے سے اپنی روحانی حالت اس لئے معلوم ہو جاتی ہے کہ اس کی صحبت میں دل کو ایک تنبّہ ہو جاتا ہے اور اللہ یاد آجاتا ہے جیسے کہ حدیث شریف میں ہے اِذَارُؤُوْا ذُکِرَ اللہُ (جب انہیں دیکھو تو خدا یاد آجائے)۔ مرشد کی صحبت میں ایک ایسی دل جمعی حاصل ہو جاتی ہے کہ مرید تمام علائقِ دنیا سے بے نیاز ہو کر اپنے نفس کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کی اصلاح کا موقع حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ کسی ناقص سے یہ کام نہیں چلے گا کیونکہ کہا جاتا ہے "خفتہ را خفتہ کے کند بیدار" (سوئے ہوئے کو کوئی سویا ہوا کیسے بیدار کر سکتا ہے) مرشد جیسی روشن چشم میں یہی حقائق اشیاء نظر آتے ہیں، کیونکہ حقیقت آشنا ہستی (مرشد) ذات خداوندی سے منسلک ہوتی ہے۔ جب تک تمہارا تعلق اس دنیائے ناسوت سے بال برابر بھی ہو گا تو اس وقت تک تمہاری بصیرت مبتلائے خطا ہو گی اور جب مرشد کی طرف متوجہ ہو جاؤ گے تو اس وقت عالم ملکوت سے رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مرشد کی صحبت دلجمعی کا باعث بنتی ہے۔

ربطِ شیخ سے حق تعالیٰ کی طرف راستہ کھل جاتا ہے

حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ رسالہ مکیہ (امداد السلوک۔ ترجمہ ص ۶۴) میں فرماتے ہیں کہ مرید کو یقین کے ساتھ یہ جاننا چاہئے کہ شیخ کی روح کسی خاص جگہ محدود نہیں ہے۔ پس مرید جہاں بھی ہو گا، خواہ قریب ہو یا بعید، گو شیخ کے جسم سے دور ہے لیکن اس کی روحانیت سے دور نہیں۔ مولانا محمد عاشق میرٹھی نے اس جگہ حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس سے ندائے غیب کے جواز کا شبہ نہ کیا جائے، اور ساتھ ہی یہ لکھتے ہیں "جب بدن دور ہے تو روحانیت کے قرب سے ندا جائز نہ ہو گی"۔ لیکن یہ بات درج بالا قول "شیخ کی روح کسی خاص جگہ محدود نہیں ہے" کے الفاظ سے اختلاف کرتی ہے۔ جب روح محدود نہیں تو کوئی جگہ یا مکان لامکانی روح سے دور نہیں لہٰذا ندا کیوں جائز نہ ہو گی۔ ویسے بھی ایک حدیث اَعِینُوْنِیْ یَا عِبَادَ اللہِ (اے اللہ کے بندو میری مدد کرو) سے ایسی ندا کے جواز کا حوالہ ملتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ساریہؓ کو ندائے غیب سے مطلع فرمایا اگر ندائے غیب سے پکارنا جائز نہ ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی ندائے غیب سے نہ پکارتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب شہود حاصل ہو جائے تو غیب غیب نہیں رہتا بلکہ سامنے حاضر چیز کی طرح ہو جاتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب دل کو لامکانیت کا درجہ مل جائے۔

حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ اسی کتاب میں فرماتے ہیں "جب مرید ہر وقت شیخ کو یاد رکھے گا تو ربط قلب پیدا ہو جائے گا اور شیخ سے ہر دم استفادہ ہوتا رہے گا اور مرید کو جب کسی واقعہ کے کھولنے میں شیخ کی حاجت پیش آئے گی تو شیخ کو اپنے قلب میں حاضر مان کر بزبان حال سوال کرے گا اور

ضرور شیخ کی روح باذن خداوندی اس کو القاء کر دے گی۔ البتہ ربط تام شرط ہے" ان الفاظ کے حاشیہ میں بھی لکھا ہے "یہ لازم نہیں کہ شیخ کی روح ایک وقت میں متعدد مقامات پر حاضر ہو بلکہ شیخ کی روح کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی" حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شیخ کو کبھی خبر ہوتی ہے اور کبھی خبر نہیں بھی ہوتی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لکھا ہے کہ بزرگوں کی روحیں، جہاں سے بھی مدد طلب کی جائے موقع پر پہنچ کر مدد کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں روحوں کے مدد کرنے کا بیان اس کتاب کے ایک الگ باب میں ہی "اولیاء اللہ کی امداد" کے عنوان سے لکھ دیا گیا ہے۔ مشائخ کبار نے لکھا ہے کہ اولیائے کرام کی ارواح بیک وقت کئی جگہوں پر پہنچ سکتی ہیں جیسا کہ عزرائیل علیہ السلام بیک وقت کئی لوگوں کی روح قبض کرتے ہیں اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ خاص انسانوں کا مقام خاص فرشتوں سے بڑا ہے۔

حضرت امداداللہؒ اس سے آگے بیان فرماتے ہیں کہ شیخ کے قلب سے ربط کے ہی سبب مرید کے قلب میں قوتِ گویائی پیدا ہوگی اور حق تعالیٰ کی طرف سے راستہ کھل جائے گا اور حق تعالیٰ اس کو ملہم (الہام وصول کرنے والا) بنا دے گا جس کو شریعت میں محدث کہتے ہیں (گویا کوئی کہنے والا کہہ گیا اور اس نے کانوں سے سن کر سمجھ لیا، یہی الہام ہے)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گزشتہ امتوں میں محدث ہوئے ہیں مگر اس امت میں کوئی محدث ہے تو عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قلب کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب منور کے ساتھ کمالِ رابطہ پیدا ہو جانے کی وجہ سے حق تعالیٰ کی طرف سے الہام اور امرِ حق کا القا ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی رائے کے موافق بارہا وحی نازل ہوئی اور ایسے واقعات جن میں ان کی رائے نے موافقت کی ہے اٹھارہ سے زیادہ مروی ہیں۔

رابطہ میں شیخ کے ساتھ صحبتِ معنوی ہوتی ہے

مولوی معنویؒ نے صورت و معنی کے باہمی تعلق کی نسبت کئی قسم کی تشبیہیں اور مثالیں استعمال کی ہیں۔ کہیں پوست اور مغز، کہیں ہڈی اور گودا اور کہیں روح اور جسم سے تشبیہ دی ہے۔ ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ صورت بمثل نیام کے ہوتی ہے اور مغز بمثل تلوار کے ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نیام میں لکڑی کی تلوار ہو تو وہ سوائے جلانے کے اور کہیں کام نہیں آسکتی۔ تلوار کا اندازہ اس وقت ہی ہو سکتا ہے کہ جب تلوار کو اس کے نیام سے باہر نکالا جائے۔ اگر وہ بے حیثیت ایندھن کی طرح ہے تو بیکار ہے۔ فرماتے ہیں انسان کے اصل معنی اس کی روح کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں۔ جب تک روح جسم کے اندر ہے تو اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ جب انسان قبر میں دفن ہو گا تو روح کی قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے۔ اگر اندر سے لکڑی کی تلوار ہی نکلی تو جہنم کا ایندھن ہی بنے گی۔

جانِ بے معنی دریں تن بے خلاف   ہست ہمچوں تیغ چوبیں در غلاف

(اس بدن میں بے معنی جان، بغیر کسی اختلاف کے (یقیناً) نیام میں لکڑی کی تلوار کی طرح ہے)

مولانا روم ؒ فرماتے ہیں کہ میدان جنگ میں لکڑی کی تلوار نہ لے کر جاؤ۔ پہلے دیکھ لو کہیں جنگ میں کام خراب نہ ہو جائے اگر تمہاری تلوار لکڑی کی ہے تو دوسری طلب کرو اور اگر صحیح تلوار ہے تو پھر میدان میں شیر کی طرح آجاؤ۔ اصلی تلوار (معنوی) اولیائے کے اسلحہ خانے سے ملتی ہے۔ ان اولیاء اللہ کا دیدار کر لینا بھی کیمیا کی حقیقت رکھتا ہے۔ اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ اگر انار خریدنا ہو تو کھلا ہوا خریدو تاکہ معلوم ہو کہ اس کے اندر دانے ٹھیک ہیں۔ مسکراتا ہوا انار باغ کو مسکراتا بنا دیتا ہے اور پاک مردوں کی صحبت تمہیں ان کی طرح پاک بنا دے گی۔ ان کی تھوڑی ہم نشینی سو سالہ عبادت سے بہتر ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اگر تم سنگ خارہ اور سنگ مرمر بھی ہو تو جب کسی صاحب دل کے پاس پہنچو گے تو موتی بن جاؤ گے۔ پاک لوگوں کی محبت دل میں بٹھا لو اور خوش دل لوگوں کے علاوہ دل کسی کو نہ دو۔ دل تجھے اہل دل کے کوچے کی طرف کھینچتا ہے اور جسم تمہیں پانی اور مٹی کے قید خانے کی طرف کھینچتا ہے۔ کسی دل والے سے دل کی خوراک حاصل کر اور کسی نصیبے والے سے نصیب تلاش کر۔ یہ سب کچھ اولیائے کرام کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے اور رابطۂ شیخ ایک ایسی چیز ہے کہ سالک ہمہ وقت اپنے شیخ کے سائے میں رہ سکتا ہے اور یہ اس وقت بھی صحبت شیخ کا کام دیتا ہے جب شیخ کے ساتھ ظاہری صحبت ممکن نہ ہو۔

ایک اور جگہ مولانا فرماتے ہیں کہ جو عالم تمام کائنات میں پھیلا ہوا ہے اسے عالم اکبر کہتے ہیں (یعنی آفاق) اور جو عالِم انسان کے دل میں ہے اسے عالِم صغیر کہتے ہیں۔ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو اس کے برعکس انسان بمعنی حقیقت عالِم کبیر کے ہے اور آفاق کا عالم بمعنی صورتِ عالم صغیر ہے۔ ؎

پس بصورت عالِم اصغر توئی پس بمعنی عالِم اکبر توئی

(پس صورت کے اعتبار سے تو عالم اصغر ہے اور معنی کے اعتبار سے عالم اکبر یعنی تو عالم کبیر ہے)

مثنوی کے دفتر اول میں مولانا روم ؒ فرماتے ہیں کہ تو معنی کی تلاش کر اور اہل باطن کے ساتھ ربط قائم کر تاکہ تو انعام بھی پائے اور مرد بھی بنے۔ چوتھے دفتر میں مولانا فرماتے ہیں کہ معنی کے اعتبار سے درخت پھل سے پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح ہماری یہ (کائنات) انسان سے پیدا ہوئی ہے اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ ۔ یعنی ہم آخر میں ہیں اور پہلے ہیں۔ حضور کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ صورت میں تو میں آدم زادہ ہوں لیکن حقیقتاً میں جدِّ آدم ہوں۔ جب انسان عالِم کبیر کی حقیقت رکھتا ہے تو اس کے لئے اپنی اصل کی طرف رجوع یا ربط قائم کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔

اگر صحبتِ معنوی حاصل ہو جائے تو فاصلے اور دوری کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ مرید دور رہ کر بھی اپنے شیخ سے اسی طرح استفادہ کرتا ہے جیسے وہ اس کے قریب سے مستفید ہوتا ہے۔

رابطے کا فیض، فیضانِ اویسی کی طرح ہوتا ہے

حضرت اویس قرنیؒ ایسے بزرگ تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تو تھے مگر غلبہ حال اور والدہ کی نگہداشت کے باعث آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف زیارت حاصل نہ کر سکے مگر اس کے علاوہ فیضان رسالت آپ کے دل و دماغ میں ایسے ہی جاری تھا جیسا کہ صحابہ کرام کے لئے متصور تھا۔ تصوف کی دنیا میں، حضرت اویس قرنیؒ کے زمانے سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ اگر کسی شخص کو کسی بزرگ کا زمانہ نصیب نہ ہوا ہو تو وہ غیابت زمانی کی حالت میں بھی اس بزرگ سے فیض لے سکتا ہے، خواہ یہ دوری غیابت زمانی کی نوعیت سے ہو یا غیابت مکانی ہو۔ چنانچہ ہر شخص ہر بزرگ سے خواہ وہ کسی زمانے میں یا کسی جگہ بھی ہو، فیض کی جولا نگاہ سے عین اسی طرح فیض حاصل کر سکتا ہے جیسے کہ وہ اس بزرگ کے زمان و مکاں میں آکر مستفیض ہو رہا ہو۔ ایسے فیض لینے والے کو اویسی کہتے ہیں۔

کون کس کا اویسی تھا، ایسی فہرست مرتب کرنا بہت مشکل امر ہے البتہ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اویس قرنیؒ کے بعد بہت سے بزرگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بالمشافہ فیض حاصل کیا۔ ایسے لوگوں میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا نام قابل ذکر ہے۔ ایسے ہی حضرت بایزید بسطامیؒ نے امام جعفر صادقؒ سے، حضرت ابوالحسن خرقانیؒ نے حضرت بایزید بسطامیؒ سے اور حضرت بہاؤالدین نقشبندؒ نے شیخ عبدالخالق غجدوانیؒ سے فیض اخذ کیا۔ یہ سب اویسی بزرگوں کی مثالیں ہیں۔
(حوالہ مشاہدہ حق، حضرات القدس، اولیائے نقشبند وغیرہ)۔

ہر لطافت کہ نہاں بود پسِ پردۂ غیب   ہمہ در صورتِ خوبِ تو عیاں ساختہ اند
(ہر وہ لطافت کہ جو پردۂ غیب میں نہاں ہوئی۔ سب اسے تیری خوبصورت شکل میں ظاہری طور پر پالیتے ہیں)

ہر کہ بر صفحۂ اندیشہ کنند کلکِ خیال   شکلِ مطبوعِ تو زیبا تر ازاں ساختہ اند
(جو شخص خیال کا قلم ورقِ تصور میں چلاتا ہے۔ وہ تیری مرغوب صورت کو اور بھی زیادہ دلکش بنالیتا ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اویسی بننا ہو تو

شاہ غلام علی دھلویؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اویسی بننا چاہئے تو عشاء کے بعد خیال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کہے
یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ بَایَعْتُکَ عَلٰی خَمْسٍ، شَھَادَۃِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ

الزَّكٰوۃِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ وَحَجِّ الْبَیْتِ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَیْهِ سَبِیْلاً)

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی بزرگ کا اویسی ہونا چاہے تو خلوت میں بیٹھ کر دو رکعت نفل اس کی روح کے لئے پڑھے اور اس بزرگ کی روح کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جائے۔ ایسا کرنے سے کچھ دنوں کے بعد، حسبِ قدرت، اس بزرگ کا فیض آنا شروع ہو جائے گا۔

ہمارے خواجہ علاؤالدین صدیقی غزنوی مدظلہ، کا فرمان ہے کہ جب کسی مزار پر کشف القبور یا حصول فیض کے لئے جاؤ تو پہلے دو نفل پڑھ کر صاحب قبر کی روح کو ایصال کر کے اس کی قبر پر بالمقابل اس کے چہرہ کے بیٹھ کر مراقب ہو جائے تو اس کا فیض حاصل ہو سکتا ہے۔ راقم الحروف کا تجربہ ہے کہ کچھ نوافل ادا کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کی طرف منہ کر کے ایسے بیٹھ جائے جیسے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دل کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو اور اگر کوئی شخص دل کی دنیا میں ایسا ربط قائم کرلے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی مراد کے پورا ہونے کی استدعا یا التجا بھی کر سکتا ہے۔ اگر تصور پختہ ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرما دیتے ہیں اور یقیناً وہ دعا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اجابت کا اثر حاصل کر کے رہتی ہے۔ اولیائے عظام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی دعا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے کبھی رد نہیں ہوئی۔

ربط و ضبط ایک نعمت ہے

ربط خواہ ایک سالک کا کسی شیخ کے ساتھ ہو، خواہ دو نیک آدمیوں کا آپس میں ہو یا قوم کے افراد میں ربط کی بات ہو، بہرحال ربط اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت شمار کیا جاتا ہے۔ جہاں ربط قائم ہونا شروع ہو جائے وہاں یہ نعمت خدائی انعامات اور اجر برسانا شروع کر دیتی ہے۔ یہاں مناسب ہو گا کہ ربط فرد و ملت پر بھی کچھ حاشیہ آرائی کی جائے اگرچہ ربطِ شیخ کے موضوع پر بھی بہت کچھ لکھ دیا گیا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اسرار و رموز خودی میں "ربط فرد و ملت" پر کافی نصیحت آمیز کلام کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ فرد کے لئے جماعت سے ربط رکھنا باعث رحمت ہے کیونکہ افراد ملت کے اندر رہ کر ہی کمال کا جوہر حاصل کر سکتے ہیں۔ کوئی فرد بالکل اس طرح ہوتا ہے جیسے دریا یا سمندر میں کوئی موج۔ اگر یہ موج دریا میں ہو تو موج کہلاتی ہے ورنہ بیرون دریا وہ کچھ بھی نہیں ہوتی۔ جماعت کی شکل میں مسلمان ہنگامۂ احرار کی رونق بن جاتا ہے۔ ملت اسے آئین کا پابند بناتی ہے اور آئین کی پابندی کرنے والوں میں اچھی عادات کی خوشبو پیدا کر دیتی ہے۔ انسان کی زندگی اور کردار کا دارومدار خودی پر ہے۔ اس کے بعد علامہ اس نظم میں خودی کی وضاحت کرتے ہیں اور آپ اس حدیث کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شیطان جماعت سے دور رہتا ہے۔

فرد اور جماعت ایک دوسرے کے لئے آئینے کی طرح ہیں۔ افراد سے قوم بنتی ہے اور قوم کی روایات افراد کے چہروں سے جھلکتی ہیں۔ فرد کی توقیر ملت سے ہے اور ملت کا نظام افراد پر مبنی ہے۔ جب کوئی فرد کسی جماعت میں گم ہوتا ہے تو گویا وہ وسعت کے متلاشی قطرے کی طرح دریا بن جاتا ہے۔ فرد اپنی ملت کی روایات کا حامل ہوتا ہے اور اس کے اندر اس قوم کے ماضی اور مستقبل کا عکس نظر آتا ہے۔ ملت کے باعث افراد میں قوتوں کے اظہار کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ قوم فرد کا پیکر ہے اس کی جان اور ظاہر و باطن بھی قوم ہی ہے اور ملت سے مل کر زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔ فرد کی وحدت ملت کی کثرت سے استقامت پاتی ہے۔ جیسے کسی شعر سے ایک لفظ نکال دیا جائے تو شعر بے معنی ہو جاتا ہے ایسے ہی ملت ایک فرد کی خرابی سے بدنام ہو جاتی ہے۔ جو پتہ درخت سے گر گیا تو بہار میں بھی اس کے سرسبز ہونے کی امید ختم ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔ ؎

وصل استقبال و ماضی ذاتِ او چوں ابد لا انتہا اوقاتِ او

(فرد اپنی ملت کے ماضی اور مستقبل کا نقطۂ اتصال ہے۔ فرد کے اوقات ابد کی طرح لاانتہا ہو جاتے ہیں)

وحدتِ او مستقیم از کثرت است کثرت اندر وحدتِ او وحدت است

(فرد کی وحدت ملت کی کثرت سے استقامت پاتی ہے اور افراد کی کثرت ملت کے ذریعے وحدت بن جاتی ہے)

جس طرح علامہ اقبالؒ نے ربط فرد و ملت کی خوبیوں کو اپنے اشعار میں سمویا ہے اور فرد و ملت کے ربط کو کسی قوم کے عروج کا پیش خیمہ قرار دیا ہے، اسی طرح صوفیاء کے نزدیک ہر شخص جو روحانی عروج کا متمنی ہے، اولیائے کرام کی جماعت کے ساتھ مل کر ان سب کے فیوضات سے، جو فیض واحد کی صورت (میں پائی جاتی ہے) مستفید ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سالک صرف ایک شیخ سے شرفِ بیعت اخذ کرتا ہے لیکن اس بیعت کے ذریعے ملت اولیاء اور علیٰ ہٰذا القیاس انبیائے کرام سے بھی منسلک ہو جاتا ہے، کیونکہ تمام اولیائے کرام ملت کی مانند ایک زنجیر کی طرح مربوط ہوتے ہیں اور زنجیر کی ایک کڑی ہر دوسری کڑی سے ملی ہوئی رہتی ہے اور تقویت پکڑتی ہے۔

ربط تام یہ ہے کہ خدا کو اس انداز سے یاد کرے کہ پھر یاد کرنے کی نوبت نہ آئے

حضرت ابوالحسن خرقانیؒ فرماتے ہیں کہ خدا کو اس انداز سے یاد کرو کہ پھر دوبارہ یاد نہ کرنا پڑے یعنی اس کو کسی وقت فراموش نہ کرو۔ ربطِ تام سے یہی معنی مراد ہیں کہ بندہ ہمہ تن اللہ کی یاد کے ساتھ منسلک رہے۔ جس کے قلب میں یاد الٰہی باقی ہو اسے دنیا کی کوئی شے ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ طالبین خدا کو بے حد تکالیف اور اذیتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، پھر کہیں قرب الٰہی میسر ہوتا ہے۔

توفیق الٰہی کے بغیر اگر کوئی عمر بھر بھی خدا کی جستجو کرتا رہے تب بھی اس کو نہیں پا سکتا۔

مشاہدہ مخلوق سے کٹ جانے کے بعد ہوتا ہے

حضرت ابوالحسن خرقانی ؒ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی بندے کو مخلوق سے جدا کر کے فکر مخلوق سے بے نیاز کر دیتا ہے اور ان میں سے بعض بندوں کو تو اس مقام پر پہنچا دیتا ہے کہ وہ بیٹھے بیٹھے تمام مقامات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو ایسا مقام عطا فرما دیتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے لوح محفوظ کا بھی مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش ؒ فرماتے ہیں کہ اہل تصوف میں یہ بات مشہور ہے کہ اوتاد ہر شب میں تمام جہان کی سیر کرتے ہیں اور اس سیر میں جو جگہ ان کی سیر سے رہ جاتی ہے وہاں لازمی طور پر خلل واقع ہوتا ہے. تو اولیاء اللہ اسی وقت قطب مدار کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ اپنی ہمت اور توجہ اس کی طرف مبذول کرے تاکہ وہ خلل اور نقصان ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ زائل فرما دے۔ تربیت عشاق میں ہے کہ کچھ اولیائے کرام اس قدر اہل نظر ہوتے ہیں کہ وہ پوری کائنات کو ایسے دیکھ سکتے ہیں جیسے کوئی ہتھیلی پر تل دیکھ لیتا ہے اور جسے چاہیں اسے دکھا بھی دیتے ہیں۔

رابطہ اور مراقبہ میں موافقت

جب کوئی سالک کسی بات کی صحت حال کے متعلق علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ مراقبہ میں جا کر ایسا کر سکتا ہے۔ توجہ الی الشیخ میں بھی مراقبہ کی طرح شیخ کو دیکھنا اور اس سے رابطہ قائم کرنا ہوتا ہے۔ جو شخص مراقبہ نہیں کر سکتا اس کی توجہ الی الشیخ بھی ناقص ہوگی۔ حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے الہام اور مراقبہ کے متعلق جو کلام فرمایا ہے اس کا کچھ ذکر راقم الحروف کی کتاب "حُسنِ نماز" کے باب "فلسفۂ نماز" میں شامل کر دیا گیا ہے۔ آپ نے جہاں کبھی کشف یا الہام کا ذکر فرمایا ہے وہاں اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ مجھے فلاں بات صحیح کشف کے بعد معلوم ہوئی ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب تک صحیح کشف نہ ہو اس وقت تک کوئی بات زبان سے نہ نکالے۔

حضرت بدرالدین ؒ خلیفۂ کبیر، حضرت امام ربانی ؒ، حضرات القدس میں لکھتے ہیں کہ مرزا مظفر جو سرہند کا فوجدار تھا، اپنے قریب کے پہاڑ والوں پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک درویش سے رجوع کیا تو درویش نے فتح کی بشارت دی۔ اس نے پھر حضرت امام ربانی ؒ کو خط لکھا۔ آپ نے اس کے برعکس جواب دیا اور کہا کہ فوجدار کو شکست ہوگی۔ آپ نے فرمایا اس درویش نے بشارت دینے میں عجلت سے کام لیا ہے۔ جب تک صبح کی سپیدی کی طرح کوئی بات صاف طور پر ظاہر نہ ہو جائے اس وقت تک بات زبان پر نہیں لانا چاہئے۔ چند روز کے بعد جنگ چھڑ گئی اور فوجدار کو ذلت آمیز شکست

ہوئی۔

ایک صوفی نے حضرت مجدد الف ثانی ؒ سے عرض کی کہ طویل عرصہ محو عبادت رہنے کے بعد بھی ان کے روحانی احوال درست نہیں ہو سکے اور آپ سے یہ درخواست کی کہ بذریعہ کشف اس کی عبادات میں روحانی اثرات نہ پیدا ہونے کی وجوہات دریافت فرمائیں۔ آپ نے مراقبہ کیا اور فرمایا کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ کی خوراک میں کچھ احتیاط نہیں کی جاتی۔ چنانچہ جب اس نے پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ گھر میں استعمال ہونے والی لکڑی حلال ذرائع سے نہ آتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص روحانی کیفیات درست رکھنا چاہتا ہے تو اس کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس کے رزق میں حرام تو شامل نہیں یا اس کی عادات میں رذائل (تکبر، بغض، حسد، کینہ، غیبت، چغلی، سود، رشوت) جیسے عوامل تو شامل نہیں۔ توجہ الی الشیخ میں بھی ان معاملات کی طرف توجہ ضروری ہے جو مراقبے کی ضروریات میں شامل ہیں۔

مراقبہ فیض لینے کا ذریعہ ہے

لُغت میں لفظِ مراقبہ ماخوذ ہے رقابت سے جس کے معنی محافظت اور رقوبت کے ہیں یا انتظار کرنے کے۔ پس مراقبہ سے مراد تمام حواس ظاہری اور باطنی کو جمع کر کے مطلوب کے انتظار میں بیٹھنا ہے۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں اس کی ترکیب یوں ہے کہ آنکھوں کو بند کر کے لطائفِ عشرہ (ظاہری اور باطنی) میں سے کسی لطیفہ کی طرف متوجہ ہو جائے اور مبداء فیض سے اس لطیفے پر فیض آنے کا انتظار کرے (مبداء فیض وہ شخص ہے جس سے فیض لینا مقصود ہو) مقاماتِ لطائف ستہ میں سے ہر مقام میں ایک مراقبہ مقرر کیا گیا ہے۔ مراقبے سے متعلق تفصیلی بیان راقم الحروف کی کتاب "حضور قلب" اور "اسلام اور روحانیت" میں شامل کر دیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں ملاحظہ فرمائیں۔

امام عبدالوہاب شعرانی ؒ نے کثرت سے درود پڑھنے والے کچھ بزرگوں کے نام لکھے ہیں۔ یہ وہ بزرگ تھے جو رذائل سے پاک ہوئے، کیونکہ وہ کثرت سے درود شریف پڑھتے تھے۔ آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ۳۰ سے ۵۰ ہزار بار یومیہ درود شریف پڑھنے والے تھے اور ان میں سے بعض ایسے تھے کہ جب چاہتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بحالت بیداری کر لیا کرتے تھے۔

مراقبہ اور ذکر سے مشاہدے کے فاصلے بہت کم ہو جاتے ہیں

مثنوی کے دفتر چہارم میں مولانا روم فرماتے ہیں کہ صورت کے اعتبار سے انسان

عالم صغیر ہے اور باطن کے اعتبار سے یہ عالمِ کبیر کہلاتا ہے، کیونکہ انسان حقیقت اسماء الٰہیہ اور حقائق کونیہ کا جامع ہے۔ اگرچہ عالمِ کبیر کا مطلب پوری کائنات لیا جاتا ہے لیکن انسان کے اندر عالمِ کبیر ایک بیج کی صورت میں ہے جس سے تمام کائنات کا درخت بنا، چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ درخت پھل کے بیج سے ہی پیدا ہوا ہے اگرچہ بظاہر پھل درخت سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ '' نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ '' یعنی ہم آخر میں ہیں اور پہلے بھی ہیں "ظاہراً" آپ آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئے لیکن حقیقتاً آدمؑ کے بھی جد امجد ہیں (لہٰذا درخت پھل سے ہی پیدا ہوا) مولانا فرماتے ہیں کہ ارادہ سے ہی عمل وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح ارادہ ازلی وقت کے اعتبار سے ازلی ہے مگر بعد میں رو پزیر ہوتا ہے۔ گویا آسمان سے یہ ارادوں کے قافلے آتے رہتے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

روح اور جسم کے فاصلوں میں فرق کی وضاحت

مولانا رومؒ درجِ بالا درخت اور بیج کی مثال کے بعد فرماتے ہیں کہ ذکر اور مشاہدہ کے فاصلہ سے سالک کو گھبرانا نہیں چاہئے۔ قدرت ان فاصلوں کو کم کر دیتی ہے۔ اگر مشیت الٰہی میں کامیابی ہو تو راہ کا فاصلہ اور دشواری معدوم ہو جاتی ہے۔ دیکھئے انسان کا دل ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے کعبے میں پہنچ جاتا ہے اور اگر اللہ کا کرم ہو تو جسم بھی دل کی رفتار اختیار کر لیتا ہے اور اسی لئے کچھ لوگوں سے طی الارض کی کرامت ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ راستے کی درازی اور کوتہی جسم کے لئے ہے روح کے لئے نہیں۔ ؎

دل بکعبہ میرود در ہر زماں جسم، طبع دل بگیرد زامتناں
(ہر وقفہ میں دل کعبے کو جاتا ہے جسم، (خدا کے) احسان سے دل کی طبیعت اختیار کر لیتا ہے)
ایں دراز و کوتہی مرجسم راست چہ دراز و کوتاہ آنجا کہ خداست
(یہ درازی اور کوتاہی جسم کے لئے ہے۔ جہاں خدا ہے وہاں دراز و کوتاہ کچھ نہیں)

مولانا فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بزرگ کے جسم کو بدل دیتے ہیں تو اس کے لئے میل و فرسخ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ معراج میں انبیاء کے لئے یہی صورت پیش آتی ہے۔ چونکہ مجاہدہ کرنے والے قیل و قال سے نکل کر عمل اور ریاضت میں لگ جاتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ ان کو مشاہدے

کی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔ اگر انسان کشتی میں بیٹھا ہوا ہو تو اس کے سو جانے سے بھی منزلیں طے ہوتی رہتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں زمانے کے طوفان کے لئے کشتی کی طرح ہوں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "میں اور میرے صحابیؓ کشتی نوح کی طرح ہیں جو اس کشتی کا سہارا پکڑ لے گا نجات پا جائے گا"۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ جب تو کسی شیخ کا دامن تھامے ہوئے ہے تو تو برائی سے دور رہے گا۔ لہٰذا یہ سمجھ کہ تو دن رات چل رہا ہے اور تو (کسی اللہ والے کے دامن سے منسلک ہو کر) کسی کشتی میں سوار ہے اور تیرا راستہ طے ہو رہا ہے۔ فرماتے ہیں اپنے زمانے کے پیغمبر (یعنی اولیا اللہ) سے دور نہ رہو۔ اگر تو معراج والوں کی صف میں کھڑا ہو جائے گا تو تو فنا کے گھوڑے کے ذریعے بقا کی جانب چلا آئے گا۔

مولانا رومؒ مثنوی کے دفتر سوئم میں فرماتے ہیں۔ اللہ والے جب عشق الٰہی میں کئی سالوں اور مہینوں تک اپنے محبوب کی یاد میں محو ہو کر اس کی طرف سفر کرتے ہیں تو ان کے پاؤں کو زمین پر نہ سمجھو کیونکہ واقعتاً وہ دل کے بل پر چلتے ہیں۔ کسی منزل کو طے کرنے کے لئے جب راستوں کو طے کرنا ہو تو دل کو ان راہوں کی مسافت کا احساس تک نہیں ہوتا کیونکہ وہ دلنواز (محبوب حقیقی) کے عشق میں مست ہوتا ہے۔ سفر کا لمبا اور مختصر ہونا تو جسم کے اوصاف ہیں کیونکہ دل کے لئے تو قریب اور بعید کوئی چیز نہیں۔ روحوں کا چلنا جسم کے چلنے کی طرح نہیں ہوتا جس طرح انسان کے لئے نطفہ سے لے کر عقل آنے کے زمانے تک کے سفر میں نہ تھکن ہوتی ہے اور نہ دوری منزل کا تصور آتا ہے۔ اسی طرح روح کے سفر میں بھی نہ تھکن اور نہ دوری کا تصور ہوتا ہے۔ یہ سفر (نطفہ سے عقل آنے کے زمانے تک کا) نہ منزل سے طے ہوتا ہے، نہ منتقل ہونے سے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ روح کی سیر مسافت اور زمانے کے اعتبار سے بے کیف ہوتی ہے۔ ہمارے جسم نے روح سے ہی سیر سیکھی ہے۔ جسم کی سیر تو علی الاعلان ہوتی ہے مگر روح کی سیر ہر شخص نہیں دیکھتا۔

زمانے کے تفکرات انسان کو بوڑھا بنا دیتے ہیں، کیونکہ تمام تفکرات. تغیرات زمانہ سے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے جس کو زمانے سے نجات مل گئی وہ تغیرات سے بچ نکلا۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ کچھ دیر کے لئے مراقب ہو کر دل کو اللہ کی طرف رجوع کر کے قید مکان و زمان سے نجات پالے۔ ایسا کرنے سے انسان چون اور چگون (مثل اور مثال) سے رشتہ توڑ کر بے چوں (بے مثل) خدا کی ذات کا محرم راز بن جاتا ہے۔ چونکہ انسان دنیا کی تگ و دو سے بندھا ہوا ہے اس لئے اس کا زمانہ بے زمانہ پن سے واقف نہیں اور انسان جان بوجھ کر اس زمانے کی گرفتاری سے باہر نکلنا نہیں چاہتا (اور مراقبے کی جانب دلچسپی ظاہر نہیں کرتا) ورنہ اگر وہ ربط الٰہی کی محافظت کرے تو اس تہدیدِ نفس سے چھٹکارا بھی پا سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے مرد مومن کی پہچان کرواتے ہوئے مومن کی بہت سی علامات کا ذکر اپنے کلام میں مختلف مقامات پر کیا ہے، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کے علاوہ ہر شخص دنیا کی کسی نہ کسی شے کی محبت میں گرفتار ہے لیکن اللہ کے بندے ایسی محبت سے آزاد رہتے ہیں۔

وجود انہیں کا طواف بتاں سے ہے آزاد   یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری

رابطۂ شیخ ــ حضرت مجدِدؒ کے نزدیک

درج ذیل تحریر کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ طریقت میں ابتدا کرنے والوں کے لئے شیخ کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا ضروریات طریقت میں سے کیوں ہے۔ لہٰذا رابطہ شیخ پر اولیائے طریقت کے چند اقوال اور ان کے اپنے احوال یہاں شامل کئے جا رہے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ طریقۂ نقشبندیہ کا دار و مدار شیخ مقتدیٰ کی صحبت اور رابطۂ محبت پر ہے۔ کشودگیٔ کار اور ترقی اسی سے متعلق ہے۔ اس راہ غیب الغیب میں مرشد کامل کی دستگیری کے بغیر راہ سلوک طے کرنا بہت مشکل امر ہے۔ اہل اللہ ہمہ وقت شیخ سے رابطہ رکھتے ہیں۔

اے خنک آں مرد کز خود رستہ شد　　در وجودِ زندۂ پیوستہ شد

(ٹھنڈا رہے وہ مرد جو خود سے چھٹ گیا اور کسی کے زندہ وجود کے ساتھ پیوست ہو گیا)

وائے آں زندہ کہ بامردہ نشست　　مردہ گشت و زندگی از وے بجست

(افسوس اس زندہ پر جو مردے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سمجھو ایسا شخص تو مر گیا اور زندگی اس سے بھاگ گئی)

تصوّرِ شیخ کی دولت ہزاروں میں سے کسی ایک کو ملتی ہے

حضرت مجدد الف ثانیؒ مکتوب نمبر ۳۰، دفتر دوئم، حصہ اول میں (صفحہ ۱۰۱ پر) فرماتے ہیں کہ خواجہ محمد اشرف نے نسبت رابطہ (تصور شیخ) کے متعلق لکھا ہے کہ (اس کا تصوّرِ شیخ) اس حد تک غالب آچکا ہے کہ وہ نماز میں بھی اپنے شیخ کے تصوّر کو اپنا مسجود دیکھتا اور جانتا ہے اور اگر فرضاً نفی کرے تو بھی منتفی (یعنی ذہن سے نفی) نہیں ہوتا۔ آپ خواجہ محمد اشرف کو لکھتے ہیں کہ اے محبت کے اطوار والے! یہ دولت طالبان حق کی تمنا اور آرزو ہے۔ ہزاروں میں شاید ایک کو نصیب ہوتی

ہے۔ اس کیفیت اور معاملے والا مرید صاحبِ استعداد اور تامُ الُمناسبت والا (یعنی شیخ سے مکمل نسبت رکھنے والا ہوتا) ہے۔ احتمال ہے کہ شیخ مقتدا کی تھوڑی سی صحبت سے شیخ کے تمام کملات کو جذب کر لے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رابطے (تصوّر شیخ) کی نفی کی کیا ضرورت ہے کیونکہ وہ (شیخ) مسجود الیہ ہے، مسجودلہ' (نہیں یعنی جس کی طرف سجدہ کیا جائے نہ کہ وہ جس کو سجدہ کیا جائے) محرابوں اور مسجدوں کی نفی کیوں نہیں کرتے (نماز کی حالت میں محراب، دیواریں یا دیگر بہت سی چیزیں سامنے ہوں تو بھی نماز میں کسی قسم کی خرابی واقع نہیں ہوتی) اس قسم کا ظہور سعادت مندوں کو ہی میسر آتا ہے تاکہ وہ تمام احوال میں صاحب رابطہ (یعنی مرشد کامل) کو اپنا ذریعہ جانیں اور اپنے تمام اوقات میں اس کی طرف متوجہ رہیں، نہ کہ اس بدنصیب گروہ کی طرح جو اپنے آپ کو (تصوّرِ شیخ سے) بے نیاز جانتا ہے اور اپنے قبلۂ توجہ کو اپنے شیخ سے پھیر لیتا ہے اور اپنے معاملے کو خراب اور تباہ کر لیتا ہے۔

شیخ کی ذات اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کا وسیلہ ہے

حضرت مجدّد الف ثانی" نے مکتوبات شریف میں متعدد مقامات پر فرمایا ہے کہ شیخ کامل کی ذات مطلوب اور مقصود (یعنی اللہ تعالیٰ) تک پہنچانے کا ذریعہ ہے اور ایک جگہ فرماتے ہیں کہ جو چیزیں تمہارے لئے مطلوب اور مقصود تک پہنچنے میں رکاوٹ اور منافی ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان سے کامل اجتناب کی توفیق عطا فرمائے۔ فرماتے ہیں کہ طلب و شوق اور درد و پیاس، حصول مطلوب کی بشارت دیتی ہے اور مقصود کو پانے کا مقدمہ اور سبب ہے۔ فرماتے ہیں فنائے اول فنائی الشیخ ہے۔ پھر یہی فنا، فنائی اللہ کا وسیلہ اور ذریعہ بن جاتی ہے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے درج ذیل شعر کا حوالہ دیا ہے۔-

زاں روئے کہ چشمِ تست احول معبودِ تو پیرِ تست اوّل

(چونکہ تیری نظر اول سے ہی ٹیڑھا دیکھنے والی ہے اس لئے تیرا اول قبلہ تیرا مرشد ہی ہے)

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ افادے اور استفادے کا راستہ طرفین کی مناسبت پر مبنی ہے۔ ابتدا میں طالب کو اس کی کمال پستی اور کمینگی کے باعث جناب اقدس (باری تعالیٰ) کے ساتھ مناسبت نہیں ہوتی۔ اس حالت میں طالب کو ایسا واسطہ درکار ہے جس کی دو جہتیں (طرفین) ہوں اور وہ رابطہ شیخ کامل و مکمل کی ذات ہے (کیونکہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بھی ہوتا ہے اور مرید سے بھی) شیخ اگر ناقص ہو یعنی جس نے سلوک اور جذبے کا کام مکمل نہ کیا ہو تو اس کی صحبت زہر قاتل کی طرح ہوتی ہے اور اچھے خاصے طالب کو پستی کی طرف لے آتی ہے۔ شیخ کامل کے ساتھ رابطے کے حصول کے بغیر مطلوب (اللہ تعالیٰ) کا حصول مشکل اور دشوار ہے۔ مکتوب نمبر ۱۸۷ (ص ۴۲۵)

حصہ سوم دفتر اول میں فرماتے ہیں کہ تصورِ شیخ (رابطہ) ذکرِ الٰہی کرنے سے بھی زیادہ نفع بخش ہے، یعنی نفع کے اعتبار سے مرید کے لئے پیر کا سایہ اس کے ذکرِ حق سے زیادہ نفع مند ہے۔

اتباعِ شریعت اور محبت شیخ میں کمی ہو تو خرابی ہی خرابی ہے

مذکورہ بالا مکتوب میں حضرت مجدّد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ مولانا حاجی محمد نے اظہار کیا تھا کہ تقریباً دو ماہ کے عرصے سے ان کے باطنی کام کی مشغولیت میں فتور اور سستی واقع ہو چکی ہے اور وہ ذوق و حلاوت جو پہلے تھی بعد میں نہیں رہی۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ اس معاملے میں غم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بشرطیکہ دو چیزوں میں فتور نہ آ گیا ہو۔ ایک تو صاحب شریعت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی متابعت میں اور دوسرے اپنے شیخ کی محبت و اخلاص میں۔ ان دونوں چیزوں کی موجودگی میں اگر ہزاروں ظلمتیں اور کدورتیں بھی پیدا ہو جائیں تب بھی ڈر کی بات نہیں۔ آخر اسے ضائع نہیں کریں گے اور اگر العیاذ باللہ ان دونوں میں سے کسی ایک میں نقصان پیدا ہو گیا تو خرابی ہی خرابی ہے۔ اگر کسی شخص کو ان دونوں نقائص کی موجودگی میں حضور کا مقام نصیب ہو اور جمعیت کی حالت میں ہو تو بھی یہ استدراج ہے (استدراج کسی کافر کے ہاتھوں خرق عادت یا نظام عالم کے خلاف کسی کام کے ظاہر ہونے کو کہتے ہیں۔) حق تعالیٰ سے گریہ و زاری کرنے کے ساتھ ان دو باتوں پر استقامت و ثبات کی دعا کرتے رہنا چاہئے کیونکہ انہی دونوں امور پر مدار کار اور مدار نجات کا انحصار ہے۔

مکتوب نمبر ۲۶۰، حصہ چہارم، دفتر اول میں حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے (صفحہ ۶۲۲ پر) فرمایا ہے کہ شیخ کی طرف توجہ کرنا ہی ہدایت کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ اس مکتوب کی آسان توضیح راقم الحروف کی کتاب "بیعت کی تشکیل و تربیت" میں صفحہ ۱۴۱ پر تحریر کر دی گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی عقید تمند توجہ الی الشیخ میں کامل نہ ہو اور ذکر الٰہی سے بھی خالی ہو تو بھی فقط محبت ہی کے باعث رشد و ہدایت کا نور اس کو پہنچ جاتا ہے اس کے برعکس جو لوگ ان بزرگوں سے عقیدت نہیں رکھتے وہ رشد و ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔

مکتوبات شریف اور مبداء و معاد میں حضرت مجدّد علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ مرید کا کام پیر کے بغیر دشوار ہے۔ آپ نے قلیل مدت میں مشائخ کے ذریعے نسبت کی تکمیل، فقراء سے فیوض و برکات، اولیاء اللہ کے امراض قلبی کا علاج کرنے اور نسبت پر پوری قدرت رکھنے کے لئے بہت طویل تحریریں قلمبند فرمائی ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ انہوں نے خود طریقت کی دنیا میں جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اپنے پیر اور وصول الی اللہ میں رہنماؤں کے توسط سے ہی حاصل کیا ہے۔

حضرت مجدّد علیہ الرحمۃ کی مذکورہ بالا تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ تصور شیخ نہ

صرف جائز اور مستحسن ہے بلکہ اس کے بغیر طالبان حق تصوف کی راہ پر ایک قدم بھی چل نہیں سکتے۔ جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں وہ حضرت مجدد علیہ الرحمہ کے اقوال کے مطابق اس راہ میں ابتدائی مقامات میں سے کسی ایک منزل پر بھی قدم نہیں رکھ سکے، لہٰذا ان کا قول کہ تصور شیخ شرک ہے ان کی بے علمی پر واضح دلیل ہے۔

حضرت مجدّد علیہ الرحمۃ کے قول کے مطابق جو لوگ اپنے شیخ سے عقیدت رکھتے ہیں ان کو اپنے شیخ کے فیوض بھی پہنچتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو کمالات ان کے شیخ میں موجود ہوں مرید اپنی محبت اور لگاؤ کی وجہ سے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ موافقت کے باعث دونوں میں اس قدر مماثلت ہو جاتی ہے کہ عوام کے لئے شیخ اور مرید میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور محبت کی اس منزل میں "من توشدم، تو من شدی" کا مقام مرید کو اسی محبت کے باعث میسر ہو جاتا ہے. جسے ایک جان دو قالب بھی کہا جاتا ہے۔ راہ ارادت میں ارواح طیبہ (یعنی اپنے سلسلہ کے بزرگوں) سے ہمت اور استقامت طلب کرنا ایک سالک کے لئے بہت ضروری امر ہے لہٰذا اس امر کے متعلق معلومات حاصل کرنا بھی ضروری ہے تاکہ ہر سالک اپنے بزرگوں سے مکمل اعانت حاصل کر سکے۔ حضرت باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تک حق تعالیٰ بندہ پر صفت ارادہ سے تجلی نہیں فرماتا اس وقت تک وہ بندہ اہل اللہ کا راستہ اختیار نہیں کرتا اور کسی کا مرید نہیں ہوتا۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت ارادہ انسان کے اپنے ارادے سے منسلک ہوتی ہے یعنی اگر اس کا ارادہ اللہ کی طرف آنے پر ایک بالشت کی مانند آمادہ ہو تو اللہ تعالیٰ ایک گز اس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا:۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں	راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

اولیاء اللہ کے رسائل میں بھی یہ بات موجود ہے کہ سالک کی ارادت اگر ابتداء سے ہی حق تعالیٰ کے ساتھ منسلک ہو تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس کے بعد اپنے بزرگوں کی ارواح طیبہ سے ہمت اور استقامت طلب کرے کیونکہ اس کے بغیر انسان خواہ فرشتہ بھی ہو محروم رہتا ہے۔

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق	گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(عنایات حق اور خاصان حق کے بغیر اگر کوئی فرشتہ بھی ہو تو نامہ عمل سیاہ رہے گا)

طریقِ رابطہ صدیقِ اکبرؓ سے جاری ہوا

کُلیاتِ باقی باللہؒ میں ہے کہ سلسلۂ نقشبندیہ میں طریقِ رابطہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جاری ہوا اور طریقہ ذکر امیر المومنین حضرت علیؓ کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے، لیکن ذکر کا وہ طریقہ بھی (جسے راقم الحروف نے اپنے خاص دوستوں کو سکھایا ہے اور جس کا ذکر مجدد علیہ الرحمہ نے مکتوبات میں وقوف عددی کے نام سے نقل کیا ہے) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

سے ہم تک پہنچا ہے کیونکہ اس میں "حبس نفس" (سانس بند کرنا) ہے اور اس کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملانا ہے۔ مشائخ سے محبت کرنے کا طریق بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ہم تک پہنچا ہے اور سلسلہ نقشبندیہ کا طریقہ صحبت بھی ان سے ہی پہنچا ہے کیونکہ آپ سفر اور حضر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ صحبت کے راستے سے ہی وقت گزارتے تھے اور صحبت کے واسطے سے تمام کمالات حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ اس ارادت (طریقت) کے کام میں بنیاد صحبت پر ہے اور رابطہ اس کا سایہ ہے۔ لہٰذا جب صحبت ظاہری حاصل نہ ہو تو واسطے پر اکتفا کرتے ہیں اور یہی صحبت معنوی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ شیخ سے دوری طریقت میں رکاوٹ نہیں۔

حضرت باقی باللہؒ ذکر قلبی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ سلسلہ نقشبندیہ اور کبرویہ کا ذکر وہی ہے جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہم تک پہنچا اور پھر اس میں ہمارے زمانے تک کوئی فرق نہ آیا۔ جب دل کی حرکت ذکر کی حرکت کے برابر ہو جاتی ہے یا خیال کے کانوں سے کلمۂ "اللہ" سنائی دیتا ہے تو یہ صنوبری گوشت کے ٹکڑے کا ذکر ہے۔ اسے بھی ذکر قلبی کہتے ہیں۔ لیکن اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اصل میں ذکر سے مراد حضور اور شہود کا حاصل ہونا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی جناب کا حضور یا شہود محسوس کرے) اور جب یہ حاصل ہو جائے تو دل اغیار کے خطرے (یعنی اللہ کے سوا کسی اور کے خیال) سے نجات پا جاتا ہے اگر یہ حالت میسر آجائے تو اس کیفیت کے برقرار رہنے کی طرف خیال کرنا چاہئے اور ذکر بے شک کم ہو جائے۔ جب یہ حالت برقرار ہو جائے تو اس وقت اس کیفیت کے ساتھ ذکر کو اکٹھا کرے اور الطاف بے نہایت کا انتظار کرے۔

صاحبِ مزار، حق تعالیٰ کی طرف توجہ کا وسیلہ بنتا ہے

حضرت خواجہ علاؤالدین عطارؒ فرماتے ہیں کہ مشائخ کبار قدس اللہ اسرارہم کے مزارات سے زیارت کرنے والا اسی قدر فیض حاصل کر سکتا ہے جتنا اس نے اس بزرگ کی صفت کو پہچانا اور اس صفت کی طرف توجہ کی ہے اور خود اس صفت میں آگیا ہو۔ مشاہدات مقدسہ کی زیارت کرنے کے وقت قرب صوری (جسمانی قرب) کے اثرات بہت ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں ان بزرگوں کی ارواح کی طرف توجہ کرنے میں اکثر بعد صوری (جسم کا دور ہونا) کوئی رکاوٹ نہیں ہے (یعنی جہاں بھی کوئی ہو تو ان بزرگوں سے توجہ ملتی ہے۔) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول صَلُّوا عَلَیَّ حَیْثُمَا کُنْتُمْ (مجھ پر درود بھیجو چاہے تم کہیں بھی ہو) اسی بات کی دلیل پیش کرتا ہے۔ خواجہ عطارؒ کی مذکورہ بالا عبارت کا مطلب یہ ہے کہ توجہ کا مرکز اللہ کی طرف رہے اور اس صاحب قبر کی روح کو حق

تعالیٰ کی طرف کمال یا توجہ کا وسیلہ بنانا چاہئے۔ اس کی مثال یوں دی جاتی ہے کہ جب ہم مخلوق کے سامنے تواضع کرتے ہیں تو حقیقتاً وہ حق سبحانہ کے سامنے تواضع ہوتی ہے کیونکہ تواضع اگر خالص اللہ کے لئے نہ ہو تو یہ بناوٹ ہو گی۔

اطاعت اور محبت سے معیّت حاصل ہوتی ہے

درج بالا بیان سے ظاہر ہوا کہ کسبی فیض بزرگوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور اس سے انکار طریقت کی راہ میں نہایت دشواری اور انتہائی بے ذوقی کی دلیل ہے۔ کسبِ فیض کے متعلق قرآن اور حدیث میں نہایت واضح ثبوت موجود ہیں۔ سورۂ فاتحہ میں ان لوگوں کے راستے پر چلنے کی ہی طلب کا اظہار ہے۔ اس کے علاوہ سورہ النساء کی آیت ۶۹ میں ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے تو وہ انبیاء علیہم السلام، صدیقین رضوان اللہ علیہم، شہدا اور صالحین ؒ کی ارواح مقدسہ کی معیّت میں رہے گا اور یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے اپنا انعام فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ لوگ کتنے اچھے ساتھی ہیں۔ یہ تعلق یا معیت تو احکام الٰہی و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے ہی قائم ہو جاتی ہے مگر صدیقین، شہدا اور صالحین کی محبت سے فراست و بصیرت کی آنکھ بھی کھل جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ اِلَيْهِ (آدمی اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے) اس حدیث سے اور مندرجہ بالا آیت قرآنی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن عظیم ہستیوں سے ایک مومن محبت کرتا ہے تو اسے ان کی معیت حاصل ہو جاتی ہے۔ لاکھوں، کروڑوں افراد کا ان بزرگوں سے فیض حاصل کرنا ہر زمانے میں ثابت ہے اور آج بھی جاری ہے۔ تمام سلسلوں کے بزرگوں اور بالخصوص بزرگان نقشبندیہ ؒ میں ایسے کئی بزرگ نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنے سے پہلے وفات شدہ بزرگوں سے فیض حاصل کیا ہے اگرچہ اس دنیائے شہادت میں ان کی ملاقات نہیں ہوئی، یہاں تک کہ کچھ لوگ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار عالی میں بھی بازیاب ہوئے ہیں۔

طریقِ سلوک میں واسطہ ہوتا ہے، مگر طریقِ جذبہ میں براہِ راست فیض ملتا ہے

خواجہ محمد پارسا ؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے خواجہ ؒ اویسی تھے۔ خواجہ عطار ؒ فرماتے ہیں کہ اویسی وہ اولیاء اللہ ہیں جنہیں ظاہر میں پیر کی حاجت نہیں ہوتی کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے بزرگ خود اپنے حجرہ عنایت میں ان کی پرورش فرماتے ہیں، اس میں کسی دوسرے کا واسطہ نہیں ہوتا اور حضرت اویس قرنی ؓ کی تربیت اسی طرح فرمائی گئی۔ یہ بہت اعلیٰ مقام ہے جسے اللہ تعالیٰ

نوازے اور کچھ لوگ تو ابتداء سے ہی اس مقام کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ طریقِ سلوک میں فیض حاصل کرنے کے لئے ارواحِ مقدسہ کا درمیان میں واسطہ ہوتا ہے لیکن طریقِ جذبہ میں کوئی واسطہ درمیان میں نہیں ہوتا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کے بارے میں ہمیں یہ بات صحیح یقین سے معلوم ہے کہ آپ کو حضرت امام جعفر صادقؓ کی روحانیت سے نسبت ہے جب کہ ان کی پیدائش حضرت امام جعفرؓ کی وفات کے بعد ہوئی۔ اسی طرح شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کو تصوف میں حضرت بایزید بسطامیؒ کی روح سے انتساب ہے اور آپ کے سلوک میں آپ کی تربیت شیخ ابویزیدؒ کی روحانیت سے ہوئی ہے۔ اسی طرح حضرت بہاؤالدین نقشبند کی تربیت حضرت اُتا قدس سرہٗ، کے حکم سے ایک ترکی درویش حضرت خلیلؒ نے کی۔ اس کے علاوہ حضرت بہاؤالدین نقشبندؒ نے ذکر کی تربیت حضرت خواجہ سید امیر کلالؒ سے لی جو آپ کے مرشد تھے مگر آپ کے استاد حقیقی اور پیر معنوی شیخ عبدالخالق غجدوانیؒ تھے جو آپ سے پہلے ہو چکے ہیں، حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ خواجہ بہاؤالدینؒ کے باطن پر متجلی ہوئے اور ذکر خفی، بعض ریاضاتِ سریع الاثر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی تربیت اپنے سامنے گویا بالمشافہ فرمائی لہٰذا حضرت باقی باللہؒ فرماتے ہیں۔

بہ ظاہر پیرش از میر کلالؒ است   بہ پیر غجدوانیؒ اتّصال است
(اگرچہ ظاہر میں ان کے پیر حضرت کلالؒ تھے   مگر حضرت غجدوانیؒ سے اتصال تھا)

مختلف بزرگوں سے الگ الگ روحانیت کا ظہور ہوتا ہے

حضرت خواجہ محمد پارساؒ اور مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ فرمایا کرتے تھے کہ آپ دونوں حضرات مشائخِ طریقت کی ارواحِ طیبہ کی جانب اپنی توجہات فرماتے اور ہر ایک کی روحانیت کے ظہور کا الگ الگ اثر پاتے، بلکہ کچھ بزرگ تو مسلسل کئی ماہ اور کئی سال تک ایک ہی بزرگ سے فیض حاصل کرتے اور ان کے اثرات حاصل کر لیتے۔ حضرت خواجہ محمد پارساؒ فرماتے تھے کہ اویس قرنیؒ سے حاصل کردہ توجہ کا اثر ظاہری اور باطنی تعلقات سے انقطاع ہے (یعنی مکمل طور پر ہر ایک سے قطع تعلق ہونا) اور خواجہ محمد بن علی حکیم ترمذیؒ کی طرف توجہ کرنے سے بے صفتیٔ محض یعنی کسی صفت کے نہ پائے جانے کا ظہور ہوتا ہے۔ حضرت بہاؤالدین نقشبندؒ فرماتے ہیں کہ اس امت کے ولیوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے علاوہ دوسرے پیغمبروں کی ولایت کی نسبت سے بھی حصہ ملتا ہے۔ یہ حصہ اس لئے بھی ملتا ہے کہ تمام انبیاء علیہ السلام، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے اکتساب انوار کرتے ہیں اور آپ کے باطن مقدس سے مستفیض ہوتے ہیں اور سب کی ارواح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت کے احاطہ میں داخل ہیں۔

صاحبِ مزار کی روح سے ملاقات

(سالک کے مقامِ فنا پر پہنچنے کے بعد ہوتی ہے۔)

مزار پر حاضر ہو کر استمداد (مدد طلب) کرنے کے بارے میں حضرت باقی باللہ ؒ اپنے خلیفہ شیخ تاج الدین ؒ کو تحریر فرماتے ہیں کہ اس سیاہ دل نیازمند کو جس نے اپنی عمر کو ضائع کر دیا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ آپ خود کو حضرت میاں کے مزار کے سامنے ظاہر کریں اور امداد کی درخواست کریں یعنی حضرت باقی. باللہ کو بیچ میں رکھ کر اہل قبر سے فیض لیں۔ فرماتے ہیں کہ ارواح سے ملاقات اسی وقت قابلِ اعتبار ہو سکتی ہے جب سالک فنا سے مشرف ہو چکا ہو. کیونکہ شرف حضوری کے لئے فنا کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور عالم مثال کی سیر کے دوران پیش آنے والے واقعات کی نفی پر زور دیتے ہیں تاکہ اصل مقصد نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ ایک اور مرید کو لکھتے ہیں کہ اگر شغل کے دوران سالک کے لئے کشف کا دروازہ اللہ تعالیٰ کھول دیں اور عالم مثال کی سیر ہو جائے تو سالک ان وقائع کی نفی کرے۔ وہ اپنی نظر اپنے وجود کے دائرے سے باہر نہ ڈالے اور اپنی صفائی اور اپنی فنا میں ہمیشہ کوشش کرے اور جب غیبت ہو جائے (یعنی مکمل نفی ہو جائے) تو اپنے آپ کو اس بے شعوری کے سپرد کر دے اور اگر پھر بھی مثالی صورتیں ظاہر ہوں تو نفی کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور یہ کلمہ بازگشت کہے "اے خدا میرا مقصود تو اور تیری رضا ہے"۔ فنا سے پہلے جو کچھ بھی دیکھے اس کا اعتبار نہ کرے۔ انسان میں حسب ذیل سات لطیفے ہیں جو کلّیات باقی. باللہ میں بھی دیئے گئے ہیں:۔

۱۔ لطیفۂ قالبی (جسم) ۲۔ لطیفۂ انفس (نفس) ۳۔ لطیفۂ قلبی ۴۔ لطیفۂ روحی ۵۔ لطیفۂ سِرّی ۶۔ لطیفۂ خفی ۷۔ لطیفۂ اخفیٰ۔ روحِ مظہرِ انسان تمام لطائف کا مجموعہ ہے۔ ہر لطیفہ کے الگ الگ آثار اتنے معتبر ہیں کہ ان کا ظہور سعادت کی خوشخبری ہے۔

رابطۂ الٰہی میں پیر کو درمیان میں نہ رکھنا عدم ترقی کا موجب ہے

حضرت خواجہ باقی. باللہ ؒ نے طریقہ رابطہ کے لئے اس طرح لکھا ہے کہ سالک دوسرے تمام کاموں کو بھلا کر اپنے تمام قویٰ کے ساتھ رابطہ مقصود کو قلب صنوبری کی طرف پہنچائے تاکہ حق الیقین کا کمال ظاہر ہو۔ کبھی اپنے مریدوں کو لکھتے کہ ہم بھی ان پانچ چھ دنوں میں تمہاری طرف متوجہ ہوں گے۔ اس سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ اس وقت ہم تمہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔

حضرت باقی. باللہ ؒ مرشد کی ضرورت اور آداب مرشد بجالانے کو نہایت اہم قرار دیتے ہیں اور ایسے بزرگ سے فیض پانے کو حق تعالیٰ سے فیض یاب ہونے کی نسبت زیادہ ضروری سمجھتے

ہیں۔ چنانچہ اپنے خلیفہ تاج الدین ؒ کو تحریر فرماتے ہیں کہ " مقصود حق ہے، اگر ہمارا حجاب درمیان میں نہ ہو تو نور علیٰ نور ہے لیکن چونکہ اللہ کی سنت اس کے واسطے اور اس کی برزخیت کے اعتبار پر ہے لہٰذا اس سے آنکھیں بند کرنا اور پیر کو درمیان میں نہ دیکھنا عدم ترقی کا موجب بن جاتا ہے (یعنی مرشد کو بطور برکت درمیان میں رکھنا چاہئے) اگر اچانک واسطہ کے بارے میں یقین کی حد تک باطن میں انحراف پیدا ہو جائے (یعنی مرشد کے واسطے کو ضروری نہ سمجھے) تو برکت درمیان سے اٹھ جائے گی۔

حضرات نقشبند ؒ کو نقشبند کیوں کہا جاتا ہے؟

حضرت خواجہ بہاؤالدین نقش بند ؒ کے متعلق یہ روایت بہت مشہور ہے کہ آپ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کی قبر مبارک پر تشریف لے گئے اور قبر شریف پر انگلی رکھ کر عرض کیا کہ اے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ ہماری دستگیری فرمائیں اور میرا نقش باندھ دیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ نے آپ کو یہ القاء فرمایا کہ آپ لوگوں کے قلب پر " اللہ " کا نقش باندھ دیا کریں۔ اس طرح کرنے سے ان کے دلوں سے ماسوا اللہ کا نقش مٹ جائے گا اور ایسے نقش کرنے کی نسبت سے آپ کو نقشبند کہا جائے گا۔ اس سلسلے میں یہ شعر بہت مشہور ہے۔

اے نقشبندِ عالم نقشِ مرا بہ بند نقشم چناں بہ بند کہ گویند نقشبند

(اے زمانے بھر کے نقش باندھنے والے! میرا نقش بھی باندھ دیں، میرا نقش ایسا باندھ دیں کہ لوگ ہمیں نقشبند کہیں)

حضرت معین الدین چشتی ؒ اور دیگر اولیائے کرام کا حضرت علی ہجویری ؒ کے مزار پر چلہ کشی کرنا ہر خاص و عام کے علم میں ہے بلکہ حضرت علی ہجویری ؒ نے کشف المحجوب میں اہل قبور سے گفتگو کرنے اور فیض یاب ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔

تصوّر شیخ تمام اولیائے کرام کا طریقہ رہا ہے

خواجۂ خواجگان حضرت بہاؤالدین نقشبند ؒ کے پاس ان کے مرید شیخ نیک رود بخاری ؒ کسی کی شکایت لے کر پہنچے۔ حضرت نے کشف سے معلوم کر کے فرمایا کہ اس وقت تم امیر برہان الدین کی شکایت لے کر آئے ہو۔ شیخ بخاری ؒ نے عرض کیا کہ شیخ برہان الدین ؒ نے ان کے احوال باطنی ایک نظر میں ختم کر دیئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر برہان الدین اب تمہاری طرف دیکھے تو اس وقت تم میری طرف متوجہ ہو جانا اور دل میں یہ سمجھ لینا کہ میں نہیں ہوں جو کچھ ہیں حضرت خواجہ ہیں۔ شیخ بخاری ؒ فرماتے ہیں کہ جب میری ملاقات برہان الدین سے ہوئی تو وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور میں نے فوراً حضرت خواجہ نقشبند ؒ کا تصور کیا اور کہا " میں نہیں ہوں، جو کچھ ہیں حضرت خواجہ ؒ

ہیں۔" اسی وقت میں نے دیکھا کہ امیر برہان الدین کا رنگ متغیر ہوا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر اس کے بعد انہوں نے کبھی مجھ پر تصرف نہ کیا۔

حضرت باقی باللہ" کا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی شخص کو بیعت کے لئے قبول فرماتے تو پہلے اسے توبہ کرواتے اور اگر اس طالب میں عشق و محبت کا جذبہ ہوتا تو اسے رابطہ اور نگہداشت کے طریقے پر اپنی صورت کا بہ حقیقت جامع امر فرماتے (یعنی فرماتے مری شکل دل میں ہر وقت رکھو) ایسا کرنے سے طالب کو بہت کچھ کشائش حاصل ہوتی ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت باقی باللہ" کی خدمت میں خواجہ برہان الدین" جو اپنے بزرگوں سے نسبت اور اجازت یافتہ تھے مستفیض ہونے کی غرض سے آئے تو آپ نے ان کو نگہداشتِ صورت کے لئے ارشاد فرمایا۔ خواجہ برہان الدین" نے عرض کیا "حضرت یہ طریقہ تو مبتدیوں کے لئے ہے۔ براہ کرم مراقبہ اعلیٰ کے لئے ارشاد فرمائیں۔" لوگوں نے کہا کہ جو آپ کو حکم ہوا ہے وہی کریں چنانچہ وہ نگہداشت (صورت کا تصور کرنے) میں مشغول ہو گئے۔ ابھی دو روز ہی گزرے تھے کہ ان پر حضرت باقی باللہ" کی نسبت عظیم غالب ہو گئی اور غلبہ سکر اس قدر ہوا کہ باوجود سنجیدگی اور بڑھاپے کے زمین سے تقریباً دو گز اوپر اچھل جاتے اور ہر طرف دیواروں اور درختوں سے خود کو ٹکراتے اور جو لوگ ان کو پکڑے ہوتے تھے ان کی قوت اس نگہداشت کے مقابلہ میں ہیچ ہو گئی اور پھر وہ دیکھا جو دیکھا۔

روح ہر جگہ پہنچ سکتی ہے

بخاری شریف کی ایک حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص کسی بزرگ کی قبر پر جا کر سلام عرض کرتا ہے تو اس کی روح خواہ کسی جگہ ہو آن واحد میں (بجلی کی رفتار سے تیز) اپنی قبر پر حاضر ہو جاتی ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتی ہے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمہ مکتوبات میں لکھتے ہیں کہ جب ان بزرگوں سے مدد طلب کی جاتی ہے تو ان کی روحیں حاضر ہو کر مدد فرماتی ہیں۔ آپ نے خود مکتوبات شریف میں بہت سی روحوں کے حاضر ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ حضرت عبیداللہ" فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ ان کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کے ساتھ مل کر حج کیا اور کچھ کہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ بغداد میں دو ماہ تک رہے ہیں، حالانکہ حضرت عبیداللہ احرار" اس دوران کبھی اپنے گھر سے باہر بھی نہیں نکلے۔ (دیکھئے مکتوب نمبر ۵۷ حصہ ہفتم دفتر دوم ص ۱۱۴۰)

خواجگانِ نقشبند فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں اپنے شیخ سے محبت ہو تو وہ شیخ تمہیں اپنے دیدار سے مشرف کرتا رہے گا اور اگر تمہارے دل میں مرشد کے متعلق تھوڑی سی بھی کراہت پیدا ہو جائے تو فیض کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ جس طرح آئینہ سورج کے سامنے ہوتا ہے تو اس کی حرارت کو حاصل کر لیتا ہے اور دوسری تمام صورتوں کے حجاب نظر سے اٹھ جاتے ہیں۔ یہ طریق حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ماخوذ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا

ُبت تھی اور اسی رابطۂ محبت سے وہ فیض حاصل کرتے رہتے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنی تمام عنایات اور نوازشات سے مزین فرمائے، آمین. بجاہِ سَیّدُ المُرسلِین صَلّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّم۔

رابطہ توجہ الی اللہ کا طریق ہے

روحانیت پوری کی پوری توجّہ الی اللہ کا نام ہے اور جس کو اللہ کی طرف توجّہ مطلوب ہو وہ مراقبہ یا ربط تام کے ذریعے مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ رابطے کا اول زینہ توجّہ الی الشیخ ہے اور اس کے بعد توجہ الی اللہ کا مقام بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ حقیقتاً توجّہ الی الشیخ کو توجّہ الی اللہ کا زینہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی غرض و غایت توجہ الی اللہ ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مراقبہ، حضور قلب، تصور شیخ اور خشوع و خضوع سے مقصود توجّہ الی اللہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ درج ذیل عبارت میں توجہ الی اللہ کی کچھ وضاحت پیش کی جا رہی ہے۔

خدا کا مخلوق سے رابطہ ناقابلِ فہم ہوتے ہوئے بھی حقیقی ہے

انسان عقل جزوی ہوتے ہوئے محض مادی اور مکانی روابط کو ہی جانتا اور مانتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خدا جو زمان و مکاں سے ماورا ہے اس کا تعلق اس زمانی اور مکانی کائنات سے کیسے ممکن ہے۔ ایسے خیالات کے حامل کچھ لوگ تو خدا کے بھی منکر ہو جاتے ہیں۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ایسے منکرین کو سوچنا چاہئے کہ انسان کی جان اور نفس کا بدن سے پیوستہ ہونا کیسے ممکن ہوا جب کہ دونوں میں مماثلت نہیں۔ جسم مکانی ہے اور روح و نفس مکانی نہیں۔ یہ دونوں چیزیں ایسے ملحق ہیں جیسے گلاب میں خوشبو مستور ہوتی ہے۔ اسی طرح آنکھ مادی ہے مگر بصارت تو مادی نہیں لیکن دونوں کا تعلق ایک امر واقعہ ہے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ خدا جو روح الارواح اور جان کی بھی جان ہے، مخلوقات سے اس کا رابطہ نہ زمانی ہے، نہ مکانی اور نہ حسّی، مگر بہت گہرا رابطہ ہے، جو حلول، اتحاد، صانع اور مصنوع کے خارجی تعلق سے سمجھ میں نہیں آ سکتا ہے۔ انسان کی جان جزوی، جب خدا کی جان کلی سے

متاثر ہوتی ہے تو اسے عقل کا جوہر ہاتھ آتا ہے، کیونکہ جو زیادہ خدا کے قریب ہو گا اس کی عقل میں اسی قدر اضافہ ہو گا۔ اگر انسان اسی طرح اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کر لے تو وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح روح اللہ تو نہ سہی مگر اس نوعیت کا دم عیسیٰ حاصل کر سکتا ہے۔ حافظ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید   دیگراں ہم بہ کنند آنچہ مسیحا می کرد

(روح القدس اگر پھر مدد کر دے تو دوسرے بھی وہی کریں جو مسیحا کرتا تھا)

اے بسا کس را کہ صورت راہ زد   قصدِ صورت کرد و براللہ زد

(اکثر یوں ہوتا ہے کہ کوئی صورت سے راہ پالیتا ہے، اسی طرح کوئی صورت کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تک پہنچ جاتا ہے)

مولانا فرماتے ہیں کہ محسوسات میں گرفتار صورت پرست نے خدا کی ذات و صفات پر بھی حملے شروع کر دیئے ہیں۔ یوں ہی عشق مجازی والا عشق حقیقی تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان میں مسیحائی دم کا پیدا ہونا خاص احوال میں ممکن ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ شخص وہی مسیح ہے جو کسی وقت اس زمین پر چلتے پھرتے تھے بلکہ مسیح کہنے سے مراد وہ روح ہے جو کیف و کم سے آزاد ہو کر اللہ سے ربط پیدا کر کے روحانی عالم میں الوہیت سے فیض یاب ہوتی ہے، اس قسم کی خدا رسیدہ روح سے ایک جہاں فیض حاصل کرتا ہے مولانا فرماتے ہیں کہ۔

پس زجانِ جاں چو حامل گشت جاں   از چنیں جانے شود حامل جہاں

(چنانچہ جب اللہ کی روح سے انسان کی روح متحمل ہو گئی   تو ایسی روح سے پورا عالم فیض لینے والا بن جاتا ہے)

انسان کا دل ایک بحرِ بیکراں سے ملا ہوا ہے

مولانا روم" مثنوی میں فرماتے ہیں کہ انسان کا دل ایک حوض کی طرح ہے جو باطنی طور پر ایک بے پایاں دریا (یعنی اللہ تعالیٰ) سے ملا ہوا ہے۔ اگر یہ حوض اس دریا سے ملا رہے تو انسان کے علم و عمل کی محدود قوتیں اس دریائے بیکراں کا بے پایاں فیضان اور عرفان حاصل کر لیتی ہیں۔ اگر یہی محدود حوض کا تعلق لامحدود دریا سے منقطع ہو جائے تو حوض کا پانی یا تو کچھ دیر بعد بدبودار ہو جائے گا یا پھر خشک ہو کر اڑ جائے گا۔ شیخ سعدی" فرماتے ہیں کہ اگر پہاڑ پر بارش نہ ہو تو دریائے دجلہ جیسا عظیم دریا بھی خشک ندی ہو جائے۔ اس کلام سے مراد یہ ہے کہ اگر مرید اپنے شیخ سے رابطہ قائم کئے رہتا ہے تو اس کے عرفان اور روحانی استعداد میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا۔

ع   پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

اہل فلسفہ اور حکماء مادیت سے باہر قدم نہیں رکھتے اور محسوسات کے علاوہ علم کا منبع

کہیں اور تلاش نہیں کرتے. لیکن صوفیہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ حقیقت کا منبع انسان کے اندر ہے. باہر نہیں، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے "وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" اے اور تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں؟ مولانا روم" فرماتے ہیں کہ جو علم محسوسات سے حاصل ہوتا ہے اگر وہ محسوسات اور ان سے اخذ کردہ معقولات (علوم حکمت، فلسفہ، منطق) سے آگے نہ بڑھ سکے تو وہ محض ظنی علم رہ جاتا ہے۔ محدود فکر و اندیشہ جو اکثر اوقات ذاتی اغراض سے ملوث ہوتا ہے ایک پرنالے کے پانی کی طرح محدود ہے جو اپنے اندر غلاظت کی آمیزش رکھتا ہے، جب کہ حقیقت کا آب حیات تو آسمانی اور نورانی بارش کی طرح پاکیزہ اور غلاظت سے منزہ ہوتا ہے۔ ایسے پاکیزہ آب حیات سے صداقتوں کے گلزار تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔

توجہ شیخ سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں

فیض رساں ہستیوں سے سالک کو دیگر فیوضات کے علاوہ ایک یہ بات بھی میسر آجاتی ہے کہ وہ سالک کے دلوں کو مختلف انواع کے خطرات سے محفوظ کر دیتے ہیں (خطرہ وہ خطاب ہے جو غیب سے سالک کے ضمیر پر وارد ہو) خطرات کی کئی ایک اقسام ہوتی ہیں مثلاً خطرۂ نفس، خطرۂ شیطان، خطرۂ ملک وغیرہ۔ بعض خطرات سے دل پلید ہو جاتا ہے۔ ان سے سالک کو بچنا چاہئے اس کے زائل ہونے کی ترکیب یہ ہے کہ اولیائے کرام کی صحبت حاصل کی جائے اور ذکر الٰہی میں مشغول رہا جائے تو شیطانی خطرات ٹل جاتے ہیں۔ اپنے شیخ کا تصور کرنے سے بھی خطرات ٹل جاتے ہیں اور دعا مانگتے رہنے سے بھی کبھی خطرات دفع ہو جاتے ہیں۔ ایسے خطرات ایمان والوں کو ہی درپیش آتے ہیں کیونکہ جس کے پاس ایمان کی دولت نہ ہو وہاں چور (خطرہ) کیسے آسکتا ہے۔

فنا فی الشیخ کا معاملہ اگر ذہن نشین کرنا مطلوب ہو تو اس کے لئے مقام فنا کے فلسفے کو سمجھنا ضروری ہے۔ مقام فنا کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص اگر آفتاب الٰہی کے سامنے گیا تو وہ اس طرح محو (گم) ہو جاتا ہے جیسے آفتاب کے سامنے کسی چیز کا سایہ گم ہو جاتا ہے اور جب وہ سورج کی اوٹ میں چلا جائے تو اس کا سایہ پھر وجود پکڑ لیتا ہے۔ اس طرح بندہ کئی بار مقام فنا میں جاکر معدوم ہوتا ہے اور پھر موجود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب صوفی شیخ سے رابطہ قائم کر لے تو وہ شیخ کی ذات کے توسط سے اللہ کے قریب ہونے کے باعث محو ہو جاتا ہے اور اس حالت میں اس کے اپنے اوصاف گم ہو جاتے ہیں (عین اس طرح جس طرح کسی چیز کا سایہ سورج کے سامنے گم ہو جاتا ہے) اور جب وہ تصور شیخ سے الگ ہوا تو (سورج کی اوٹ میں آنے والی چیزوں کی طرح) سایہ پھر نمودار ہو جاتا ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ دیگر سائنسی وجوہات کے علاوہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ وقت قربِ الٰہی سے منور رہتے تھے اس لئے بھی ان کے جسم مبارک کا سایہ قطعاً موجود نہ تھا۔

اگر کوئی مرید فنافی الشیخ کا درجہ رکھتا ہے تو اس سے بہت جلد فائدہ ہوتا ہے اور مرید جلد واصل باللہ ہو جاتا ہے کیونکہ پیشوا کے تصور سے کمالات اور تجلیات جو پیشوا پر بالاَصَالَۃ (اصلی، نسبتی، حقیقی) وارد ہوتی ہیں وہ شیخ سے محبت کے باعث بالتبع مرید پر وارد ہونے لگتی ہیں اور پیشوا کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی بھی ترقی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ تصور کو یہاں تک پکانا چاہئے کہ مرید کی تمام حرکات.و.سکنات، نشست.و.برخواست غرضیکہ مرید کے ہر فعل میں پیشوا کی ادائیں آجائیں اور آخر کار اس کی صورت پیشوا کی صورت کے مشابہ ہو جائے۔ اس طرح کرنے سے اس کی آئندہ منزلیں بھی آسان ہو جاتی ہیں۔ حضرت توکل شاہ صاحب" فرماتے ہیں کہ مرشد مریدوں کی طرف توجہ کریں تو کبھی مرید کو اس کا علم ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواب یا بیداری میں کوئی مرشد کسی مرید کی طرف توجہ کرتا ہے یا مدد کرتا ہے تو اس کا علم کبھی مرشد کو ہوتا ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتا، کیونکہ ایسی حالت میں جب مرشد کو علم نہ ہو تو اس وقت اس کی روح وہ کام انجام دیتی ہے جو مرشد کے ارادے میں آجائے۔ اس حالت میں مرشد کا لطیفہ خود مرشد کی صورت اختیار کر کے مرید کے لطائف کو توجہ یا ہدایت کر دیتا ہے اور مرشد کو علم بھی نہیں ہوتا۔ ارواح سے افاضہ اور استفادہ یقیناً جاری ہے۔ حضرت توکل شاہ صاحب" فرماتے ہیں کہ ایک روز فقیر مراقبہ میں مشغول تھا تو یہ دیکھا کہ ایک شخص کی روح، جو سینکڑوں میلوں کے فاصلے پر تھی، فقیر سے اس قدر فیض لے رہی تھی کہ فقیر تقریباً خالی ہوا جا رہا تھا۔ مگر فیض الٰہی لامتناہی ہوتا ہے۔ اس سے خدا کا بندہ خالی نہیں ہوتا۔ آپ نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ شخص آپ کا ہی مرید تھا۔ فرماتے ہیں کہ سالک جس شغل یا ذکر کی کثرت اپنی زندگی میں کرتا ہے انتقال کے بعد بھی وہ جاری رہتا ہے۔

حضرت توکل شاہ صاحب" کا قول ہے کہ کثرت سے درود شریف پڑھنے والے شخص کے فیض کو کوئی فقیر سلب نہیں کر سکتا۔ اگر کسی کا فیض سلب ہو جائے تو سالک کو چاہئے کہ اپنے قلب کو اپنے پیشوا کے قلب کے نیچے رکھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب سے آپ کا فیض بتوسط مرشد حاصل کرے۔ اس طریقے سے فیض واپس آجائے گا۔ اگر سالک چاہے کہ اپنا وہی فیض واپس لے تو اپنے قلب کے پیچھے اپنے مرشد کا قلب اور اس کے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب تصور کرتے ہوئے درود شریف پڑھے اور کشش کرے ایسا کرنے سے وہی فیض بعینہٖ واپس آجائے گا۔ فرماتے ہیں کہ جو شخص فیض دیتے دیتے فوت ہوا تو اس کی قبر سے اس کے مرنے کے بعد بھی فیض ملتا رہے گا اور جو شخص فیض لیتا لیتا مرے اور اس کے مرنے کے بعد اگر اس کی قبر پر کوئی شخص جائے تو وہ اس سے بھی فیض لینا شروع کر دے گا۔

توجہ شیخ کس طرح اثر انداز ہوتی ہے

جب شیخ کسی کی طرف توجہ کرتا ہے تو Emotional Energy (جذبات کی حساس توانائی) کی لہریں شیخ کے جسم سے خارج ہوتی ہیں اور مرید پر اثر انداز ہو کر اس میں ایسے تغیرات پیدا کر دیتی ہیں جن کو شیخ اپنے مرید پر وارد کرنا چاہتا ہے۔ ان لہروں سے مریدوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی آج کل قوت ارادی سے بڑے بڑے کارنامے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں اور ماڈرن سائنس ان لہروں سے فائدہ حاصل ہونے کا باقاعدہ اقرار کرتی ہے. اگرچہ مسلمانوں کے کچھ لوگ تصرف شیوخ کا انکار کرتے ہیں۔

حضرات القدس (ص ۳۶۱) میں ہے کہ حضرت مجدد علیہ الرحمہ کے خلیفہ حضرت بدیع الدینؒ کا ذہن ان کی اوائل عمری میں عشق مجازی کی طرف مائل تھا اور نماز و روزہ کی نصیحت ان پر اثر نہ کرتی تھی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ان سے یہ فرمایا جاؤ وضو تازہ کر کے دو نفل ادا کرو۔ پھر ان کو خلوت میں لے گئے اور ذکر قلبی کی تعلیم دی اور توجہ فرمائی جس کے باعث وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے اور زمین پر لوٹنے لگے۔ بہت دیر کے بعد جب ہوش آیا تو ان کی کیفیت بالکل بدل چکی تھی اور بالاخر وہ واردات، مقامات اور درجات کمال و تکمیل سے مشرف ہوئے اور خلعت خلافت حاصل کر کے سہارنپور چلے گئے

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مذکورہ بالا خلیفہ بدیع الدین فرماتے ہیں کہ وہ برہان پور میں ایک بزرگ شیخ عیسیٰ جنداللہ نامی، جو حضرت قاسم سندھی کے بیٹے تھے کے پاس آیا جایا کرتے تھے کچھ دنوں کے بعد جب میں ان کی روحانیت سے متاثر ہوا تو ایک دن میں نے ان سے بیعت کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے مجھے ذکر کی تلقین شروع کی۔ حضرت بدیع الدین فرماتے ہیں کہ اسی وقت یکایک میں نے حضرت مجددؒ کو اپنی آنکھوں کے سامنے موجود دیکھا۔ انہوں نے غضبناک ہو کر میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا اور اس کا نشان میرے چہرے پر ظاہر ہوا۔ جو کچھ میں نے دیکھا وہ شیخ نے بھی دیکھا اور دہشت کے باعث وہ کانپنے لگے۔ انہوں نے فرمایا کہ جب تمہارے پیر اس قدر کامل ہیں تو پھر تم کیوں دوسری جگہ بیعت کرنے کا ارادہ کرتے ہو۔ پھر فرمایا جاؤ اور اپنے پیر کے طریقے سے ذکر کرو اور اپنے ساتھ مجھے بھی کسی بلا میں شریک نہ کرو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق قرآن میں ذکر آیا ہے کہ اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے تو شاید عزیز مصر کی بیوی کا قصد کرتے، لیکن جب آپ نے اپنے والد یعقوب علیہ السلام کی طرف سے باتصرف اشارہ پایا (جس کے لئے قرآن میں لَوْلَآ اَنْ رَّاٰبُرْهَانَ رَبِّهٖ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں) تو آپ فوراً اس کمرے سے بھاگ نکلے۔ مشائخ کس طرح اپنے متعلقین پر اثر انداز ہوتے ہیں اس سلسلے میں کلام بہت طویل ہے لیکن ان چند مثالوں پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔

توجہ اعتدال سے بڑھ جائے تو فقیر مجذوب ہو جاتا ہے

فقر میں قدم رکھنے والوں پر لازم ہے کہ جو کام کریں استقامت کے ساتھ کریں۔ ایک استقامت سو کرامتوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ جب تک سالک واصل باللہ نہ ہو جائے اسے کسی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہئے۔ اہل فقر پر صبر حرام ہے اور انہیں اپنے کام میں حرص کرنا فرض ہے۔ صبر اس لئے حرام ہے کہ سالک ایک جگہ یا ایک مقام پر نہ ٹھہرے اور ایک تجلی پر بھی نہ رکا رہے۔ خدا کے دیدار کی طمع اور حرص بڑھتی رہنا چاہے۔ جس طرح دنیادار مال و دولت کے لئے سخت حریص ہوتے ہیں اسی طرح سالک کو ذکر، فکر، مراقبہ اور عبادات کے لئے حرص کو بڑھاتے رہنا چاہے۔

توجہ میں تجلّیات وارد ہوتی رہتی ہیں اور توجہ سے پیدا شدہ جذب اگر اعتدال پر ہو تو سالک پر صحو یا بسط کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اگر سالک پر تجلیات کا ورود زیادہ ہو جائے یا قبل از وقت ہو جائے جو سالک کے ظرف (برداشت) سے زیادہ ہو تو ایسا سالک مجذوب ہو جاتا ہے اور اگر جذب کم ہو تو قبض کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ مجذوب کا درجہ عموماً سالک اور اہل صحو سے بہت کم ہوتا ہے۔ مجذوب خواہ کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو جائے ولایتِ صغریٰ میں ہی رہتا ہے اور کوشش کے باوجود ولایت کبریٰ تک نہیں پہنچ سکتا۔ صوفیہ کا خیال ہے کہ وہ مجذوب جو جان بوجھ کر مجذوب نہ بنا ہوا ہو، اس کی توجہ بڑی تیزی سے اثرانداز ہوتی ہے۔ وہ ایک توجہ میں ہی دوسرے کو اپنے مقام تک پہنچا دیتا ہے مگر خود سے زیادہ درجے پر نہیں پہنچا سکتا۔ بعض مجذوب کسی ایسے شخص کو جس کی موت کا وقت آچکا ہو، اپنی زندگی قربان کر کے اس کی جان بچالیتے ہیں (ایسا ہونا روایات میں ملتا ہے۔)

توجہ کی مختلف انواع

اولیائے کرام اکثر اوقات استغراق اور بے خودی میں رہتے ہیں مگر انبیائے کرام کو ایسی قدرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ متوجہ الی الخلوق ہو کر بھی کامل طور پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ واصل رہتے ہیں جب کہ اولیائے کرام اللہ کی طرف متوجہ ہوں تو مخلوق سے کٹ جاتے ہیں۔ بعض اولیائے کرام کو ہمہ وقت اللہ سے واصل رہنے کی طاقت حاصل ہوتی ہے اور اگر ایک لمحہ کے لئے بھی خدا سے غافل ہو جائیں تو خود کو مرتد سمجھتے ہیں اور کچھ اولیائے کبار ایسے بھی ہوتے ہیں جو عین دنیا کے ساتھ تعلق رکھنے کے باوجود بھی اللہ سے غافل نہیں ہوتے۔ کچھ اولیائے کرام ایسے بھی ہوتے ہیں جو بشری لوازمات کو پورا کرنے کی حالت میں خدا سے غافل نہیں ہوتے مگر ایسے اولیاء شاذ و نادر ہی ہوا کرتے ہیں۔

جب اولیائے کرام کا دل کثرت توجہ یا درود خوانی کے ذریعے کھل جائے تو اپنے دل سے انہیں خوشبو آتی ہے۔ خانہ کعبہ میں تجلیات کا ورود ہوتا ہے اور حقیقتاً حقیقت کعبہ ہی مسجود

الیہ ہے نہ کہ خانہ کعبہ کی دیواریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کعبہ بھی یہی تجلیات تھیں کیونکہ کعبہ کے احاطہ کو سمتِ استقبال (جس کی طرف منہ کیا جائے) حاصل ہے اور یہ تجلیاتِ اللہ کی ذات کے انوار کے ہی تو پردے ہیں جس کو حقیقتِ کعبہ کہتے ہیں اور ان تجلیات پر حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم عاشق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اول سے ہی اس کعبہ سے محبت تھی اور آپ کی اس محبت کے موافق کعبہ کو قبلہ ہونے کا شرف ملا۔

فقہاء کا خیال ہے کہ وہ خاک مبارک جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد مبارک کے ساتھ ملحق ہے وہ عرش اعظم سے بھی بزرگ تر ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ مرقد مبارک کی خاکِ پاک کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت بابرکت سے وہ تجلیات حاصل ہیں جس میں حیات و معرفت کے انوار موجود ہیں اور اس خاک پاک میں بھی وہ حیات و معرفت آگئی جو عرش معلیٰ کو بھی حاصل نہیں۔ اس معرفت والی حیات کے حصول کی ایک اور مثال ستون حنانہ میں بھی موجود ہے کیونکہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل کر لی تھی، لہٰذا ان کی جدائی پر رویا تھا۔ سورہ الذّٰریٰت کی آیت ۵۶ میں فرمایا گیا ہے کہ انسانوں اور جنوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہاں عبادت سے مراد تسبیح اور تہلیل نہیں بلکہ معرفت والی عبادت ہے۔ کسی کے روحانی مراتب کا مدار قرب پر ہے اور قرب میں تجلیات کا حصول مقصود ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو انہی تجلیات کے حصول کے لئے پیدا فرمایا جس سے معرفت حاصل ہو۔

بعض اوقات ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی صاحب نسبت بزرگ کسی پر اپنی توجہ والی نگاہ ڈالے تو جو بھی ان کے سامنے آتا ہے ان کی توجہ کے جلال کو برداشت نہ کرنے کے باعث زمین پر لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ یکدم بیس پچیس آدمی ایسے زمین پر لوٹتے ہیں جیسے نیم بسمل زمین پر تڑپ رہے ہوں۔ کچھ لوگوں پر تو وجد اور حال صرف معمولی توجہ سے ہی وارد ہو جاتا ہے جب کہ کچھ لوگ سخت نوعیت کی توجہ کو بھی برداشت کر لیتے ہیں اور یہ سب کچھ توجہ حاصل کرنے والے کے ظرف پر انحصار کرتا ہے۔ کم ظرف سالکین کو اگر ان کی برداشت سے زیادہ توجہ دی جائے تو وہ برداشت نہیں کر سکتے اور اس طرح وفورِ توجہ سے وہ مجذوب ہو جاتے ہیں۔

اولیائے کرام کی توجّہ دینے اور لینے کے انداز

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی توجہ دینا چاہے تو اسے چاہئے کہ اپنے قلب پر "ھُو" کی ضرب لگائے اور اس کی طرف پھینکی جائے جس کو توجہ دینا مقصود ہو اور اسی شخص سے اگر توجہ لینا مقصود ہو تو اس شخص کی طرف جانے والے لفظ "ھُو" کو دوبارہ اپنے سینے میں واپس لے جائے۔ بعض اوقات دو یا تین اولیائے کرام مل کر کسی کو توجہ دیتے ہیں اور اس کا اثر رونما ہوتا ہوا ملاحظہ کرتے ہیں۔ یہی توجہ لینے اور دینے کا سلسلہ دور کی مسافتوں سے متاثر نہیں ہوتا اور دور افتادہ لوگوں سے بھی

توجہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ کبھی کسی بزرگ سے توجہ لینے کے لئے اپنے شیخ کو بھی درمیان میں لے لیتے ہیں۔ اس توجہ کی وساطت سے ہی کچھ لوگ اولیائے کرام سے توجہ حاصل کر کے مشکل کاموں کو حل کرنے میں ان کی توجہ سے مدد لیتے ہیں۔ کچھ اولیائے کرام توجہ کے ذریعے ہی اپنا پیغام کسی کو پہنچا دیتے ہیں۔

اولیائے کرام سے ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ وہ خود نفی ہو کر جس کی طرف توجہ دیں اس کو بھی نفی کر دیتے ہیں۔ اگر کسی شخص پر محبت یا نفرت کی توجہ ڈالنا مقصود ہو تو پہلے اس محبت یا نفرت کے اثرات خود اپنے اوپر وارد کر لئے جاتے ہیں اور پھر اس شخص پر منتقل کر دیئے جاتے ہیں جس پر ان کا وارد کرنا مقصود ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص سینما دیکھنے کا زیادہ عادی ہو تو پہلے سینما کے لئے نفرت کے اثرات اپنے اوپر وارد کر کے اس شخص پر منتقل کر دیئے جائیں جس کے لئے سینما دیکھنے سے نفرت کروانا مقصود ہو۔ راقم الحروف کی ایک ہمشیرہ کو ایک دفعہ ایسی شکایت ہوئی کافی عرصہ سے اس کی نیند اچاٹ ہو گئی اور جب راقم الحروف نے نیند خود پر طاری کر کے اس ہمشیرہ پر منتقل کیا تو وہ تین دن تک اکثر اوقات نیند سے مغلوب رہنے لگی۔ ایسے ہی کبھی بیماریوں کو دور کرنے کے لئے توجہ دی جاتی ہے۔ توجہات منتقل کرنے کی تفصیل بہت طویل ہے لیکن جو کچھ بیان ہوا ہے اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

دنیا کی طرف توجہ دینے میں توجہ الی اللہ کا فقدان ہے

ہر انسان کے شعور میں توجہ کی ایک مخصوص سمت اور مقدار ہے۔ ایک طرف توجہ کرنے سے دوسری طرف توجہ ہٹ جاتی ہے۔ مثنوی دفتر (پنجم) میں لکھا ہے کہ کسی انسان کو پرکھنا ہو تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کی توجہ زیادہ تر کس طرف رہتی ہے۔ اگر کوئی انسان دنیا کے کاموں کی فکر اور سوچ بچار میں لگا رہے تو بالآخر وہ عقبیٰ سے غافل ہو جائے گا اور اگر دنیا کی فکر سے بچے گا تو آخرت کی فکر میں لگا رہے گا۔ یہ عام فہم بات ہے کہ جب کسی پودے کو پانی نہیں ملتا تو وہ سوکھ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر روح کو اس کی غذا (عبادت) نہ ملے تو وہ سوکھ جائے گی اور اگر کوئی خاردار جھاڑیوں کو پانی دے تو ان بیکار جھاڑیوں کی نشو و نما ہو گی۔ عقل کی بات تو یہ ہے کہ انسان پھلدار پودوں کو پانی دے اور کانٹوں والی جھاڑیوں کو پانی نہ دے۔ لہٰذا انسان کو روح انسانی کی آبیاری کرنا چاہئے نہ کہ روح حیوانی (یعنی نفسانی خواہشات) کی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ دنیا کے مخمصوں کو جسم تک محدود رکھو، قلب تک نہ پہنچنے دو۔ ہر چیز کو اپنی جگہ پر رکھو۔ سرمہ آنکھوں کے لئے ہوتا ہے نہ کہ کانوں پر لگانے کے لئے۔ دل کا کام جسم

سے لینا مناسب نہیں۔ مجاہدے اس وقت تک ہی ہوتے ہیں جب تک انسان مجسم روح اور قلب نہ بن جائے۔ مولانا روم ؒ فرماتے ہیں کہ اگر تو مجسم جسم ہے تو مجاہدوں کو اختیار کر۔ ایسے شخص کے لئے راحت طلبی مضر ہے۔ انسان کا جسم دوزخ کا ایندھن ہے اور روح سدرۃ المنتہٰی کی شاخ ہے۔ جسم دوزخ کے ایندھن کی طرح ہے کہ جس کا لقب ابو لہب کی بیوی کی طرح ہے اور روح عالم بالا کی چیز ہے۔ مال و دولت کی تلاش کے بجائے استغنا کی تلاش کی جائے۔ یہ مقصود اعظم کو حاصل کرنے کے برابر ہو گا۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصِل؟ — نہ زورِ حیدری ؓ تجھ میں نہ اِستغنائے سلمانی ؓ

نہ ڈھونڈ اِس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں — کہ پایا میں نے اِستغنا میں معراجِ مسلمانی

ربط کیسے قائم کیا جائے؟

رابطۂ شیخ کے مفہوم اور متعلقات کو ذہن نشین کرنے کے بعد ایک سالک کے لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ شیخ کے ساتھ ربط کیسے قائم کیا جا سکتا ہے۔ رابطہ شیخ پر عملی طور پر تربیت دینا تو شیخ کی صحبت کے دوران حاصل ہونے والے لوازمات میں شامل ہے لیکن سالکین کو علمی سطح پر کچھ معلومات فراہم کرنے کے لئے اس جگہ چند نکات بیان کئے جا رہے ہیں جس کے باعث رابطہ قائم کرنے میں پیش رفت ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کی تحریر کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ سالکین راہ طریقت کو طریق رابطہ کی علمی بنیادوں پر قائم کر دیا جائے تاکہ عملی اقدام اٹھاتے وقت انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

ربط حاصل کرنے کا طریقہ (شیخ کی طرف سے اعانت ضروری ہے)

راقم الحروف کی مختلف تصانیف (مثلاً بیعت کی تشکیل اور تربیت، حضور قلب وغیرہ) میں اور زیر نظر کتاب میں بھی افادیت شیخ پر کافی تفصیل فراہم کر دی گئی ہے لیکن اس جگہ صرف یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ جب تک سالک کے ذہن میں اپنے شیخ کی ہستی کی اہمیت کا علم نہ ہو اس وقت تک وہ اپنے شیخ سے رابطے کا طریقہ کس طرح استوار کر سکے گا۔ مکتوبات شریف میں مراقبہ کی تعلیم دیتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ مراقب ہونے سے پہلے لازم ہے کہ سالک اپنے قبلہ توجہ کو ہر طرف سے ہٹا کر "کلیۃً" اس طریقہ عالیہ کے بلند مرتبہ اکابرین کی طرف کرے اور ان سے ہمت اور توجہ طلب کرے۔ فرماتے ہیں کہ اگر بوقت ذکر بے تکلف پیر کی صورت ظاہر ہو تو اسے بھی دل میں لے جائے اور دل میں بٹھا کر ذکر کرے۔ تم جانتے ہو کہ پیر کیسی ہستی ہے؟ پیر وہ ذات ہے کہ جناب قدس خداوندی جل شانہ تک پہنچنے کے راستے میں تم اس سے استفادہ کرتے ہو اور اس سے اس راہ میں طرح طرح کی مدد و اعانت حاصل کرتے ہو۔

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ یہ بات درست ہے کہ سالک اپنے شیخ کا کرتہ بطور تبرک اپنے پاس رکھے اور اس کے ساتھ اعتقاد اور اخلاص سے زندگی گزارے۔ شیخ کے کرتے کو پاس رکھنے میں ثمرات اور نتائج کا قوی احتمال ہے۔ ایک اور جگہ پر آپ فرماتے ہیں کہ یہ بات مشائخ کے علم میں یقین کے ساتھ آچکی ہے کہ جب مرید کو شیخ کی مدد کی ضرورت ہو تو شیخ کی روح وہاں اس کی مدد کے

لئے حاضر ہو جاتی ہے خواہ مرید کو اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ وہ بیک وقت کئی مقامات پر پہنچ سکتا ہے۔ شیخ کے

ساتھ محبت اور رابطہ کو استوار کرنے کے لئے دیگر بہت سے بزرگوں کی تحریریں بھی موجود ہیں لیکن اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے صرف مولانا روم ؒ کے چند اشعار پر کفایت کی جا رہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔ اگرچہ تمہارا دل تم کو نفس کی اتباع اور دنیا کی محبت کے لئے ہر وقت کھینچتا رہتا ہے لیکن تم بدن کی خواہش کو پورا نہ کرو اور روشن خورشید (انوار الٰہی) کی طرف اپنے آپ کو لاؤ۔ تمہارا روشنی کی طرف آنا کسی راز داں اور راہبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

دل ترا سوئے اہلِ دل کشد — تن ترا در حبسِ آب و گِل کشد

(تمہارا دل تمہیں اہل دل کے کوچے کی طرف کھینچ رہا ہے۔ لیکن جسم تم کو علائق دنیا کی طرف کھینچتا ہے)

کوئے نو میدی مرو امید ہاست — سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

(ناامیدی کے کوچے میں نہ جا، امیدوں کے راستے کھلے ہیں۔ تاریکی کی طرف مت جاؤ (ہدایت کے) سورج (چمک رہے) ہیں)

ہیں غذائے دل بدہ از ہمدمے — رو بجو اقبال را از مُقبلے

(ہوشیار باش! دل کی غذا کسی ہمدم لے لو۔ جاؤ کسی اقبال والے سے اقبال تلاش کرو)

دست زن در ذیل صاحب دولتے — تا زافعالش بیابی رفعتے

(کسی صاحب دولت کا دامن پکڑو، تاکہ اس کی بزرگی کی بدولت تم سربلندی حاصل کر سکو)

صحبتِ صالح ترا صالح کند — صحبتِ طالح ترا طالح کند

(نیک کی صحبت تجھے نیک کر دیتی ہے۔ بدبخت کی صحبت تجھے بدبخت کر دیتی ہے)

اللہ سے رابطہ بزرگوں کی صحبت اور لگاؤ سے ہی ممکن ہے

صوفیا کا قول ہے کہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کچھ نہ دینا چاہئے تو وہ اس چیز کی چاہت اور طلب ہی اس کے دل کو عطا نہیں فرماتا (اگر نہ خواستے داد. نہ دادے خواست)

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ دولت طلب کے حصول کو نعمت عظمیٰ خیال کرنا چاہئے اور جو کچھ اس کے خلاف ہے اس سے پرہیز کرنا چاہئے، تاکہ اس طلب کی راہ میں سستی آنے نہ پائے اور اس حرارت میں ٹھنڈک اثر نہ کر جائے۔ اس دولت کے ملنے پر شکر کرے اور اپنی طلب پر قائم رہے۔ شوق و درد کی یہ حفاظت شیخ کامل مکمل کی خدمت میں پہنچنے کے وقت تک ہے۔ اس کی خدمت اقدس میں پہنچنے کے بعد اپنی تمام مرادیں اس کے حوالے کر دے۔ جس طرح میت غسال کے

ہاتھ میں ہوتی ہے۔

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ نقشبندی سلسلہ میں طریقت کا دار و مدار صحبت پر ہے۔ فناء اول، فنائی الشیخ ہے پھر یہی فناء، فنائی اللہ کا ذریعہ اور وسیلہ بن جاتی ہے۔ اس راہ کے اوائل میں طالب کو اپنی کمینگی کے باعث اللہ تعالیٰ سے مناسبت نہیں ہوتی، لہٰذا اسے ایسا واسطہ یا برزخ درکار ہوتا ہے جس کا تعلق اللہ سے بھی ہو اور مرید سے بھی۔ ایسا برزخ شیخ کامل کی ذات ہی ہوتی ہے۔ وہ شیخ جس نے سلوک اور جذبے کا کام مکمل نہیں کیا اس کی طرف رجوع کرنا مرید کے لئے مہلک مرض ثابت ہوتا ہے اور طالب کو بلندی کے بجائے پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ طبیب حاذق کے پاس اگر کوئی طبیب ناقص کا مریض آجائے تو وہ پہلے ناقص طبیب کے علاج کا اثر زائل کرے گا اور اصل مرض کا علاج اس کے بعد ہی کیا جاتا ہے۔

رابطے کے حصول کے بغیر مطلوب (یعنی وصل الٰہی) کا حصول مشکل اور دشوار امر ہے۔ حالات اگر پیر کو لکھ کر بھیج دیئے جائیں تو اس کے جواب ملنے سے اخلاص و عقیدت کا سلسلہ ہر وقت حرکت میں رہتا ہے۔ ایک مکتوب شریف (نمبر ۱۸۷، حصہ سوم، دفتر اول) میں فرماتے ہیں کہ طریق رابطہ مقصود تک پہنچانے والے تمام راستوں میں سب سے زیادہ قریب ہے اور رابطہ مرید کے لئے ذکر الٰہی کرنے سے بھی زیادہ نافع ہے۔ خواجہ احرار قدس سرہ تعالیٰ نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے۔

"سایۂ رہبر بہ است از ذکرِ حق"

یعنی پیر کا سایہ ذکر حق سے بھی بہتر ہے۔ فرماتے ہیں کہ زیادہ بہتر کہنا نفع کے اعتبار سے ہے کیونکہ مرید کو اس وقت تک (یعنی ابتداء میں) مذکور (یعنی اللہ تعالیٰ) کے ساتھ مناسبت نہیں ہوتی. لہٰذا رابطہ شیخ حاصل کرنے کے بعد اسے ذکر سے جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ عمومی ذکر کے ساتھ ممکن نہیں۔ صحبت کی اہمیت. فوائد اور کمالات کے بارے راقم الحروف کی دوسری کتابوں ("بیعت کی تشکیل اور تربیت" کے علاوہ "اسلام اور روحانیت") میں ضرورت بیعت اور بیعت پر مشائخ عظام کے استدلال پر کافی تفصیل شامل کر دی گئی ہے لہٰذا یہاں اس موضوع کو طوالت سے تحریر کرنا مناسب نہیں۔

انسانی وجود لباسِ غیر ہے، کامیاب ربط کے لئے اسے ہٹانا ہوگا

انسان کا جسم اس کی روح کا خاکی لباس ہے اور صوفیا اس کو لباس غیر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ غیر اس لئے کہا جاتا ہے کہ انسان کی اصل تو روح ہے اور جسد خاکی کے لباس میں اس کو اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ انسان کے نزول دنیا کا قصہ بہت طوالت طلب ہے اور اس کا مختصر بیان ہماری کتاب

"نشان منزل" میں تخلیق آدم کے باب میں کیا جا چکا ہے۔ اس کی مزید روحانی تفصیل کتب تصوف میں موجود ہے۔ زیادہ تفصیل کو یہاں شامل کرنا اس کتاب کے احاطے سے باہر ہو گا، البتہ اس قدر بیان کر دینا ضروری ہے کہ جب تک انسانی لباس کی کثافت دور نہ کی جائے اس وقت تک ربط کامل کا حصول ممکن نہیں۔

علامہ اقبال" انسان کے نزول دنیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بانگ درا کی نظم "شمع" میں فرماتے ہیں کہ جب انسان کو نزول دنیا پر روانہ کیا گیا تو وہ شام جس میں اسے وطن سے فراق ہوا وہی شام اس کی اس دنیا میں نمود کی ابتدا تھی۔ انسان قفس عنصری میں آنے سے پہلے اپنے وطن میں آزاد تھا اور کوہ طور پر جا کر اللہ تعالیٰ کی تجلیات حاصل کرنے کی بجائے وہ ہمہ وقت انوار الٰہی کے مزے لوٹتا تھا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ لباس غیر میں انسان قیدی ہے اور چند سالوں کے بعد اسے پھر اپنے وطن (یعنی بہشت) میں جانا ہے مگر وہ اس غربت (مسافری) کے عالم میں مسرور اور شاداں ہے کیونکہ اس دنیا کو ہی جنت مکان سمجھتا ہے اور خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان اس جسد خاکی کے نقاب کو ہٹا کر ہی ربط الٰہی قائم کر سکتا ہے۔ ؎

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی شامِ فراق، صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا زیبِ درختِ طُور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

حضرت عبدالعزیز دباغ نے خزینۂ معارف (ابریز) میں ایک بہت طویل مضمون لکھوایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی روح اور جسم کے درمیان ایک پردہ ہے، جو عبادات اور روحانی عملیات سے اٹھ جاتا ہے اور اس پردے کے اٹھ جانے سے اسے بہت سے مغیبات اور عالم ملکوت پر اطلاع حاصل ہو جاتی ہے۔ روح کے لئے یہ تمام مشاہدات حاصل کر لینا کوئی خاص مہم نہیں لیکن انسان ان چیزوں کا مشاہدہ اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک مذکورِ بالا حجاب نہ اٹھ جائے۔

علامہ اقبال" نے لباسِ غیر کے دنیاوی تقاضوں کو خودی کے طلسمِ رنگ و بو سے تشبیہ دی ہے اور فرمایا ہے کہ اس طلسم کو توڑ دینا ہی مقصودِ توحید ہے۔ آپ کے اس قول سے مراد یہ ہے کہ انسان نے اپنے وجود کی ضروریات کو بھی خدا تسلیم کر رکھا ہے اور اپنی نفسانی خواہشات کے حصول میں دن رات مشغول رہتا ہے۔ دنیا کے بتوں کی پوجا میں مصروف رہتے ہوئے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر عائد شدہ حقوق کی پروا نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا کہ ہم میں سے الاماشاء اللہ ہر ایک کی بغل میں کوئی نہ کوئی بت ضرور موجود رہتا ہے (ہر یکے دارد بتے اندر بغل) اصل توحید یہ ہے کہ پتھروں کے بتوں کی پوجا ترک کرنے کے ساتھ ساتھ خواہشات کے بتوں کی پوجا کو بھی ترک کیا جائے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ یہی خواہشات کا ترک ہی اصل توحید ہے جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا۔

خودی کے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں یہی توحید ہے جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عینِ فطرت ہے — کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا
نہ کر تقلید اے جبریل میرے سوز و مستی کی — تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

احادیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ چھوٹے سے چھوٹے شرک کو بھی پسند نہیں فرماتا۔ آجکل کے تنگ نظر علماء شرک سے مراد یہ لیتے ہیں کہ کسی پیر سے دعا کروائی جائے یا کسی کے نام پر کھانا کھلایا جائے تو یہ غیر اللہ ہے اور شرک میں شامل ہو جاتا ہے حالانکہ یہ شرک نہیں۔ پتھر کے بتوں کو تو آج کل غیر مذاہب والے بھی نہیں مانتے۔ محمد ذوقی نے "تربیت عشاق" میں، اور دیگر علماء نے لکھا ہے کہ ایسا شرک اب اٹھ چکا ہے چنانچہ اس کے متعلق بات کرنا لاحاصل ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک شرک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں جو بات شامل ہے وہ کسی اور کو دی جائے۔ مثلاً سونے چاندی کی محبت یا کسی حاکم سے خوف زدہ ہونا، حق بات کہتے ہوئے ڈرنا وغیرہ، لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان باتوں کو تو وہ شرک تصور نہیں کرتے اور فضول جھگڑوں میں الجھتے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہؒ نے فرمایا ہے کہ "یہی توحید ہے جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا" حضرت حسن بصریؒ کی ایک روایت میں ہے کہ نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ نمازی کے سامنے آجاتا ہے، لیکن ایک اور حدیث میں ہے کہ نمازی جب اپنے دل میں دنیاوی باتوں کی طرف دھیان کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے بندے کیا وہ چیز جسے تو سوچ رہا ہے مجھ سے بہتر ہے؟ اگر وہ نمازی اپنے خیالات کو اللہ کی طرف راغب نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں اور نمازی کی نماز میں خلل واقعہ ہو جاتا ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اگر خیال نماز سے ہٹ جائے تو یہ بھی شرک ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نمازی کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کرتا کہ نماز تو خدا کے لئے پڑھے اور کسی دوسرے کو اس میں شریک کیا جائے۔ ایسی باتیں اصلِ شرک ہیں۔

مذکور بالا اشعار میں اس بات کی عقدہ کشائی کی گئی ہے کہ توحید حقیقی یہی ہے کہ انسان اپنی خواہشات کے بتوں کو توڑے اور ایسی نگاہ پیدا کرے جس سے تجلیات الٰہیہ کا نظارہ کر سکے کیونکہ تجلیات الٰہیہ فطرتی طور پر انسان سے جدا نہیں ہوتیں۔ اس کے ثبوت میں وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح دریا اپنی موجوں سے بیگانہ نہیں رہ سکتا عین اسی طرح انسان کو بھی ان تجلیات کے سمندر سے بیگانہ نہیں رہنا چاہئے جو اس کے اندر ہی موجزن رہتی ہیں، جیسا کہ قرآن نے کہا ہے وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ٥ (اور تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں؟) آپ نے فرمایا کہ ان تجلیات کو دیکھنا انسان کا مدعا ہونا چاہئے۔ انسان ایک ایسی ہستی ہے کہ جو اگر اپنے اندر آشفتگی پیدا کر لے تو وہ اپنے اندر موجود ایک ایک ذرے کو صحرا بنانے کی استطاعت رکھتا ہے۔ انسان کے اندر ہر لمحے میں پیدا ہونے والے کیف میں ایک نئے جلوے کی آرزو موجود ہوتی ہے بشرطیکہ اس کا دل مضطرب اور سکون ناآشنا ہو۔ آرام سے بیٹھنا صوفی انسان کے لئے حرام تصور کیا جاتا ہے۔ اگر انسان کے دل میں عشق الٰہی کا ذوق موجود ہو تو وہ کامل تجلی پانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ انسان کو اپنے خدا کی تلاش رہتی ہے اور

یہ تمنا اسے صحراؤں اور عبادت گاہوں اور حیات کی رزم گاہوں میں لئے پھرتی ہے اور انسان کا یہ درد لا دوا اس کے لئے خدا کی تلاش کا متحمل ہو سکتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ انسان کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنا نکتہ چین پیدا کر لیا ہے کیونکہ جب بندے کو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل نہ ہو تو وہ خدا سے بھی لڑ جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ "بانگ درا" میں عارف ہرجائی کی نظم میں فرماتے ہیں۔ ؎

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے
مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے
مضطرب ہوں، دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں

بے نیازی سے ہے پیدا میری فطرت کا نیاز
سوز و سازِ جستجو مثلِ صبا رکھتا ہوں میں

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
آہ! وہ کاملِ تجلی مدعا رکھتا ہوں میں

جستجو کُل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حسن بے پایاں ہے، دردِ لادوا رکھتا ہوں میں

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں، اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں

ربط کی مراد کمالِ ترک سے ملتی ہے

ربطِ کامل کے حصول کے لئے باقاعدہ عبادات، ریاضات اور روحانی مشقوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پوری عمر عبادت میں گزر جانے کے بعد بھی رابطہ میسر نہیں ہوتا۔ جب تک عبادت کے مقاصد و اغراض اور مطالب کا صحیح علم نہ ہو اس وقت تک اس عبادت کے کمالات کماحقہٗ پیدا نہیں ہوتے۔ تکمیلِ روحانیت کا علم کسی شیخ کامل کی صحبت اور رہنمائی کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔

کمالاتِ روحانی حاصل کرنے کے لئے ترکِ لذت اور ترکِ دنیا کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ مگر دنیاوی اشیاء کا ترک اس وقت تک کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک سالک خاکی خصائل (جس سے اس کی تخلیق ہوئی ہے) اور خاکی اشیاء (یعنی کائنات کے گوشے گوشے) کی تسخیر نہ کر لے. لہٰذا اس وقت تک سالک خواہ کوئی عبادت یا ریاضت کرے وہ اپنا مقصود حاصل کرنے میں ناکام رہے گا، بلکہ اسی طرح جب تک پوری اشیاء یعنی اپنی روح اور روحانی دنیا کی بھی تسخیر نہ کی جائے اس وقت تک مسلمان مردِ کامل نہیں ہو سکتا اور وہ اپنے پیشِ نظر مقاصدِ دین میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

علامہ اقبالؒ اور دیگر مفکرین اسلام فرماتے ہیں کہ صوفی اور عارف باللہ عموماً ظہوراتِ غیبی کے منتظر رہتے ہیں یعنی ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ غیبی اشکال کا ظہور ان پر کھل جائے۔ فرماتے ہیں کہ غیبی اشکال کا مشاہدہ کرنا کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ جو شخص عمی طور پر مسلمانوں کا سا معیار رکھتا ہے اس کی دینداری، عبادت اور زہد بلکہ قرآن کی مختلف عبارات اس کی ولایت پر گواہی دیتی ہیں۔ کرامات اور مغیبات کا ظہور کسی کی بزرگی کی دلیل نہیں ہے۔ مغیبات کا مشاہدہ اس لئے بھی ضروری نہیں کہ جب ہم روزمرہ کی زندگی میں ذاتِ الٰہی کی تجلیات اور اس کی شان کو دیکھتے ہیں تو وہ ذاتِ الٰہی کے

وجود پر دلالت کرتی ہیں یعنی تجلّیات جو سب لوگ دیکھتے ہیں وہ کسی پوشیدہ ذات کے مستور ہونے کی وضاحت کرتی ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ صوفیاء کا سلوک اس غرض سے نہیں ہوتا کہ ہم غیبی صورتیں اور شکلیں مشاہدہ کریں اور نوروں اور رنگوں کا معائنہ کریں۔ اسی دنیا میں نظر آنے والی جتنی صورتیں ہم دیکھتے ہیں کیا یہ کوئی کم ہیں کہ کوئی غیبی صورتوں کی ہوس کرے۔ فرماتے ہیں کہ دنیا کی صورتوں میں عالم مثال کی نسبت انوار کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ سلوک سے مقصود یہ ہے کہ معتقدات شرعیہ میں یقین زیادہ ہو جائے تاکہ استدلال کی تنگی سے کشف کے میدان میں آجائیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

ع کمالِ ترک نہیں آب و گل سے مہجوری — کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری
فقیر و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور — کسے خبر کہ تجلی ہے عینِ مستوری

خدا سے ربط کرنا ہو تو پہلے اُسے راضی کر لو

اولیائے کرام کا یہ فرمان ہے کہ اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہئے کہ کیا خدا اس سے راضی ہے تو وہ پہلے یہ معلوم کرے کہ آیا وہ خود خدا سے راضی ہے یا نہیں۔ اگر بندہ خود خدا سے راضی ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جاتے ہیں۔ خدا سے اس طرح راضی ہونے کی علامت یہ ہے کہ ایسا شخص مامورات اسلام پر قائم ہوتا ہے اور مختلف فرائض اور محرکات میں اللہ تعالیٰ کی رضا کو ملحوظ خاطر رکھنے والا ہوتا ہے۔ مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

صوفیاء کا قول ہے کہ خدا اس وقت تک کسی کو ولی نہیں بناتا جب تک اسے ضروری علوم سے آگہی عطا نہ فرما دے۔ علمِ باطنی کے علاوہ علمِ ظاہری کے بغیر فقیری میں قدم رکھنا گمراہی ہے کیونکہ جو لوگ نماز، روزہ و دیگر ارکانِ اسلام کو ادا کریں، ان کے حقائق کو وارد کرتے ہوئے ان میں سیر کریں اور دیدار الٰہی میں مستغرق رہیں تو وہی لوگ فقر میں قدم رکھ سکتے ہیں۔

علمِ لدنی تو اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ جسے چاہے عطا کر دے۔ صوفیا کہتے ہیں کہ علم لدنی تو خدا کا ایک انعام ہے اور یہ انعام اسی کو ملتا ہے جو خدا کو راضی کر سکے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں سے راضی نہیں ہوتا۔ پس جس نے اسلام کے ارکان میں سے کسی کو ترک کیا اس سے خدا راضی نہیں ہوتا۔ سالک کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے اوامر اور نواہی (حلت و حرمت، جائز ناجائز، فرض، واجب، سنت، مستحب، حرام مکروہ تحریمی و مکروہ تنزیہی اور اسائت وغیرہ) کے علوم سے خوب واقفیت حاصل کر لے تو پھر ہی فقیری کے شرف سے مختص ہو سکتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جب وہ باعمل ہو کر اسم الٰہی کا ورد کرتے ہیں تو ملائکہ اور جنّات بلکہ پوری کائنات ان کی مطیع ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے تسخیر خلق اور تسخیر کائنات کا انعام دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو خدائے قدوس کو راضی نہیں کرتے وہ تو فقر کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے۔

روح کی تمنّا دیدارِ الٰہی ہے

معلوم ہونا چاہئے کہ روح کی غذا عبادت ہے اور عبادت کو روح کی غذا ہونے کا شرف محض اس لئے حاصل ہوا ہے کہ عبادت میں روح کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اس دنیا میں آنے سے قبل عالم ارواح میں روحوں کا اس کے سوا اور کوئی شغل نہ تھا کہ وہ ہمہ وقت اپنی توجہ کو اللہ کی طرف مرکوز رکھیں۔ دنیا میں آنے کے بعد روحوں کو دنیا کی آلائشوں میں الجھ جانے کے مواقع فراہم ہوئے اور روحوں کی اکثریت دنیا کے کام کاج میں اس قدر الجھنے لگی کہ توجہ الی اللہ بالکل مفقود ہو گئی۔ ایسی روحوں نے خدا کو بالکل فراموش کر دیا، جب کہ کچھ نیک روحیں اب بھی ایسی نظر آتی ہیں جو پہلے کی طرح دنیا میں بھی ہمہ وقت اپنی توجہ کو خدا کی طرف لگائے رہتی ہیں۔ ایسی روحیں اگر ایک لمحہ کے لئے بھی خدا کی یاد سے غافل ہو جائیں تو وہ خود کو مرتد اور بے دین تصور کرتی ہیں۔ علامہ اقبال جاوید نامہ میں (ص ۳۷۰ پر) فرماتے ہیں کہ اگرچہ روحوں کو اللہ کی بارگاہ میں دم مارنے کی جرات نہیں، تاہم روحوں پر یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے نیک روحوں کو اس دنیا میں یہ اجازت دے رکھی ہے کہ وہ ہمہ تن خدا کے ساتھ مشغول رہیں اور دیدار الٰہی کے سوا ان کا اور کوئی کام نہ ہو۔ علامہؒ فرماتے ہیں ؎

گرچہ آں جا جرأتِ گفتار نیست　　رُوح را کارے بجُز دِیدار نیست

(اگرچہ وہاں کسی کو بات کرنے کی جرأت نہیں مگر روح کو سوائے دیدارِ جمالِ الٰہی اور کوئی کام نہیں)

طریق رابطہ ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے انسان اللہ کے ساتھ ربط قائم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ کی یاد کے بغیر دلوں کو سکون اور اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا، چنانچہ وہ انسان جس نے اللہ کی یاد کے ساتھ اپنی روح کو وابستہ نہیں کیا وہ خواہ مال و دولت کے ڈھیر جمع کر لے، کبھی سکون حاصل نہ کر سکے گا۔ عشقِ الٰہی کے بغیر انسان کو چارہ نہیں۔ یہ وہ عشق ہے جو سرد نہیں پڑتا اور یہ وہ عشق ہے کہ جس کی دنیا میں رات نہیں آتی ہمیشہ دن ہی رہتا ہے۔ علامہ نے پیام مشرق میں

فرمایا ہے۔

روح را جز عشقِ اُو آرام نیست　　عشقِ اُو روزیست کو را شام نیست

(روح کو اللہ کے عشق کے بغیر سکون نہیں، اس کا عشق ایک ایسا روز ہے جس کی کوئی شام نہیں)

روحانی تعلیمات سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اگر انسان کا رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم نہ رہے تو اس کی روح اس کے بدن میں ایمان اور یقین کی کمزوری کے باعث صحت مند نہیں رہ سکتی بلکہ ایسے لوگ معنوی طور پر مردہ کہلاتے ہیں کیونکہ ان کے بدن میں روح مردہ حالت میں پائی جاتی ہے۔ ایسے لوگ اگرچہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں لیکن وہ اپنے کندھوں پر اپنی لاشیں اٹھائے پھرتے ہیں۔ علامہ اقبال" جاوید نامہ میں صفحہ ۱۱۶ پر فرماتے ہیں۔

روح درتن مردہ از ضعفِ یقیں　　نا امید از قوتِ دینِ متین

(ان کے بدن میں روح ضعفِ یقیں کے باعث مردہ ہو چکی ہے۔ ایسے لوگ دینِ متین سے حاصل ہونے والی قوت سے ناامید ہوتے ہیں۔)

ایں نواہا روح را بخشد ثبات　　گرمیٔ اُو از درونِ کائنات

(روح کو اس کی نوائیں یعنی عبادات سکون بخشتی ہیں۔ کیونکہ اس کو ضمیرِ کائنات سے حرارت ملتی ہے۔)

بہت کم لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام میں اپنی روح پھونکی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نور سے پیدا فرمایا۔ روایات میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک سے تمام کائنات کو پیدا فرمایا اور حضرت آدم علیہ السلام کی پیشانی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کے نور کو رکھا گیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے سجدہ کروایا گیا، جس سے مراد یہ تھی کہ یہ سجدہ اس نور کو ہی کیا گیا جو آدم علیہ السلام کی پیشانی میں نُوْرٌ مِنَ نُوْرِ اللہ (اللہ کے نور میں سے ایک نور) تھا۔ علامہ اقبال نے پیام مشرق میں "نوائے وقت" کی نظم میں اس حقیقت کو ظاہر کیا ہے کہ انسان کے بدن میں روحِ رواں (جو روح کل سے ظاہر ہوئی) کا سلسلہ جاری و ساری ہے اور جس کی نشاندہی قرآن میں " "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" " (آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸۵) سے ملتی ہے۔ اسی آیت قرآنی کے مطابق انسان کی یہ روح "امرِ رب" کہلاتی ہے۔ (" "وَاِذَا نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ" " سے بھی یہی مراد ہے)۔

درج ذیل شعر میں علامہ اقبال" فرماتے ہیں کہ چونکہ میری روحِ رواں (جو امر ربی کا شرف رکھتی ہے) پاک اور نورانی ہے اور اللہ کی ذات بے مثل و بے مثال کے نور سے ہے۔ (یعنی دوسرے معنوں میں مادی نہیں بلکہ حقیقی ہے) لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اندر ایک مخفی راز ہے (جس کا ثبوت لَایَسَعُنِیْ اَرْضِیْ وَلَاسَمَائِیْ وَلٰکِنْ یَسَعُنِیْ قَلْبُ عَبْدِ مُؤْمِنٍ سے ملتا

ہے۔) علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میں (یعنی انسان) بھی اللہ کے اندر مخفی رازوں میں سے ایک راز ہوں۔ اول الذکر حالت میں یعنی خدا کا بندے میں مخفی ہونا تو حدیث مذکورہ سے ظاہر ہوتا ہے، لیکن ذات خداوندی میں بندۂ مومن کا ایک راز ہونے کی صورت میں مخفی ہونا صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط قائم کر کے اس کی طرف فنائیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اسی مقام فنا کی تکمیل کے بعد بندہ ذات حق کے ساتھ بقا کی صفت حاصل کر لیتا ہے جیسے ہم حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مرشد کو "باقی باللہ" کہہ دیتے ہیں۔ یہ درجہ خدا کے ساتھ ربط حاصل کرنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ علامہؒ کا زیر غور شعر حسب ذیل ہے۔

چوں روحِ رواں پا کم از چند و چگونِ تو　　　　تو رازِ درونِ من، من راز درون تو

(میں امر ربی کی طرح یعنی جاری و ساری روح کی مانند پاک ہوں اور تیری حقیقت سے ہی ہوں۔ اس لئے تو میرے اندر ایک راز ہے اور میں تیرے اندر ایک راز ہوں)

رُویتِ قلب

دل کا حقائق ایمان کے ساتھ انوار یقین کے ذریعے غیب میں پوشیدہ اسرار کا دیکھنا رُویت قلب کہلاتا ہے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اللہ کو دیکھتے ہیں؟ تو فرمایا:۔ ہم اس کی عبادت کیوں کرتے ہیں اگر اسے دیکھتے نہیں۔ فرمایا اسے آنکھوں نے نہیں دیکھا بلکہ قلوب نے حقائقِ ایمان کے ساتھ دیکھا ہے۔ لغت کے اعتبار سے کسی چیز کو آنکھ سے دیکھنا، نہ کہ بصیرت سے معلوم کرنا رویت کہلاتا ہے، لیکن کچھ لوگ دل سے دیکھنے کو بھی رویت سے تعبیر کرتے ہیں جیسے کہ حضرت منصورؒ نے فرمایا۔

رَاَیتُ رَبِّیْ بِعَینِ قَلبِی　　　　فَقُلتُ مَنْ اَنَا، قَالَ اَنَا اَنْتَ

(میں نے اپنے رب کو دل کی آنکھ سے دیکھا　　پھر میں نے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ تو کہا کہ میں تو ہوں)

رویت باری تعالیٰ ایک متنازع فیہ امر ہے۔ روئیت باری تعالیٰ کے متعلق انشاء اللہ "اسلام اور روحانیت" میں بھی ایک الگ باب میں بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف یہ کہہ دینا کافی ہو گا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار اس دنیا میں ممکن نہیں اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ممکن ہے، کیونکہ اگر محال ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے دیکھنے کا سوال ہی نہ کرتے۔ اگر دید محال یا ممتنع (ناممکن) ہوتی تو آپ ایک پیغمبر ہوتے ہوئے ایسا سوال نہ کرتے۔ جو لوگ دید الٰہی کو جائز مانتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اگرچہ آنکھیں اللہ کا ادراک نہیں کر سکتیں مگر اس آیت لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ میں رویت کی نفی نہیں بلکہ ادراک (یعنی احاطہ کر لینے) کی نفی ہے۔ اس کے علاوہ امام محمدؒ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رَاَیتُ رَبِّی (میں نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔)

حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھا۔ حضرت ابن عباسؓ کی ایک اور حدیث بروایت عکرمہؓ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ تعجب کرتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام کو خلت کا مقام ملا ہو، کلام کا شرف موسیٰ علیہ السلام کو ہو اور دیدار کی سعادت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہ ہو۔ امام مسلم نے حضرت ابوذرؓ سے روایت پیش کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سراپا نور ہے میں نے اسے دیکھا ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت حسن بصریؒ نے قسم کھائی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کا دیدار کیا۔ حضرت عائشہؓ اور دیگر کچھ اصحاب ان باتوں کی نفی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو نہیں دیکھا اور "لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ" کو اس کی سند بناتے ہیں۔ علامہ نوویؒ ان سب احادیث اور روایات کے مطالعے کے بعد استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا. اس معاملے میں آپ کا کلام طویل ہے لیکن حضرات طریقت اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کلام اس نہج پر ملتا ہے کہ اس دنیا میں اللہ کو آنکھوں سے نہیں دیکھا بلکہ قلوب نے حقائق ایمان سے دیکھا ہے۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (النجم-۱۱) یعنی دل نے جھوٹ نہ کہا، جو دیکھا) ۔ اس دیکھنے سے مراد یہی دیکھنا ہے کہ دنیا میں رویت باری تعالیٰ ممکن نہیں۔ المختصر اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار حق پر اختلاف ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ کی ذات کا دیدار کرنا زیادہ اغلب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر دیدار کا نہ ہونا مان لیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کا آپ کو معراج پر بلانے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ معراج پر بلانے کا مقصد ملاقات اور شرف زیارت عطا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

ہمیں صوفیائے کرام کا یہ قول ملتا ہے کہ جس طرح اللہ کی ذات انسانوں کے ادراک یا تصور میں نہیں آسکتی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات کا پوری طرح سمجھ میں آنا بھی ممکن نہیں. کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کے ظلال ہیں۔ صوفیائے کرام کا مسلک یہ ہے کہ قرآنی آیت "اُذْكُرُونِيْ" کے مطابق ہم اپنا زیادہ تر وقت خدا کی یاد میں صرف کریں تاکہ حکم اَذْكُرْكُمْ (البقرہ ۵۲) کے مطابق اللہ تعالیٰ تم کو اپنے کرم سے یاد کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر حصول احوال و مکاشفات کی غرض سے نہ کریں بلکہ بغیر کسی دنیاوی غرض کے ذکر اور بندگی میں مشغول رہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نور کو بسیط اور عریض (لمبا چوڑا یعنی محدود) نہ تصور کریں۔ اللہ تعالیٰ ایسا بسیط حقیقی ہے کہ اس میں بسط و طول و عرض اور کسی قسم کے تخیلات کی گنجائش نہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اللہ تعالیٰ کی رویت کے لئے اللہ تعالیٰ کے ظلال اور اصل الاصل ذات کو چشم بصیرت کے ساتھ دیدار کرنے کا ذکر مکتوبات شریف میں کیا ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ راقم الحروف کی کتاب "اسلام اور روحانیت" میں پیش کی جائے گی۔

انسان کی اصل غایت تو دید ہے، شنید اور تقلید نہیں

زندگی کے حقائق کا ادارک کرنا ہو تو اس کا ایک ذریعہ عقل و حکمت (یعنی استدلال) ہے اور دوسرا ذریعہ براہِ راست دید ہے، جسے کشفِ حقیقت یا روحانی وجدان کہتے ہیں، استدلالی حکمت انسان کو گھر کے آستانے تک تو لے جاتی ہے لیکن بیرونی حلقہ جات اور آفاق تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں   اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب   آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

یہ دل کا نور ہی تو ہے جو کسی دور و نزدیک اور لطیف و کثیف چیز سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ مولانا رومؒ بھی فرماتے ہیں کہ انسان کا مقصد شنید یا تقلید نہیں۔ یہ تو عام لوگوں کے لئے ہے۔ اللہ والوں کی غایت تو دید ہے۔ فرماتے ہیں ۔

آدمی دید است باقی پوست است   دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

(آدمی کی اصل تو بینائی ہے، باقی کھال یا پوست ہے اور دید وہ ہوتی ہے جو محبوب کی دید کرا دے)

اگر آدمی آنکھیں بند کر لے تو دنیا کی کوئی چیز اسے نظر نہ آئے گی، حالانکہ اس وقت چیزیں معدوم (غائب) نہیں ہوتیں۔ اسی طرح دل کی آنکھیں اگر بند ہوں تو مشاہدہ نہیں ہو گا اگرچہ وہ چیزیں جن کا مشاہدہ ہو سکتا ہے موجود ہوں۔ صوفیہ کے مطابق اگر آدمی حقیقت کا ادراک نہ کر سکے تو وہ آدمی کہلانے کا مستحق نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کے لئے جو اپنے محبوب کا دیدار نہ کر سکے اس کا اندھا ہو جانا ہی بہتر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ کسی شخص کا ایسا دوست ہو جو ہمیشہ رہنے والا نہ ہو (یعنی جس کا دوست خدا نہ ہو) اس کا انسانوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔

مثنوی کے حصہ اول میں مولانا فرماتے ہیں کہ مرشد دیکھتا ہے کہ اگر کوئی مرید استعداد رکھتا ہے تو وہ پاک بیج، پاک زمین میں بو دیتا ہے۔ مرشد کی توجہ سے مرید پر اسرار کھلنا شروع ہو جاتے ہیں اور وہ غیب کی چیزوں کا ملاحظہ کرنے لگتا ہے۔ حکیم بو علی سینا اپنے ایک دوست حضرت ابو الخیر ابو السعیدؒ سے ایک دن بہت دیر تک نہایت دقیق فلسفیانہ اور مدلل گفتگو کرتے رہے اور انہوں نے اپنی گفتگو سے یہ ظاہر کیا کہ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ حضرت ابو السعیدؒ ان کی طویل گفتگو سنتے رہے اور اس کے جواب میں آپ نے صرف یہ ایک فقرہ کہا "ہرچہ تو دانی، من می بینم" یعنی جو کچھ تو جانتا ہے میں اسے دیکھتا ہوں۔ حکمت اور رویت میں دانش اور بینش کا فرق ہے۔

مثنوی کے دفتر ششم میں مولانا فرماتے ہیں کہ جب کوئی کسی چیز میں فنا حاصل کر لیتا ہے تو وہ اس کے ساتھ ملحق ہو جاتا ہے لہٰذا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اللہ کی صفات میں فنا ہو چکے تھے اس لئے آپ کا قول، اللہ کا ہی قول سمجھا جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اللہ کا فرمان ہے۔ (دیکھئے سورہ نجم آیت نمبر ۳) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وابستگی جب بحرِ حقیقت سے تھی تو آپ کا

مقولہ اسی سمندر کا موتی تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ پوری اطاعت کے بعد انسانوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو جاتے ہیں تو پھر اس میں کیا تعجب ہے کہ کسی عارف کو فنائی الذات کا مرتبہ حاصل ہو جائے۔ یہ سارے کا سارا کلام ربط کامل پر دلالت کرتا ہے۔

خدا آشنائی انسان کی تخلیق کا مقصد ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں انسانوں اور جنوں کی تخلیق کا مقصد درج ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذّٰرِیٰت: ۵۶) — اور نہیں پیدا کیا میں نے جنّ اور انس کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔

مفسرین قرآن کا متفقہ خیال یہ ہے کہ یہاں لِيَعْبُدُوْنِ کا لفظ لِيَعْرِفُوْن کے معنوں میں استعمال ہوا ہے. لہٰذا عرفان ذات باری تعالیٰ انسان کی تخلیق کی غرض و غایت مانی جاتی ہے اور ہر انسان پر اللہ تعالیٰ کو حتی المقدور پہچاننا واجب ہے۔ جب انسان کی تخلیق کا منشا عرفان حق ہے تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر تھا کہ انسان میں ایسی خوبیوں، قدرتوں اور جبلتوں کو پیدا فرماتا جس سے انسان کے لئے عرفان حق کا مقصود حاصل ہو سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب انسان اپنی ان خوبیوں اور اوصاف کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس مقصد میں آسانی سے کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کو ماں کا دودھ مہیا کرنا اس کے خالق کے ذمہ کرم پر ہوتا ہے، یہ اس لئے کہ اس کو پیدا کرنے والی ذات اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ہے۔ اسی طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب انسان اپنے خالق کی تلاش میں لگ جائے تو وہ خالق اس کو مایوس نہیں کرتا اور خود بخود سامنے آجاتا ہے۔ جب وہ ایک بار اپنے خالق کو پکارتا ہے تو وہ فوراً کہتا ہے لَبَّيْكَ يَا عَبْدِىْ یعنی میرے بندے میں حاضر ہوں۔ خالق اور مخلوق کے اس رشتے کی گہرائیوں میں جانے کے لئے متعدد کتابیں تصنیف کرنے کی ضرورت ہوگی، مگر اس جگہ محض چند اشاروں پر کفایت کی جائے گی۔

قرآن اور حدیث کا سہارا لے کر اگر زیر بحث گفتگو کو ذرا سلجھانے کی کوشش کی جائے تو خیالات، نکات اور افکار کا ایک تلاطم خیز سمندر موجزن ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں زیر غور مسئلہ کو بیان کرنے کی غایت صرف یہ ہے کہ قارئین کے ذہنوں میں اس بات کا احساس پیدا کر دیا جائے کہ انسان کے اندر اس کے تخلیقی مقصد یعنی عرفان حق کی صلاحتیں موجود ہیں اور اس کے لئے یہ معلوم کرنا واجب ہے کہ وہ اپنے خدا کو کس طرح پہچاننے کی کوشش کر سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے قرآن و حدیث کی رو سے تخلیق انسان کے اس مقصد کی وضاحت کے لئے مسلمانوں کی راہنمائی کی ہے، لیکن آپ کا طویل کلام اس جگہ مجتمع نہیں کیا جا سکتا، البتہ چند ایک اشعار پر اکتفا کیا جا رہا ہے تاکہ ان کے کلام کا مفہوم واضح ہو جائے۔

فقہاء کا خیال ہے کہ انسان کی عقل مدت سے انسان کی حقیقت کی شناخت کرنے کے فلسفے میں الجھی ہوئی ہے اور ابھی تک وہ اس فلسفے کی راہ میں اٹھنے والے تمام سوالوں کا جواب نہیں دے سکی، جب کہ اسلام نے چند نکتوں میں ہی انسانی ذات سے متعلق تمام رازوں کو افشا کر دیا ہے۔ انسان کا تعلق جس گھر سے ہے اس کا ایک بڑا اہم کام عارفانہ مذاق ہے یعنی عرفان حق۔ اس اہم کام کو مذہب ہی سلجھا سکتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

غلط نگر ہے تیری چشمِ نیم باز اب تک ترا وجود ترے واسطے ہے راز اب تک

عقل مدت سے ہے اس پیچاک میں الجھی ہوئی روح کس جوہر سے، خاکِ تیرہ کس جوہر سے ہے
ارتباطِ حرف و معنی، اختلاطِ جان وتن جس طرح اخگر قباپوش، اپنی خاکستر میں ہے۔
(اخگر۔ چنگاری)

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ہے اس کا مذاق عارفانہ
وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا ہر قطرہ ہے بحرِ بے کرانہ

طریقِ رابطہ میں خلوت فکرِ انسانی کی قوتوں کو مجتمع کرتی ہے

ایک سالک کے لئے خلوت کا اختیار کرنا طریقت کی اہم ضروریات میں سے ہے۔ اس لئے اس کو ایک الگ عنوان سے "اسلام اور روحانیت" میں بیان کر دیا گیا ہے۔ سورۂ المزمل میں الآیہ "وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیلًا" (یعنی سب کچھ چھوڑ کر اللہ سے لو لگالینا) خلوت اور طریق رابطہ کی طرف ایک عمدہ اشارہ ہے۔ خلوت کے معنی ہی یہ ہیں کہ قلب کے حواس باطنی کو کھولنے کی غرض سے حواسِ ظاہری کو بند یا معطل کر لیا جائے۔ خلوت عرفان نفس کا ذریعہ ہے۔ شر و فساد کو ختم کرنے اور اصلاحِ نفس اور تعمیرِ سیرت کے ایسے انقلابی خیالات نے ہمیشہ خلوت میں ہی جنم لیا ہے۔ تنہائی سے ہماری فکری قوتیں مجتمع ہو جاتی ہیں اور یہ ہمیں باطنی طور پر ماحول اور کائناتی طاقتوں پر غالب آنا سکھاتی ہے۔ صوفیا نے اسی لئے خلوت در انجمن کو اختیار کیا ہے۔ دنیا کے لوگ جس اعصابی تناؤ میں الجھے ہوئے ہیں اس کا علاج خلوت در انجمن میں ہی مضمر ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے فارسی کلام میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کافی عرصہ غارِ حرا میں خلوت اختیار کی اور ہمارے لئے دین کی باریکیوں کا حل خدا نے ان کی خلوتوں میں عطا فرمایا۔

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید مدتے جز خویشتن کس را نہ دید
(محمد مصطفیٰ نے حرا میں خلوت اختیار کی اور ایک مدت تک اپنے سوا کسی کو نہ دیکھا)
نقشِ مارا در دلِ او ریختند ملّتے از خلوتش انگیختند
(آپ کے قلب میں ہمارا نقش ڈالا گیا آپ کی اس خلوت کی بدولت ملتِ اسلامیہ ابھاری گئی ہے)

رویتِ حق بقدرِ استطاعت ہوتی ہے۔

حضرت ابو طالب مکی نے قوت القلوب میں ایک روایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابو تراب نخشبی نے ایک عابد کو دیکھا تو اس کی عبادت کو دیکھ کر بہت تعجب کیا کہ یہ شخص بہت عبادت گزار ہے۔ حضرت ابو تراب اس عابد کو اپنے گھر لے آئے اور اس کی تمام ضروریات زندگی کو اپنے ذمہ لے لیا تاکہ یہ شخص ضروریات زندگی سے بے فکر ہو کر محوِ عبادت ہو سکے۔ رات کو ابو تراب اس عابد سے گفتگو کیا کرتے تھے اور ایک روز انہوں نے پوچھا کہ کیا تم نے بایزید بسطامی (جو اس وقت بقید حیات تھے) کو دیکھا ہے اس بزرگ نے کہا کہ نہیں۔ میں ایسی باتوں سے غافل ہو کر عبادت میں مشغول رہتا ہوں۔ کچھ دنوں بعد آپ نے پھر دریافت کیا اور ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ کاش تم ابو یزید کو دیکھتے۔ جب یہ تذکرہ متعدد بار ہو چکا تو اس بزرگ نے غصے کی جھلملاہٹ میں کہا "ترا ناس ہو! میں ابو یزید کو دیکھ کر کیا کروں گا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کو ستر بار دیکھا ہے۔ اس نے مجھے ابو یزید سے بے نیاز کر دیا ہے۔" ابو تراب فرماتے ہیں کہ اس کے اس کلام پر مجھے بھی طیش آگیا اور کہا "تیرا ناس ہو! اگر تو ابو یزید کو ایک بار دیکھتا تو یہ تیرے خدا کو ستر بار دیکھنے سے بہتر ہوتا" اس بزرگ نے پوچھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابو تراب نے فرمایا "ترا ناس ہو! تو اللہ کو جو دیکھتا ہے تو وہ تیرے جذب و احوال کی مقدار کے مطابق ترے سامنے آتا ہے اور اگر تو ابو یزید کی روحانیت کے مطابق اللہ کو دیکھتا تو، تو دیکھتا کہ اللہ تعالیٰ اس کی قدر کے مطابق ظاہر ہوتا"۔

درج بالا گفتگو کے بعد وہ بزرگ معاملہ کی اصلیت کو سمجھ گیا اور اس بات پر رضامند ہو گیا کہ وہ ابو یزید کو دیکھے گا اور نہایت بے چینی سے کہنے لگا کہ مجھے اس کے پاس لے جاؤ۔ آخر کار دریا کے پار ایک پہاڑی پر وہ دونوں چلے گئے اور حضرت بایزید جب وہاں نمودار ہوئے تو اس بزرگ نے ابو یزید کی طرف دور سے ہی دیکھا تو دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا اور مر گیا۔ جب حضرت ابو یزید اس وقوع پر ابو تراب کے پاس پہنچے تو کہنے لگے "آقا کیا بات ہے کہ آپ کی ایک نظر نے ہی اس کو قتل کر دیا" فرمایا کہ تیرا دوست صادق تھا۔ اس نے اپنے دل میں اللہ کو اس طرح ٹھہرا لیا تھا جو اپنے اوصاف کے ساتھ اس پر منکشف نہ ہوا۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے پورے صفاتی جلووں کو نہ دیکھ سکا۔ فرمایا کہ جب اس نے ہم کو دیکھا تو اس کے قلب کا ستر کھل گیا اور وہ ان تجلیات کو جو اس نے دیکھیں برداشت نہ کر سکا اور مر گیا۔ یعنی وہ کمزور اور کم درجہ کے سالکین میں سے تھا اس لئے مر گیا۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ایسے ہی ہے جیسے سورج کو کسی رنگین شیشے میں دیکھا جاتا ہے۔ اگر شیشے کا رنگ سیاہ ہے تو آنکھ سورج کی تیز شعاعوں کی تمازت دیکھنے کو برداشت کرتی ہے کیونکہ سورج کی تجلیات شیشے کے فلٹر میں چھن کر یعنی filter ہو کر آتی ہیں لیکن اگر بغیر عینک کے سورج کو دیکھا جائے تو آنکھوں کا نور ضائع ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ چنانچہ سورج کے نور کی بات فلٹر پر موقوف ہے۔ ہر انسان جب وہ اللہ کے انوار کو دیکھتا ہے تو یہ اس کی روحانیات کے انداز پر منحصر ہے اور سورج کو فلٹر کے اندر دیکھنے کی طرح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نور کو تو سورج کے نور سے کوئی نسبت ہی نہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا کیونکہ جس ظرف روحانی کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قابل برداشت ثابت ہوا جب کہ موسیٰ علیہ السلام کے روحانی جذب کی یہ کیفیت نہ تھی اسی لئے آپ اللہ کے انوار کو برداشت نہ کر سکے اور بے ہوش ہو گئے۔ صوفیائے کرام کا قول ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو بیچ میں لے کر دیکھتے تو اللہ کے انوار کو برداشت کر لیتے۔ اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ ہر شخص اپنے روحانی شیشے کی نوعیت کے مطابق ہی اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکتا ہے اور یہ کہنا درست ہے کہ روئیت حق بقدرِ استطاعت ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو روحانی استطاعت بہت کم حاصل ہے وہ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خواب میں ہر کوئی اپنی استطاعت کے مطابق، مختلف شکلوں میں دیکھتا ہے۔ کسی شاعر کا قول ہے کہ

دل میں طوفانِ وفا، آنکھوں میں سیلِ اشتیاق
عشق سے پہلے مذاقِ عاشقی پیدا کرو

جس کو مشاہدۂ حق نہیں اس کا اندھا ہو جانا ہی بہتر ہے

مولانا روم ؒ دفتر سوم میں فرماتے ہیں کہ شریعت میں اندھے کا امامت کے لئے آگے بڑھنا منع اور مکروہ ہے، اگرچہ وہ اندھا حافظِ قرآن، ہوشیار اور فقیہ ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے اندھے کے مقابلہ میں روشن چشم بہتر ہے خواہ وہ ان پڑھ ہی کیوں نہ ہو۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اندھا اپنے جسم ولباس پر گندگی کو نہیں دیکھ سکتا کیونکہ بچاؤ اور پرہیز کی بنا آنکھ پر ہوتی ہے اور بینائی نہ ہونے کی وجہ سے وہ گندگی کو نہیں دیکھ سکتا۔ فرماتے ہیں کہ خدا کرے کہ کسی مومن کی آنکھ اندھی نہ ہو۔

مولانا روم ؒ ظاہری اندھے کے متعلق شریعت کے فیصلے کی وضاحت کے بعد فرماتے ہیں کہ ظاہری اندھا ہونا تو اتنی بری بات نہیں جتنا کہ باطنی طور پر اندھا ہونا برا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ

باطنی اندھا تو برائیوں کی کان ہے۔ ظاہری اندھے کی نجاستوں کو تو پانی سے دھویا جا سکتا ہے مگر باطنی اندھے کا ازالہ بہت مشکل ہوتا ہے، کیونکہ باطنی نجاست تو بڑھتی ہی رہتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ باطنی نجاست کو آنکھوں کے پانی (گریہ و زاری) کے سوا دھونا ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کافر کو نجس کہا ہے اور اس کی یہ نجاست ظاہری نہیں ہے بلکہ اس کی یہ نجاست اس کے اخلاق اور دین میں ہے۔ فرماتے ہیں کہ ظاہری نجاست کی بدبو تو بیس قدم تک ہوتی ہے مگر باطنی نجاست کی بدبو شہر رَے (Ray) سے شام تک ہی نہیں جاتی بلکہ آسمانوں تک جاتی ہے۔ ان باتوں سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ جسے مشاہدہ حق نہیں اس کا اندھا ہو جانا ہی بہتر ہے۔

قربِ الٰہی اولیاء کے قرب میں ہے

القاموس میں اَلْوَلِیُّ کے لغوی معنی "قرب، محبت، صدیق اور مدد گار" بیان کئے گئے ہیں۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا یکے بعد دیگرے اس طرح آنا کہ ان کے درمیان کسی دوسری چیز کا موجود ہونا نہ ہو تو اسے اَلْوَلَاءُ کہتے ہیں۔ چنانچہ ولی کے لفظ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ولی وہی ہو سکتا ہے جو اللہ کا مقرب، مدد گار اور دوست ہو اور جو اللہ کے بندوں کو بغیر کسی تلفیف (ضائع ہونا) یا بغیر کسی دوسرے کے موجود ہونے کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملا دے۔

ہماری کتاب "اسلام اور روحانیت" کے بابِ ولایت میں اور بابِ صحبت میں قربِ اولیاؐ اور قربِ الٰہی کے مابین ایک گہرا رشتہ ہونے کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ راقم الحروف کی دوسری کتب (مثلاً بیعت کی تشکیل و تربیت اور روحِ نماز) میں بھی صحبت کی افادیت پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ شائقین حضرات ان کتب سے رجوع فرمائیں۔ یہاں چند ایسے نکات پیش کئے جا رہے ہیں جن کا تعلق ربط شیخ سے ہے اگرچہ یہ نکات ضرورتِ شیخ اور افادیتِ شیخ سے بھی لاتعلق نہیں۔

دفترے باشد حضورِ یار بیش (یعنی یار کی حضوری ایک بہت بڑا دفتر ہے)

دفتر کا مطلب وہ جگہ ہے جس میں اس کے متعلقہ امور کا ساز و سامان یا ریکارڈ موجود ہو۔ مولانا روم" فرماتے ہیں کہ صوفی (پیر کامل) کا دفتر ایک ایسا دفتر ہے کہ جہاں وہ اپنے دوستوں اور ارادتمندوں کو ساتھ بٹھا کر اللہ کی طرف مراقب ہو جاتا ہے اور وہاں سے جو فیوضات اس کو ملتے ہیں وہ اپنی مجلس میں شریک تمام ارادتمندوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور جس کی جتنی استطاعت ہو، اس کو یہ صوفی لوگ اتنا ہی عطا کر دیتے ہیں۔ ؎

پس مراقب گشت بایارانِ خویش — دفترے باشد حضورِ یار بیش
(صوفی اپنے دوستوں کے ساتھ مراقب ہو گیا — یار کی حضوری ایک بہت بڑا دفتر ہوتی ہے)

دفترِ صوفی سواد و حرف نیست — جز دلِ اسپید ہمچوں برف نیست
(صوفی کا دفتر سیاہی اور حرف نہیں — وہ برف کی طرح سفید دل کے سوا کچھ نہیں)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی" نے غنیۃ الطالبین میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ قرآن

میں ایسے صوفیوں کا ذکر ملتا ہے کہ جو ہر وقت اٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ ؒ فرماتے ہیں کہ ایسے باصفا لوگوں کو اہل تصوف کہتے ہیں۔ اگر تمہیں ان کی مجلس کی حلاوت اور مٹھاس کی ضرورت ہو تو اہل تصوف کی مجلس اختیار کیا کرو، کیونکہ ان کے نورانی حلقوں اور نورانی مجلسوں میں حق تبارک و تعالیٰ کی خالص محبت کے چشمے انسانوں کے دلوں میں جاری کئے جاتے ہیں، جس کی قدر و قیمت وہی جانتے ہیں جن کو ذکر الٰہی کی توفیق عطا ہو چکی ہو۔

غنیۃ الطالبین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کلمہ طیبہ کے ذکر سے اپنے شیاطین کو اس طرح دبلا کیا کرو جس طرح کوئی شخص بار بار سوار ہونے سے اور بکثرت بوجھ لادنے سے اپنے اونٹ کو دبلا کیا کرتا ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ فرماتے ہیں کہ کلمہ اپنے خالص دل سے کہہ کر (جس کا طریقہ مرشد کامل ارشاد فرماتا ہے) اپنے شیاطین کو دبلا کیا کرو۔ یہ کلمہ شیاطین جن و انس کو جلا ڈالتا ہے۔ اسی لئے مولانا روم ؒ نے فرمایا کہ نفس کا علاج مرشد کامل کی سپردگی میں آنے کے سوا نہیں ہوتا۔ فرماتے ہیں کہ کلمہ کا نور شیاطین کے لئے نار ہے اور موحدین کے لئے نور ہے۔ اخلاص تیرے دل کے طمع کی آگ کو بجھا دے گا اور نفس کے تکبر کو توڑ دے گا۔ ایسی جگہ نہ جا جہاں تیرے دل کی آگ بھڑک اٹھے (یعنی بری سوسائٹی، مردوں اور عورتوں کی آزاد مجلس، ٹی وی وغیرہ کے فحش پروگرام) کیونکہ ایسا کرنے سے تیرے دین اور ایمان کا گھر تباہ ہو جائے گا۔ جب ہوا و ہوس بھڑک جائے تو تیرے دین اور ایمان کو تباہ کر دے گی۔ آپ نے ایک حدیث کے حوالے سے لکھا ہے کہ اپنے کھانے کو نماز اور ذکر الٰہی کے ساتھ گلاؤ۔ مشائخ کرام کی مجالس سے افادیت کی صورت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے اس قول سے بخوبی معلوم ہو جاتی ہے اور مشائخ کی مجالس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط قائم ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا روم ؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ شک و شبہ کا شکار ہوتے ہیں اور اولیائے کرام کی بزرگی کے قائل نہیں ہوتے، ایسے لوگ کبھی کسی صدیق کو کافر کہہ دیتے ہیں اور اگر کسی سے متاثر ہو جائیں تو زندیق یا بے دین کو بھی زاہد سمجھنے لگتے ہیں۔ خام لوگوں کے خیالات بھی خامی سے خالی نہیں ہوتے۔ جو شخص اپنے آئینہ قلب کو صاف کر لے تو وہ امن کے مقام پر پہنچ جاتا ہے اور اگر کسی کا دل آئینہ بن گیا تو پھر وہ کبھی لوہا نہیں بن سکتا۔ کوئی انگور جب پک جاتا ہے تو پھر دوبارہ کچا نہیں ہوتا۔ آپ نصیحت فرماتے ہیں کہ انسان کو روحانیت میں پختہ کار ہو جانا چاہیے پھر تغیر کا خدشہ بہت کم رہتا ہے۔ اگر شک ہو تو ان لوگوں کو دیکھو جن کی اولیائے کرام نے آنکھیں کھول دی ہیں۔ جن کی آنکھوں میں نور ہے انہوں نے اولیائے کرام کو ان کی پیشانی اور آنکھوں سے دیکھ کر پہچان لیا ہے۔

اولیائے کرام وہ ناگفتہ سبق دیتے ہیں جو اُن کے باطنی احوال سے ہوتا ہے

مولانا روم" فرماتے ہیں کہ پیر بغیر کسی آلے کے باطنی طور پر تصرّف کرتا ہے۔ وہ مریدوں کو ظاہری گفتگو کئے بغیر بھی سبق دیتا ہے یعنی ان کا تصرّف کبھی نظروں سے ملتا ہے اور کبھی قلبی توجہ سے، اسی کو ناگفتہ سبق کہتے ہیں۔ حضرت شیخ سرہندی المعروف مجدد الف ثانی" کے پاس ایک عالم آیا اور کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھا رہا مگر اس دوران حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے قطعاً کوئی کلام نہ فرمایا۔ جب وہ باہر آیا تو لوگوں کو کہنے لگا کہ ہم تو اس لئے آئے تھے کہ حضرت سے کچھ فیض ملے گا، مگر آپ نے تو ہم سے کوئی کلام ہی نہیں فرمایا، لہٰذا میں بغیر فیض حاصل کئے ہی واپس جا رہا ہوں۔ حضرت مجدّد علیہ الرحمۃ کو اس کی اس گفتگو کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا "جو ہماری خاموشی سے فیض حاصل نہیں کر سکتا وہ ہمارے کلام سے بھی فیض اخذ کرنے کے قابل نہیں۔" اولیائے کرام کی خاموشی کو مولانا نے "بے گفتہ سبق" فرمایا ہے۔ لوگوں کے دل اولیائے کرام کے ہاتھوں میں نرم موم کی طرح ہوتے ہیں اور وہ جس کو چاہیں نئی شکل میں تحویل کر دیتے ہیں بشرطیکہ وہ شخص ازلی بدبخت نہ ہو۔

مولانا روم" مثنوی کے دفتر دوم میں عام لوگوں کو بہ غایتِ تفکّر ایک نکتہ پیش کرتے ہیں اور اس کو ایسے انداز میں سمجھاتے ہیں جس کو ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے شخص اگر تیرا جسم ناپاک اور گرد آلود ہے تو تجھے ایک حوض میں جا کر غسل کرنے کی ضرورت ہے اور جب تک تو اس حوض سے باہر ہے تو تیرا پاک ہونا متصور نہیں۔ فرماتے ہیں کہ عام انسانوں کے جسموں میں پاکیزگی تو ہوتی ہے مگر اس کی نوعیت بہت کم مقدار کی پاکیزگی ہے۔ جب کہ یہ حوض (جس میں اولیائے کرام غسل دیتے ہیں) بہت بلند مرتبت پاکی کی ضمانت دیتا ہے کیونکہ دیکھنے کو تو یہ حوض ہے لیکن اس کا اندرون ایک بہت گہرے سمندر سے منسلک ہے۔ اولیائے کرام کا دل اپنے اندر معرفت کے دریا کی وسعت رکھتا ہے۔ (دل دریا سمندروں ڈوہنگے کون دلاں دیاں جانے ھُو) عام انسان میں جو پاکیزگی کی چنگاری موجود ہے وہ ناکافی ہے اور اس کو کسی ولی کامل کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس پاکیزگی کے عدد کو روز بروز نفس کی آلودگی کے باعث کم ہونے کا خطرہ ہوتا ہے یعنی ایسا نہ ہو کہ یہ پاکیزگی کا عدد گناہوں میں صرف ہوتے ہوتے بہت کم یا برائے نام باقی رہ جائے۔ اس لئے اس پاکیزگی کو بڑھانے کی فکر کرنے کی فوراً ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

شیخ فعّال است بے آلت چو حق   بامریداں دادہ بے گفتہ سبق

(پیر اللہ تعالیٰ کی طرف بغیر کسی آلہ کے تصرف کرنے والا ہے۔ بغیر بولے مریدوں کو سبق پڑھاتا ہے)

دل بہ دستِ او چو مومِ نرم رام   مُہرِ اُو گہ ننگ سازد گاہ نام
(دل اس کے ہاتھ میں نرم موم کی طرح مسخر ہوتا ہے اس کی مُہر کبھی ذلت دیتی ہے اور کبھی شہرت)

اے تنِ آلودہ گردِ حوض گرد   پاک کے گردد برونِ حوض مرد
(اے گندے جسم والے حوض کے گرد چکر لگا   انسان حوض کے باہر کب پاک ہوا ہے)

پاکئی ایں حوض بے پایاں بود   پاکئی اجسامِ کم میزاں بود
(بزرگوں کے اس حوض کی پاکی بے انتہا ہوتی ہے   عام جسموں کی پاکی کم وزن کی ہوتی ہے)

زانکہ دل حوضیت لیکن در کمیں   سوئے دریا راہ پنہاں دارد ایں
(اس لئے کہ دل ایک حوض ہے لیکن پوشیدہ طور پر، (یہ اولیا کے) دریا کی طرف چھپا ہوا راستہ رکھتا ہے)

پاکئی محدود تو خواہد مدد   ورنہ اندر خرچ کم گردد عدد
(تیری محدود پاکی مدد کی محتاج ہے، ورنہ تیری پاکی کا عدد خرچ ہوتے ہوتے کم رہ جائے گا۔)

پس تقرّب جُو بدو سوئے الٰہ (ان اولیاء کے ذریعے خدا کا قرب تلاش کرو)

مولانا رومؒ کی مثنوی میں اس بات کا بہت شد و مد سے ذکر کیا گیا ہے کہ اگر خدا کا قرب چاہتے ہو تو جاؤ اولیاء اللہ کے پاس بیٹھو۔ کبھی وہ فرماتے ہیں کہ جس نے کسی ولی اللہ کو پالیا تو سمجھ لو کہ اس نے خدا کو پالیا۔ چونکہ اولیاء اللہ شیطان سے محفوظ اور مامون ہوتے ہیں اس لئے جو ان کے سائے میں آجائے گا تو یقیناً وہ بھی شیطان سے محفوظ ہو جائے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مسجد میں لیٹے ہوئے تھے اور ایک شخص مسجد میں ہی ان کے قریب نماز ادا کر رہا تھا۔ کسی اہل نظر نے دیکھا کہ شیطان مسجد کے دروازے پر کھڑا ہے تو اس نے پوچھا کہ تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ شیطان نے جواب دیا کہ میں اس شخص کی نماز میں خلل ڈالنا چاہتا ہوں۔ پوچھا کہ پھر خلل ڈالتے کیوں نہیں؟ شیطان نے کہا کہ وہ شخص (حضرت علیؓ) جو اس کے پاس لیٹے ہوئے ہیں، مجھے ان سے ڈر لگتا ہے، اس لئے آگے جانے کی جرأت نہیں ہو رہی۔ مولانا روم ؒ مثنوی کی جلد اول حصہ چہارم میں فرماتے ہیں کہ ان اولیاء کا تقرب حاصل کرو گے تو خدا کا قرب بھی حاصل کر سکو گے اور تمہاری مشکلات بھی دور ہو جائیں گی۔ ان کا سایہ دور دور تک شیطان کے شر سے محفوظ کرتا ہے اور ان کی روح بہت بلندیوں پر پرواز کرتی ہے اور تمہیں بھی ایسی بلندیوں پر پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہے کہ تم اللہ کے ساتھ واصل ہو سکو۔

اندر آ در سایۂ آں عاقلے   کس نتاند برد راہ از ناقلے

(اس عقلمند عارف کے سائے میں آجاؤ، جس کو کوئی گمراہ کرنے والا راہ راست سے پھیر نہیں سکتا)

پس تقرب جو بدو سوئے اللہ — سر مپیچ از طاعتِ او ہیچگاہ

(پس اس شیخ کے وسیلے سے حق تعالیٰ کی طرف تقرب حاصل کرو، اس کی اطاعت سے کبھی پہلو تہی نہ کرو)

زانکہ او ہر خار را گلشن کند — دیدۂ ہر کور را روشن کند

(کیونکہ شیخ (راہِ طریقت کے ہر مشکل) کانٹے کو باغ بنا سکتا ہے۔ اور (طریقت کے) ہر اندھے کی آنکھ کو روشن کر سکتا ہے)

ظلِ اُو اندر زمیں چوں کوہ قاف — روحِ اُو سیمرغ پس عالی طواف

(اس کا سایہ کوہ قاف کی طرح زمین پر ہمہ گیر رہتا ہے۔ اس کی روح نہایت بلند پرواز سیمرغ پرندہ ہے)

اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا بیان اگرچہ ہماری مذکورہ کتابوں میں آچکا ہے۔ لیکن یہاں صرف اس حقیقت کا کھول دینا ضروری ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ قرب باری تعالیٰ حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت اس بات پر قائم ہے کہ اس کا قرب ان لوگوں کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے جو خود اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر چکے ہوں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ جو خود اندھا ہے وہ دوسروں کو کس طرح راہ دکھا سکتا ہے۔

روحانی قوتوں کا حصول ایک ایسا مضمون ہے جس کے قوانین اور اصولوں کو طریقت کے صرف کتابی شعبہ سے ہی بظاہر اخذ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس راہ پر چلنے سے پہلے ان قوانین اور ضوابط کا علم، اہل عرفان کی صحبت کے ذریعے حاصل کرنا ضروری ہے۔ مولانا روم ؒ نے مثنوی کے مذکورہ بالا اشعار میں طریقت کے ایک بہت بڑے اصول کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ سالک کو چاہئے کہ وہ اپنے شیخ کی اطاعت سے منہ نہ موڑے اور اس کے ارشادات سے پہلو تہی نہ کرے کیونکہ اس کی اطاعت اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر محمول کی جاتی ہے۔ ہمارے خواجہ (حضرت علامہ علاؤالدین صدیقی مدظلہ) ایک حکایت بہت مزے کے ساتھ بیان کیا کرتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک مرید نے آپ سے یہ عرض پیش کی کہ اس کی جائیداد کے کاغذات کہیں گم ہوگئے ہیں۔ اس پر حضرت نے فرمایا "حلوہ بہت اچھی چیز ہے" اس مرید نے کچھ دنوں میں تین چار بار یہی عرضداشت پیش کی اور دعا کے لئے کہا مگر ادھر سے یہی جواب ملتا تھا "حلوہ بہت اچھی چیز ہے" اس شخص کے دل میں یہ خیال آیا کہ حضرت بار بار حلوے کا ذکر کرتے ہیں چلو آج حلوہ خرید کر ان کے لئے لے جاتا ہوں۔ جب اس نے حلوہ خریدا تو جس کاغذ میں حلوائی نے حلوہ باندھ کر دیا وہ اس کی جائیداد کے کاغذات تھے جو غالباً ردی کے کاغذات میں بک کر حلوائی تک پہنچے تھے۔ جب مرید نے یہ واقعہ حضرت نظام الدین ؒ کے سامنے بیان کیا تو آپ نے فرمایا "حلوہ بہت اچھی چیز ہے" اسی اعتبار سے حافظ شیرازی اپنے دیوان کے ابتدا میں ہی بیان

فرماتے ہیں۔ ؎

بہ مئے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید　　　که سالک بیخبر نبود زراہ و رسم منزلہا

(اگر تجھے پیر مغاں کہے تو مصلے شراب سے رنگ لے. اس لئے کہ سالک منزلوں کی رسم وراہ سے بے خبر نہیں ہوتا)

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ جو شخص قرب الٰہی چاہتا ہے تو اسے کہو کہ ان لوگوں کے پاس بیٹھے جن کو اللہ کا قرب حاصل ہو چکا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت ایسے اولیائے مقربین پر ہوتی ہے اور پھران پر جو ان کے قریب ہوں اور علیٰ ہذا القیاس پھران پر جو ان کے قرب میں ہوں۔

مقبولانِ الٰہی کی نظر کے مقابلے میں کیمیا کی کچھ حیثیت نہیں

اولیائے کرام کا پہلا اور سب سے بڑا منصب یہ ہے کہ وہ بے راہ اور گم گشتگانِ راہ کی دستگیری فرماتے ہیں اور ایسے طالبوں کو جو خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں اپنے دست شفقت کے ذریعے خدا کی بارگاہ تک پیش کر دیتے ہیں۔ مولانا نے پوری مثنوی میں اولیا اللہ کی بزرگی اور کملات کا جابجا ذکر کیا ہے۔ حقیقتاً تمام مثنوی کا لب لباب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ سالکان راہ طریقت کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ اولیا کا دامن تھام لیں کیونکہ اولیاء اللہ کی خدمت میں آنے والے لوگ خدا رسیدہ ہو جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اولیائے کرام کی ارواح کی چمک کے سامنے سورج اور چاند تارے کوئی حقیقت نہیں رکھتے بلکہ ان کے نور سے تو فرشتے بھی فیض یاب ہو کر زندگی پاتے ہیں۔ ان کی ہم نشینی کیمیا ہے بلکہ کیمیا بھی ان کی نظروں کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ جو لوگ ان کی صحبت میں آگئے وہ زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک پہنچ گئے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

دستگیرد بندۂ خاصِ اِلٰہ　　　طالباں را می برد تا پیشگاہ

(اللہ تعالیٰ کا خاص بندہ دستگیری کرتا ہے۔　　　اور طالبوں کو اللہ کی درگاہ تک لے جاتا ہے)

گر بگویم تا قیامت نعتِ او　　　ہیچ آں را غایت و مقطع مجو

(اگر میں قیامت تک اس کی تعریف کروں۔　　　تو اس کی باتوں کے ختم ہونے کی امید نہ کر)

آفتابِ روح نے آنِ فلک　　　کہ زنورش زندہ اند انس و ملک

(وہ روح کا سورج ہے اور آسمان والا سورج نہیں۔ کیونکہ اس کے نور سے انسان اور فرشتے زندہ ہیں)

ہم نشینی مقبلاں چوں کیمیاست　　　چوں نظر شاں کیمیائے خود کجاست

(مقبولان الٰہی کی ہمنشینی کیمیا ہے۔　　　بلکہ ان کی نظر کے مقابلہ میں کیمیا کیا چیز ہے)

اُو زقعرِ بحر گوہر آورد از زیانہا سُود برسر آورد
(وہ دریا کی گہرائیوں سے موتی نکالتا ہے۔ اور نقصان والی چیزوں سے فائدے کو لے آتا ہے)
آید از خواجہ رہ افگندگی نایذ از بندہ بغیر از بندگی
(خواجہ سے خاکساری کا طریقہ ملتا ہے۔ اللہ کے بندے سے بندگی کے سوا کچھ بھی نہیں آتا)
شیخ کو یَنظُرُ بِنُوْرِاللهِ شد از نہایت وز نخست آگاہ شد
(شیخ جو اللہ کے نور سے دیکھنے والا ہوتا ہے۔ وہ ابتدا اور انتہا کے رازوں سے واقف ہوتا ہے)

صوفی اللہ تعالیٰ کو اس طرح پالیتا ہے جیسے شکاری خوشبو سے ہرن کو

بندگانِ الٰہی ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے دلوں کی وابستگی کو مستحکم کرنے کے خیال میں منہمک رہتے ہیں۔ اس انہماک سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی وابستگی کو ایسی صورت دے سکیں جس سے انہیں اللہ کے قرب میں ایک خاص مقام میسر ہو جائے اور وہ اس قرب کو اتصال بالشہود کی شکل میں محسوس کر سکیں۔ اس قسم کا لگاؤ لاسلکی لگاؤ کی طرح ہوتا ہے اور اس لگاؤ کا حاصل کرنا کوئی مشکل امر نہیں، البتہ اس میں کچھ ذہانت، محنت اور راہبری کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کو تو تمام عمر خدا کا وصل حاصل کرنے کا خیال تک محسوس نہیں ہوتا۔ فلسفی لوگ تمام عمر فلسفہ کے نشیب و فراز طے کرنے میں لگے رہتے ہیں اور بہت سے فلسفی تو ایسے بھی ہو گزرے ہیں جنہوں نے بالآخر خدا کے وجود کا بھی انکار کر دیا۔ مشاہدے میں آتا ہے کہ کفار کا گلہ تو ایک طرف ہمارے بہت سے مسلمانوں کا ایمان اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں بھی ان کو خدا کے وجود پر اس قدر بے یقینی کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر عزیز کو اس طرح عیش و عشرت میں بسر کر دیتے ہیں جس سے ان کے دل و دماغ میں خدا کے ہونے کا صاف انکار نظر آتا ہے۔ ایسے مسلمانوں کی بھی کوئی کمی نہیں جن کی عمر ساٹھ سال سے بھی تجاوز کر جاتی ہے لیکن ایک دن کے لئے بھی ان کو یہ فکر لاحق نہیں ہوئی کہ موت کے بعد قبر میں اور پھر آخرت میں ان کا کیا حشر ہو گا۔ ایسے لوگ لمحہ بھر کے لئے بھی اس بات سے خائف نہیں ہوتے کہ وہ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ شاید ایسے لوگ زندگی کی رنگینیوں میں اس طرح مست ہو جاتے ہیں کہ وہ کسی سمجھانے والے کی صدا اور ندا کو سننا بھی پسند نہیں کرتے۔

ان غافل اور عیش و عشرت کے پجاریوں کے برعکس کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں کہ ان کو دنیا کی ہر چیز کے وجود میں اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ آج بھی خدا کو اس طرح ہی مانتے ہیں جیسے روز قیامت خدا کو دیکھنے کے بعد اس کو مانا جائے گا۔ بقول شاعر ؎

امروز گر جمال تو بے پردہ ظاہر است در حیرتم کہ وعدۂ فردا برائے چیست

(اگر تیرا جمال آج ہی بے پردہ ظاہر ہو گیا ہے تو میں حیران ہوں کہ کل قیامت کو دیدار کا وعدہ کس لئے ہے)

اگر کسی کو اس بات کی طلب ہو کہ وہ خدا کو تلاش کرے تو اس طلب کو حاصل کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ اس کو حاصل کرنے کے لئے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آنکھ، کان، ناک اور منہ کو بند کر لو (یعنی بے جا استعمال نہ کرو) تو اگر خدا کو نہ پا سکو گے تو ہمیں جو چاہو سزا دو۔ کچھ لوگوں کا قول ہے کہ آنکھوں کو وقف تماشا کر لو گے تو وہ نظر آ جائے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ پہلے اپنے دل میں بے چینی اور بے قراری کو پیدا کر کے آہ و زاری کرو اور پھر تلاش کرو تو وہ مل جائے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ مناظر قدرت کو دیکھو تو خدا یاد آ جائے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ درخت کو دیکھو اور اس کے پھل کو دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ سب کچھ اس کے بیج میں موجود ہے، چنانچہ ایسے لوگ خدا کی وحدت کو کثرت میں دیکھنے کے قائل ہے۔ ڈارون نے اپنا سراغ لگانا چاہا تو کہنے لگا "بوزنہ ہوں میں" یعنی میں بندر سے ارتقا کر کے بندہ بنا ہوں۔ غرضیکہ ہر ایک نے اس سمت میں کچھ نہ کچھ کہا ہے لیکن ان سب میں کہیں نہ کہیں کچھ کمی ضرور رہ جاتی ہے اور اس کمی کا ازالہ صوفیا کے طریقے میں پایا جاتا ہے۔

اگر ہم صوفیا کے طریقے کی طرف رجوع کریں تو ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مراقب ہو کر اللہ سے لو لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ایسا کرنے سے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف راستہ مل جاتا ہے اور وہ واصل باللہ ہو جاتے ہیں۔ مولانا روم ؒ نے اس طریقے کو اور بھی واضح کرنے کی کوشش میں ایک نہایت خوبصورت مثال سے کام لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہر کوئی اپنے کام کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ رکھتا ہے۔ عقلمندوں کا توشہ قلم ہے تو وہ قلم کے ذریعے اپنا حساب کتاب، اپنے افکار اور فلسفے کا اظہار کرتے ہیں اور اس کے حصول کے لئے اپنے قلم کو حرکت میں لاتے ہیں۔ اگر کوئی انجینئر ہے تو وہ اپنے آلات کو بروئے کار لاتا ہے غرضیکہ ہر فن کار کا اپنا اپنا طریقہ کار ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ صوفیوں کا طریقہ کار نہ تو قلم ہے اور نہ ہتھیار اور آلات ہیں بلکہ صوفیوں کا توشہ اللہ تعالیٰ کے انوار کی تلوار ہے۔ آپ کے ان علوم کی وضاحت نیچے دی جاری ہے۔

مولانا روم ؒ فرماتے ہیں کہ صوفیوں کا توشہ انوار قدم ہے۔ صوفی اس شکاری کی طرح ہے کہ جو صرف شکار کو دیکھ کر ہی اس کے پیچھے نہیں لگتا بلکہ اس میں اتنی فہم ہوتی ہے کہ ہرن کے قدموں کے نشاں صحرا میں پانے کے بعد ان قدموں کے آثار پر چل دیتا ہے اگرچہ ہرن ان قدموں کے نشان سے بہت وراء الوراء ہے لیکن سمجھدار اور پختہ کار شکاری چند قدم ہرن کے قدموں کے نشان پر چلتا ہے اور اس کے بعد اس کا تجربہ اور عقل اس کے کام آتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ چند قدموں کے بعد ہرن کے نافے کی خوشبو اس شکاری کی راہبری کرنے لگتی ہے۔ چونکہ اس نے نشانِ قدم کی قدر کی اور راستہ طے کر لیا تو لامحالہ وہ ان قدموں کی مدد سے مقصد تک پہنچ جاتا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ مشکِ نافہ کی خوشبو پر ایک منزل چلنا، بلا مقصد اور بغیر قیاس و

انداز کے سو منزلوں کی راہ طے کرنے سے بہتر ہے۔ عارف کامل کا دل تمہارے لئے تو ایک دیوار کی طرح ہے لیکن طالبوں کے لئے وہ خدا کی طرف جانے والا ایک دروازہ ہے۔ ایسے عارفوں کا دل بہت سے سورجوں کا مشرق ہوتا ہے اور سالکوں کے لئے ایسا دروازہ ہے کہ وہ فوراً اس کے ذریعے منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ قرآن میں آیا ہے کہ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (سو جدھر بھی تم رخ کرو، وہیں ذاتِ خداوندی ہے۔ البقرہ ۱۱۵) اللہ تعالیٰ کی تجلیات ہر طرف موجود ہیں۔ مشک نافہ کی مثال اس لئے دی ہے کہ سالک کچھ دیر تو تجلّیات افعال کا مشاہدہ کرتا ہے. پھر فرط شوق میں مطلوب حقیقی (یعنی اللہ تعالیٰ) کی منزلِ قرب طے کرنے لگتا ہے۔ جب شوق راہنما بن جائے تو لامحالہ اللہ کی طرف سے بھی جذب اور کشش ہوتی ہے اور وہ ایسے بندوں کو ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ سالک ایک قدم چلے تو اللہ تعالیٰ ایک کرم کی مقدار اس کی طرف آتا ہے (الیٰ آخر الحدیث) خدا کی طرف سے جذب اور کشش ہو جائے تو منازل کی راہ کی دشواریاں آسان بلکہ ختم ہو جاتی ہیں۔ اس طرح تجلی صفاتی، تجلی ذاتی بن جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سلوک کا تعلق سالک کی ذاتی سعی اور کوششوں پر منحصر ہے۔ اگرچہ اس کی کوششوں میں غلطی کا امکان ہوتا ہے مگر جذب چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اس لئے اس میں شیطانی مداخلت ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجرد سالک (جو صرف اپنی کوششوں سے راہ طے کرتا ہے) اس سے مجذوب سالک بدرجہا افضل ہے کیونکہ وہ اکیلا و تنہا نہیں، بلکہ اس کو جذب الٰہی کی سعادت مل چکی ہوتی ہے۔ کسی بزرگ نے کہا ہے کہ جَذْبَةٌ رَّبَّانِيَّةٌ خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ (یعنی اللہ کی جانب سے ایک کشش جن و انس کی عبادت سے بڑھ کر ہے۔) مولانا فرماتے ہیں۔

زادِ دانشمند آثارِ قلم ۔۔۔ زادِ صوفی چیست انوارِ قدم

(عقلمند کا توشہ قلم کے نشانات ہیں ۔۔۔ صوفی کا توشہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے انوار ہیں)

ہمچو صیادے سوئے اشکار شد ۔۔۔ گامِ آہو دید و بر آثار شد

(اس شکاری کی طرح ہے جو کسی شکار کے پیچھے لگا ہو. ہرن کے قدموں کو دیکھا اور اس کے قدم کے نشان پر چل پڑا)

چند گاہش گام آہو در خور است ۔۔۔ بعدازاں خود نافِ آہو رہبر است

(اس کو کچھ دیر ہرن کے قدموں کی ضرورت ہے، اس کے بعد خود ہرن کا نافہ اس کا رہنما بن جاتا ہے)

چونکہ شکرِ گام کرد و راہ برید ۔۔۔ لاجرم زاں گام در کامے رسید

(چونکہ اس نے نشان قدم کی قدر کی اور راستہ طے کر لیا ۔۔۔ لامحالہ اس قدم سے مقصد تک پہنچ گیا)

رفتنِ یک منزلے بربوئے ناف ۔۔۔ بہتر از صد منزلِ گام و طواف

(ناف کی خوشبو پر ایک منزل چلنا ۔۔۔ ادھر ادھر کے چکروں کی سو منزلوں سے بہتر ہے)

آں دلے کو مطلعِ مہتابہاست ۔۔۔ بہرِ عارف فُتِّحَتْ اَبْوَابُہاست

(وہ دل جو بہت سے سورجوں کا مشرق ہے ۔۔۔ عارف کے لئے پہلے سے کھلے ہوئے دروازوں کے

مصداق ہے)

مثنوی میں مشک نافہ کی مثال کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کی توجہ فوراً مولانا رومؒ کے شاگردِ عظیم، علامہ اقبالؒ کی طرف جاتی ہے۔ علامہ نے خود فرمایا ہے کہ میں نے مولانا رومؒ کے بحرِ بیکراں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ چنانچہ مثنوی کے درج بالا مفہوم سے متاثر ہو کر علامہ اقبالؒ نے درج ذیل اشعار کو اپنے کلام میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ شامل کیا ہے۔ تیسرے شعر میں آہوئے تاتاری سے آپ کا اشارہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ ان اشعار میں آپ نے قلب انسانی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا سراغ لگانا مراد لیا ہے۔

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کراری — مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک — نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری
مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشان اس کا — ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

(مشامِ تیز کا مطلب سونگھنے کی زبردست طاقت ہے ظن و تخمین کا مطلب محض قیاس یا گمان ہے)

درج بالا کلام کا حاصل یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص ذکر الٰہی سے دل کو بیدار نہیں کرتا اسے کسی راہنما کی راہنمائی بھی فائدہ نہیں دے سکتی اور اگر خدا کا وصل حاصل کرنے کا ارادہ ہو تو کسی عارف کامل کی راہنمائی میں مشامِ تیز کی قوت کو اپنے اندر پیدا کیا جائے، جس کا حصول شیخ کامل کے بتلائے ہوئے نکات پر چلنے سے ہی ممکن ہے اور رابطہ شیخ وہ دروازہ ہے جس میں داخل ہو کر مرید اپنی منزلوں کو آسانی سے طے کر سکتا ہے۔

پیر کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے اور دور و نزدیک کے لئے یکساں ہے

اولیائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت عطا فرمائی ہے کہ نزدیکی اور دوری ان کے لئے یکساں حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا رومؒ نے فرمایا ہے کہ حقیقتاً اولیاء اللہ کا ہاتھ اللہ کے ہاتھ کی طرح ہے کیونکہ احادیث میں بندہ مومن کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ کہا گیا ہے۔ مولانا رومؒ نے "گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بُوَد" یعنی اس کا کہنا اللہ کا کہنا بن جانے کا ذکر کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی بندہ مومن کے متعلق فرمایا ہے کہ:۔

اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز

مولانا فرماتے ہیں کہ جب اولیائے کرام دور افتادہ لوگوں کو بڑے بڑے انعام دیتے ہیں تو اپنے قریبی مہمانوں کو کیا کچھ نہ دیتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کا اسی طرح خیال رکھتے ہیں جس طرح اصحاب کہف " کا غار میں خیال رکھا گیا۔

دستِ پیر از غائباں کوتاہ نیست دستِ اُو جز قبضۂ اللہ نیست
(پیر کا ہاتھ غیر حاضر لوگوں کے لئے بھی کوتاہ نہیں، اس کا ہاتھ اللہ کے ہاتھ کے سوا کچھ اور نہیں)

غائباں را چوں چنیں خلعت دھند حاضراں از غائباں لا شک بہند
(جب وہ غیر حاضر لوگوں کو ایسا انعام دیتے ہیں تو لامحالہ حاضر لوگ غیر حاضروں سے بہتر ہیں)

غائباں را چوں نوالہ می دہند پیشِ مہماں تاچہ نعمت ہا نہند
(جب وہ غیر حاضر لوگوں کو لقمہ دیتے ہیں تو اپنے مہمانوں کے سامنے کیا کیا نعمتیں رکھتے ہوں گے۔)

اولیاء اصحابِ کہف اند اے عَنُود، در قیام و در تَقَلُّبْ ھُمْ رُقُودْ
(اے جھگڑنے والے! اولیاء تو گویا اصحاب کہف ہیں قیام میں اور کروٹوں کے بل وہ محوِ خواب ہیں)

ولیٔ کامل براہ راست خدا سے فیض لے کر تقسیم کرتا ہے

مولانا روم " مثنوی کے حصہ دوم میں فرماتے ہیں کہ کفار جب کسی رسول کو نہیں مانتے تو اس میں نقصان رسول کا نہیں بلکہ ان کا اپنا نقصان ہے۔ اسی طرح اگر بیمار طبیب کا، شاگرد استاد کا، مرید پیر کا اور دھوبی سورج کا دشمن بن جائے، تو غور کرو نقصان کس کا ہے؟ اگر تم بدصورت ہو تو بدعادت نہ بنو۔ کوئی حاسد اگر امیر سے حسد کرے تو یہ اس کے لئے اس کی غربت سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے۔ شیطان نے کمتر ہونے کی ذلت کے حسد میں اپنے لئے سینکڑوں نقصان کر لئے۔ اس نے حسد اس لئے کیا کہ وہ انسان سے خود کو اونچا ظاہر کرے۔ وہ اونچا تو کیا بنا بلکہ خون آلودہ ہو گیا۔ ابوجہل کا نام ابوالحکم تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ذلت محسوس کرتا تھا اور ایسا احساس پیدا کرنے کے باعث اور حسد سے ابوجہل بن گیا۔ حسد سے تو بہت سے لائق و فائق لوگ نااہل بنتے ہیں۔ نیک عادت والا کبھی نقصان میں نہیں رہتا۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو اسی لئے مبعوث کیا تاکہ لوگوں کا حسد نیک عادات میں تبدیل ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اللہ نے بڑائی عطا فرمائی تو کوئی مسلمان ان سے حسد نہیں

کرتا تھا بلکہ آج بھی ان کی تعریف سن کر ہر مسلمان خوش ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین صحابہ کرام اور اولیائے کرام کو بنایا ہے۔ ہر زمانے میں ولی آتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ آج کل لوگوں کے حسد بغض وغیرہ کے دور کرنے کا کام اولیائے کرام کے سپرد ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ مہدی اور ہادی چھپا ہوا بھی ہوتا ہے اور ظاہر بھی کیا گیا ہے۔ ایسے ولی نور کی طرح ہیں اور ان کی عقل جبرئیل علیہ السلام کی طرح ہے۔ اس سے کم درجے کا ولی ایک قندیل کی طرح ہوتا ہے۔ اس ولی سے چھوٹا ولی بھی ایک دیئے کی طرح ہوتا ہے۔ حسبِ درجہ ان کا نور کم ہوتا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان سات سو (۷۰۰) بڑے پردے ہیں اور جس کے لئے پردے کم حائل ہیں اس کا نور بھی زیادہ ہوتا ہے۔ سب سے آگے جو ولی ہے اس کا نور سب سے زیادہ ہوتا ہے اور اس نور کو پچھلے ولی یعنی چھوٹے ولی اس نور کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی طرح لوہا زیادہ گرم آگ کو نہ صرف برداشت کرتا ہے، بلکہ آگ میں جاکر خوش ہوتا ہے، جب کہ سیب یا ناشپاتی تھوڑی سی گرمی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ لوہا بغیر کسی ذریعے کے آگ میں گھس جاتا ہے لیکن اس کے برعکس کھانے پینے والی اشیاء کے پکنے کے لئے ایک آڑ کی ضرورت ہوتی ہے، خواہ وہ دیگ کی شکل میں ہو یا توے کی شکل میں۔

مولانا درج بالا تمام مثالوں کے بعد فرماتے ہیں کہ فقیر درویش وہ ہے جو بغیر واسطے (آڑ) کے انوار الٰہی برداشت کر سکتا ہو۔ شعلوں کو اس کے وجود سے تعلق ہے (یعنی جلال الٰہی کے یہ شعلے اس کے لئے لوہے کی طرح نقصان دہ نہیں) اور وہ ولی براہ راست شعلوں سے کسب فیض کرتا ہے۔ وہ درویش قطب الاقطاب کہلاتا ہے اور وہ اس عالم کے لئے بمنزلہ دل کے ہے۔ جسم کے سارے کمالات دل کی وجہ سے ہیں۔ خدا کا منظورِ نظر یہی قطب الاقطاب ہوتا ہے اور وہ خود کو آب حیات (فیض الٰہی کے جام) پلاتا ہے اور وہ اپنی تمام زندگی اسی آب حیات میں گزار دیتا ہے۔ تمام عالم کے کام اسی قطب الاقطاب کے ذریعے چلتے ہیں۔ اس دل (یعنی قطب) کے بعد پھر جزوی دل (چھوٹے ولی اللہ) بھی دل کی طرح ہی ہوتے ہیں اور قطب الاقطاب ان ولیوں کا منبع (یعنی کان کی طرح) ہوتا ہے۔ جھوٹے اور نااہل پیر گداگر کی طرح ہوتے ہیں جن کی جگہ دروازے پر ہوتی ہے اور ان کو کوئی گھر میں گھسنے نہیں دیتا۔ ایسے غلط پیر کے لئے مولانا فرماتے ہیں کہ جس کا پیر (پاؤں) ٹیڑھا ہو اس کے لئے ٹیڑھا جوتا بہتر ہوتا ہے۔ مولانا کے کلام کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

پس فقیر آنست کو بیواسطہ است　　شعلہ ہا را باوجودش رابطہ است

(پس درویش وہ ہے جو بغیر واسطہ کے (واصل) ہوتا ہے　　(انوار کے) شعلوں کو اس کے وجود سے خاص تعلق ہے)

پس فقیر آنست کو خود را دہد　　آبِ حیوانے کہ ماند تا ابد

(پس فقیر وہ ہے جو خود کو آب حیات پلاتا ہے　　جس سے وہ تا ابد زندہ رہتا ہے)

پس دلِ عالم وَلیست ایرا کہ تن ــــ می رسد از واسطہ ایں دل بفن

(وہ درویش عالم کے لئے (بمنزلہ) دل کے ہے کیونکہ جسم (یعنی عالم) اسی دل کے واسطے سے ہنر تک پہنچتا ہے)

باز ایں دل ہائے جزوی چوں تن است ــــ بادلے صاحب دلے کو معدن است

(پھر یہ جزوی دل (چھوٹے ولی) جسم کی طرح ہیں اور صاحب دل (بڑا ولی) اس کے لئے بمنزلہ کان کے ہے)

درج بالا کلام سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی سنت اس بات پر قائم ہے کہ وہ فیض کسی نبی یا ولی کو براہ راست عطا کرتا ہے اور اس نبی یا ولی کے ذریعے یہ فیض بقدرِ استطاعت عام لوگوں کو (جو اس فیض کے لینے کے اہل ہوتے ہیں) تقسیم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ کو خدا اور عام بندے کے درمیان برزخ کہتے ہیں اور ان سے فیض لینے کا ذریعہ ان بزرگوں سے رابطہ قائم کرنا ہے۔

شیخ جو عالمِ ملکوت سے ملا ہوا ہو تمہارے غم اور انقباض دور کر دے گا

مولانا رومؒ مثنوی کے حصہ دوم میں فرماتے ہیں کہ غم اور انقباض (روحانی قبض) کی حالت میں شیخ مرید کی جان کا آئینہ ثابت ہوتا ہے۔ اس آئینہ میں وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے اور اپنے عیوب اور خوبیوں کی حقیقت کا بھی علم حاصل کر لیتا ہے۔ مولانا نصیحت فرماتے ہیں کہ شیخ کے اس آئینے کو پاک اور صاف رکھو۔ اس پر (بداعتقادی اور بے ادبی کی) پھونک نہ مارو یعنی اسے برے خیالات سے آلودہ نہ کرو اور اگر ایسا کرو گے تو وہ اپنا منہ چھپالے گا اور تمہیں اس آئینے میں سے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ مرید کو چاہئے کہ شیخ سے مکمل استفادہ کے لئے اعتقاد سے رہے اور کوئی لاف زنی نہ کرے جس سے آئینہ یار مکدر ہو جائے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ کیا تم بے پروائی کے باعث مٹی سے بھی کم تر ہو کیونکہ زمین جب اپنے یار یعنی موسم بہار سے ہم صحبت ہوتی ہے تو طرح طرح کے پھل پھول اگا دیتی ہے اور اس پر اگے ہوئے درخت سر سے پاؤں تک کھل جاتے ہیں۔ مرید کو بھی زمین کی طرح اپنے یار (شیخ) کی صحبت سے اسی طرح استفادہ کرنا چاہئے۔ جب موسم خزاں آتا ہے تو یہ درختوں کے لئے نارسا اور یار ناموافق کی طرح ہوتا ہے۔ درخت خزاں کی صحبت اختیار کرنے سے ناخوش ہوتے ہیں لہٰذا سو جاتے ہیں۔ آپ کی مراد یہ ہے کہ برے آدمی کی صحبت اختیار کرنے سے سو جانا بہتر ہے۔

مولانا فرماتے ہیں شیخ کے چہرے کا آئینہ مرید کی حقیقتوں کی تصویر دکھا دیتا ہے اور وہ اس میں دیکھ کر اپنی خوبصورتی یا بدصورتی کا جائزہ لے لیتا ہے۔ چنانچہ ایسے مرشد کا وجود بہت قیمتی چیز

ہے، لیکن شیخِ کامل وہ ہوتا ہے کہ جس کا تعلق عالمِ ملکوت سے ہو۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں کہ مکمل آئینے کی تلاش کرو۔ تمہیں دریا پر جانا چاہئے کیونکہ ندی سے کام نہ بنے گا۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

یار آئینہ ست جانرا درحزن　　بر رخِ آئینہ ایں جا دم مزن
(غم میں یار تمہاری جان یعنی روح کا آئینہ ہے، اے پیارے! آئینے پر پھونک نہ مار)

تا نپوشد روئے خودرا از دمت　　دم فرو بردن بباید ہر دمت
(تاکہ تیری پھونک سے وہ اپنا منہ نہ چھپالے، ہروقت تیرا سانس گھوٹے (بند) رہنا چاہئے)

در خزاں چوں دید او باد خلاف　　در کشید او زود سر زیرِ لحاف
خزاں کے موسم میں جب اس نے مخالف ہوا کو دیکھا، تو اس نے فوراً اپنا سر لحاف کے نیچے کر لیا)

آئینۂ جاں نیست اِلّا روئے یار　　روئے آں یارے کہ باشد زاں دیار
(جان کا آئینہ یار کے چہرے کے علاوہ کوئی نہیں، اس یار کا چہرہ جو اس دیار (یعنی عالم ملکوت) کا ہو)

گفتم اے دِل آئینۂ کُلّی بجو　　رو بدریا کار برناید زجُو
(میں نے کہا کہ اے دل مکمل آئینہ تلاش کر، دریا پر جا، نہر سے کام نہ چلے گا)

نقشِ من از چشمِ تو آواز داد　　کہ منم تو، تو منی در اتحاد
(میرے نقش نے تیری آنکھ میں سے آواز دی، کہ میں تو ہوں، تو میں ہے، یگانگت کے معاملے میں)

شیخ سے دوستی کرو گے تو خدا کے دوست بن جاؤ گے

اولیائے کرام کا قول ہے کہ جو تنہا یعنی اپنے آپ عبادت کرے گا تو وہ زیادہ سے زیادہ ایک (زہرہ) ستارے کی طرح بن سکے گا اور اس کے برعکس اگر کسی شیخ کی صحبت میں آگئے تو اس کے سائے میں آفتاب بن جاؤ گے، گویا پیر کی صحبت تنہا عبادت سے بہتر ہے۔ آپ نصیحت فرماتے ہیں کہ شیخ کی تلاش میں جلدی کرنا چاہئے کیونکہ اگر تم اس کی دوستی میں آگئے تو سمجھ لو کہ خدا کی دوستی میں آگئے۔ ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص خدا کی ہمنشینی چاہتا ہے تو اسے کہہ دو کہ جاؤ اولیائے کرام کے حضور میں بیٹھو۔ ایک اور جگہ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں کوئی ولی اللہ مل جائے تو سمجھ لو کہ تمہیں خدا مل گیا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ خلوت اختیار کرنا طریقت کا ایک جزو ہے اور یہ اولیاءاللہ سے ہی سیکھی جاتی ہے۔ کسی کی خلوت میں فضیلت نہیں۔ اغیار سے خلوت مفید ہے اور یار (مرشد) کے ساتھ صحبت مفید ہے۔ شیخ کی صحبت نور افزا ہے اس سے خلوت کرنا اچھا نہیں۔ ان لوگوں کے پاس بیٹھنے سے عقل دوتا (دوگنی) ہو جاتی ہے۔ ان کے نور کے باعث نور فراست بڑھ جاتا ہے اور معرفت کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ مراقبہ اور طریق رابطہ بھی ان ہی کی صحبت میں رہ کر میسر ہوتا ہے۔ شیخ ایک مکمل آئینے کی

طرح ہے جس میں سالک اپنے آپ کا جائزہ لیتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اولیائے کرام کی صحبت میں سالک اس طرح اللہ سے وابستہ ہو جاتا ہے کہ وہاں "میں" اور "تو" میں فرق نہیں رہتا یعنی فنائے کامل حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ سب اس لئے ہے کہ انسان بذات خود عبادت کے اعتبار سے اگر ایک ندی ہے تو مرشد کی صحبت میں دریا سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ مولانا روم فرماتے۔

گر ز تنہائی تو ناہیدے شوی زیرِ ظلِ یار خورشیدے شوی
(اگر تم تنہائی میں کم روشنی والا زہرہ ستارہ بنو گے تو پیر کے سائے میں آفتاب بن جاؤ گے)

رو بجو یارِ خدائے را تو زود چوں چناں کردی خدا یارِ تو بود
(جا تو خدا کے دوست کی جلد تلاش کر لے جب تو نے ایسا کر لیا تو خدا تیرا دوست ہو جائے گا)

آنکہ در خلوت نظر بر دوخت ست آخر آنرا ہم زیار آموخت ست
(جس نے خلوت کو مطمح نظر بنا لیا ہے آخر اس نے اس خلوت کو بھی کسی شیخ سے سیکھا ہے)

عقل با عقلِ دگر دوتا شود نور افزوں گشت رہ پیدا شود
(عقل دوسری عقل کے ساتھ مل کر دوگنی ہو جاتی ہے، نور کی روشنی بڑھ جاتی ہے اور راہ کھل جاتی ہے)

یار چشمِ تست اے مردِ شکار از خس و خاشاک او را پاک دار
(اے شکاری تیری آنکھ تیرا یار ہے۔ کوڑے کرکٹ سے اسے محفوظ رکھ یعنی اس کا ادب کر)

مرید اگر شیخ کا عاشق ہو تو اس کی ذات انوار سے لبریز ہو جاتی ہے

مولانا فرماتے ہیں کہ حکمت اور معرفت جو طریقت کی پونجی ہے صرف شیخِ کامل سے حاصل کی جا سکتی ہے لہٰذا اس کی صحبت میں آنا مراد حاصل کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔ شیخِ کامل کی صحبت چونکہ زیادہ مدت کے لئے حاصل کرنا ممکن نہیں اس لئے ایک سالک طریق رابطہ کے ذریعے طویل عرصے کے لئے بھی صحبت حاصل کر سکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب مرید دل و جان سے اپنے شیخ پر عاشق ہو جائے تو اس کی ذات سراپا انوار بن جاتی ہے۔

طالبِ حکمت شو از مردِ حکیم تا ازو گردی تو بینا و علیم
(مردِ حکیم سے حکمت طلب کرو، تاکہ تم اس کے باعث صاحب بصیرت اور بڑے دانا بن جاؤ)

منبعِ حکمت شود حکمت طلب فارغ آید او ز تحصیل و سبب
(طالبِ حکمت، حکمت کا چشمہ بن جاتا ہے۔ وہ تحصیل (کے طریقوں) اور اسباب سے فارغ ہو جاتا ہے)

اس کے بعد مولانا اپنے شیخ کی ذات سے مل بیٹھنے کے اسرار بیان فرماتے ہیں اور اپنے شیخ سے ربط حاصل کرنے کے فوائد کا احساس پیدا فرماتے ہیں۔

موم و ہیزم چوں فدائے نار شُد ذاتِ ظُلمانیؒ اُو انوار شُد
(موم اور آگ کی لکڑی جب آگ پر فدا ہو گئی تو اس کی تاریک ذات سراپا انوار بن گئی)

سنگِ سرمہ چونکہ شد در دیدگاں سنگ بینائی شد اینجا دیدہ باں
(سرمے کا پتھر جب آنکھوں میں پڑا، تو وہ بینائی بن گیا اور آنکھوں کا محافظ)

چوں تو در قرآن حق بگریختی باروانِ انبیاء آمیختی
(اگر تم قرآن کی طرف رجوع کرو گے تو انبیاء کی ارواح پاک سے مل جاؤ گے)

پس مُصَفّا کن درونِ خویش را تا بدانی سرِّ ہر درویش را
(پس اپنے باطن کو صاف کرو تاکہ ہر درویش کے راز کو معلوم کر سکو)

مولانا روم ؒ فرماتے ہیں کہ صحبت میں بڑی تاثیر ہے۔ بیج جب مٹی اور پانی کی صحبت اختیار کرتا ہے تو انگور بن کر ابھرتا ہے۔ دانہ مٹی میں مل کر اپنا رنگ و بو جب تک ختم نہیں کر دیتا اس وقت تک اس کا پھیلاؤ اور درخت بننا ممکن نہیں ہوتا۔ جب اس کی اپنی صورت ختم ہوتی ہے تو اس کے باطن کا جلوہ نمودار ہوتا ہے۔ اپنی ہستی کے کھو دینے سے ہی سالک کو ایک نئی زندگی کا آغاز نصیب ہوتا ہے۔

بزرگوں سے بندگی سیکھو اور ان کے خلاف دل میں برا خیال نہ لاؤ

مولانا روم ؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ ظاہرداری مکّاری کو دیکھ کر کسی کے زہد کے قائل ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے بچنے کے لئے ایسا نورِ نظر درکار ہے جو تعصب، تقلیدِ آباء اور کجیؒ دل سے فارغ ہو۔ ایسا نورِ قلبی پیدا کرو جو بغیر بات کئے اور کسی کی کرامات کو دیکھے بغیر ہی ولی اللہ کو پہچان لے۔ سالک کے لئے لازم ہے کہ وہ ولی اللہ کے دل میں عقلِ سلیم کی راہ سے گھس جائے اور اس بزرگ کا نقد حال معلوم کر لے اور کسی کی شعبدہ بازی، چرب کلامی اور جھوٹی ولایت کا قائل نہ بنے اور سنی سنائی باتوں پر بھی یقین نہ کرے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اللہ کے خاص بندے روحانی دنیا میں دلوں کے جاسوس ہوتے ہیں۔ جب کسی کے دل میں اولیائے کرام کے متعلق کوئی شک و شبہ گزرے تو یاد رکھو کہ اولیائے کرام پر دلوں کی باتیں بھی کھل جاتی ہیں۔ صوفیہ کا قول ہے کہ جب تم اولیائے کرام کے پاس جاؤ تو دل میں کوئی بری بات نہ رکھو کیونکہ ان کو تمہاری ایسی باتوں کی خبر ہو جاتی ہے۔ "اسلام اور روحانیت" میں راقم الحروف نے اولیاء کی فراست پر ایک باب لکھا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ اولیائے کرام

ایسی باتوں کو اللہ کے نور سے (جو ان کے دل میں ہوتا ہے) دیکھ لیتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اولیائے کرام کو عرش اور لوح محفوظ کی خبر ہو جاتی ہے تو دنیا کے معمولی آدمیوں کے دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو سمجھ لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اصل بزرگ تو وہ ہے جو مرید کو اللہ سے ملا دے۔ ان لوگوں کی کرامات پر نظر نہ رکھو، بلکہ ان سے بندگی کے آداب سیکھنا زیادہ اہم چیز ہے۔

بندگانِ خاص علامُ الغیوب در جہانِ جاں، جَواسیسُ القُلوب
(علام الغیوب (اللہ) کے خاص بندے روحانی دنیا میں دلوں کے جاسوس ہیں)

در درونِ دل در آید چوں خیال پیش شاں مکشوف باشد سرِّ حال
(جب کسی کے دل میں کوئی خیال آتا ہے تو پوشیدہ بھید ان کے سامنے کھل جاتا ہے)

در تنِ کنجشک چیست از برگ و ساز کہ شود پوشیدہ آں بر عقلِ باز
(چڑیا کے جسم میں ایسا کیا ساز و سامان ہوتا ہے کہ وہ باز کی عقل سے چھپ سکے)

آنکہ واقف گشت بر اسرار ھُو سرِّ مخلوقات چہ بود پیشِ اُو
(جو اللہ کے رازوں سے واقف ہو گیا، تو مخلوق کے بھید اس کے سامنے کیا چیز ہیں)

آنکہ بر افلاک رفتارش بود بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود
(جس کی گزر آسمانوں پر ہو اس کو زمین پر چلنا کیا دشوار ہو گا)

اپنے رذائل کی آگ کو کسی شیخ کے نور سے ٹھنڈا کر لو

مولانا روم ؒ مثنوی کی جلد دوم میں ایک مثال نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی راستے پر کانٹے دار درخت لگایا تھا جو گزرنے والے لوگوں کے کپڑے پھاڑ دیتا اور کئی لوگوں کے پاؤں اس سے زخمی ہوتے۔ لوگوں نے اس درخت کے اکھاڑنے کو کہا مگر وہ شخص نہ مانا۔ بہت عرصہ گزر جانے کے بعد جب وہ درخت کافی پھیل گیا تو شکایت حاکم وقت تک پہنچ گئی جس نے اس شخص کو حکم صادر کر دیا کہ وہ اس درخت کو فوراً اکھاڑ دے، لیکن پھر بھی وہ لیت و لعل سے کام لیتا رہا اور کل کل کرتے کرتے بہت عرصہ گزر گیا۔ جب حاکم نے سخت برہمی کا اظہار کیا تو اس شخص نے کہا کہ یہ درخت تو اب بہت مضبوط ہو گیا ہے اور میں اس قدر بوڑھا ہو گیا ہوں کہ اب میرے لئے اس کا کاٹنا ایک مشکل امر بن گیا ہے۔

درج بالا مثال سے مولانا اس حقیقت کو واضح فرماتے ہیں کہ بری عادتیں خار دار درخت کی طرح جڑ پکڑتی اور مضبوط ہوتی جاتی ہیں اور تم روز بروز بوڑھے اور کمزور ہوتے جاتے ہو اور اس کے کانٹے تمہارے لئے اور تمہارے ساتھ ملنے والوں کے لئے باعث تکلیف بنے رہتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ تم اپنے لئے اور دوسروں کے لئے عذاب بنتے جا رہے ہو۔ اس کا علاج یہ ہے کہ جس طرح حضرت علیؓ نے درۂ خیبر کو اکھاڑا تھا اسی طرح یکبارگی حملہ کرو یا پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح جو متوجہ بمخلوق رہتے تھے تم بھی لوگوں کی خدمت میں لگے رہو۔ مولانا ایک تیسرا طریقہ تجویز فرماتے ہیں اور وہ یہ کہ کسی شیخ کی خدمت میں آجاؤ تاکہ تم اپنے کانٹوں کو اپنے شیخ کے عرفان کے درختوں سے منسلک کر لو، اور اس طرح کرنے سے تمہارے شر کی آگ اس کے نور کے وجود کے تلے دب جائے گی اور تمہارے رذائل دور ہو جائیں گے۔ جب تمہارے اندر نفسانی آگ موجود ہے تو اس آگ کو مرشد کے نور سے ختم کرنا آسان ہے کیونکہ مومن کا نور جہنم کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جہنم کی آگ مومن کی خوشامد کرے گی کہ اے مومن تو جلد گزر جا تاکہ تیرا نور میری آگ کو ٹھنڈا نہ کر دے۔ ؎

یا بگلبن وصل کن ایں خار را   وصل کن با نار نورِ یار را

(یا اپنے وجود کے کانٹے کو عرفان کے بوٹے (شیخ) سے منسوب کر لو اور اپنی آتش وجود کے ساتھ یار کا وجود ملا لو)

تاکہ نورِ اُو کشد نارِ ترا   وصل اُو گلبن کند خارِ ترا

(تاکہ اس کے نور کا فیضان تیری آتش (شہوت) کو بجھا دے اور اس کا وصل تیرے (رذائل کے) کانٹوں کو باغ بنا دے)

تو مثالِ دوزخی اُو مومن است   کشتنِ آتش بہ مومن ممکن است

(تو دوزخ کی مانند ہے اور وہ مرشد مومن ہے۔ دوزخ کی آگ کا مومن کے قرب سے بجھ جانا ممکن ہے)

جو اللہ سے صلح کر لے ہر چیز اس سے صلح کر لیتی ہے

جو لوگ ذکر، اذکار اور عبادت الٰہی سے اپنے نفوس کو پاک کر لیتے ہیں تو وہ لوگ اللہ کے حکم سے روئے زمین، بلکہ کون و مکان کی ہر بات پر آگاہی حاصل کر لیتے ہیں۔ روض الریاضین میں ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ شیخ عبدالواحدؒ نے جناب باری تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ الٰہی جنت میں جو لوگ میرے رفیق ہوں گے ان کی زیارت مجھے دنیا میں بھی نصیب فرما دے۔ ان کو بذریعہ الہام اطلاع دی گئی کہ ان میں سے ایک میمونہ سوداء ہے۔ اس کو جا کر دیکھو۔ شیخ عبدالواحدؒ لوگوں سے پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ موصوفہ بکریاں چرانے گئی ہے۔ آپ جب جنگل میں پہنچے تو دیکھا کہ وہ ایک درخت کے نیچے نماز پڑھ رہی ہے اور اس کی بکریاں بھیڑیوں کے ساتھ مل جل کر پھرتی ہیں۔

اس تمام ماجرے کو وہ بہت حیرت سے دیکھتے رہے۔ میمونہ نے سلام پھیرا تو کہا اے عبدالواحد! ملاقات کی جگہ تو جنت ہے، دنیا نہیں۔ تم یہاں کیسے آگئے۔ آپ نے فرمایا جو ہوا سو ہوا مگر تم مجھے اتنا بتا دو کہ تمہاری بکریوں نے بھیڑیوں کے ساتھ کب سے صلح کرلی ہے۔ میمونہ" نے کہا کہ جب سے میں نے اللہ پاک سے صلح کرلی ہے تب سے ہر شے نے مجھ سے صلح کرلی ہے۔ شیخ عبدالواحد" محبت الٰہی اور یاد الٰہی کا ایک بہت بڑا سبق میمونہ" سے لے کر واپس چلے آئے۔

علامہ اقبال" نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں مردِ مومن کی صفات کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ مومن اپنے خیالات کو اس طرح ڈھالتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کو حق تعالیٰ کی مرضی میں گم کر دیتا ہے۔

درخیالش مرضیٔ حق گم شود   ایں سخن کے باورِ مردم شود
(اس کے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کی مرضی ڈھل جاتی ہے   لوگ اس بات پر کیسے یقین کر سکتے ہیں)

اقبال اکادمی کی کتاب افکار اقبال میں اس شعر کی تشریح میں حضرت رابعہ بصری" کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک سفر کے لئے دریائے دجلہ کو عبور کر رہی تھیں۔ جب کشتی دریا کے بیچ پہنچی تو اسے سخت طوفان نے گھیر لیا۔ مسافروں کی چیخ و پکار اور آہ و بکا بلند ہوئی۔ حضرت رابعہ" نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص کشتی کے ایک کنارے پر نہایت اطمینان سے اس طرح لیٹا ہوا ہے جیسے اس کو طوفان کی کوئی خبر ہی نہ ہو۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر آپ سخت متعجب ہوئیں اور اس سے پوچھا کہ کیا آپ کو طوفان کے آنے کا کوئی علم نہیں حالانکہ اس وقت حال یہ ہے کہ کشتی قریب الغرق ہے۔ انہوں نے جواب دیا "میرا اللہ ہم سب کو دیکھ رہا ہے۔ اگر اس کی مرضی کشتی کو ڈبونے کی ہے تو میں کون ہوں جو اس کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکوں۔" انہوں نے اس شخص سے کشتی کی سلامتی کے لئے دعا کی درخواست کی تو اس شخص نے اپنی چادر اٹھائی اور جس سمت سے طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں، اس سمت میں اپنی چادر کو اونچا کر دیا۔ چادر کا ہوا کے آنے والی سمت میں کرنا ہی تھا کہ ہوا تھم گئی اور طوفان ختم ہو گیا۔ رابعہ بصری" کو تجسس ہوا کہ یقیناً یہ شخص اللہ تعالیٰ کا کوئی محبوب بندہ ہے۔ جب اس شخص سے پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ یہ تو کوئی ایسی انہونی بات نہیں۔ یہ تو تم بھی کر سکتی ہو۔ جب رابعہ بصری" نے مزید دریافت فرمایا تو اس نے کہا۔

تَرَکْنَا مَا نُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ فَتَرَکَ مَا یُرِیْدُ لِمَا نُرِیْدُ (افکارِ اقبال)

ہم نے اپنے ارادے اور مرضی کو اللہ کی مرضی کے لئے چھوڑ دیا۔ پس اس نے اپنی مرضی کو ہماری مرضی کے لئے ترک کر دیا۔

ایسے سبق کتابوں سے نہیں بلکہ بزرگوں کی صحبتوں اور نظروں سے ہی سیکھے جاتے

ہیں۔ اولیائے کرام پہلے تو مریدین کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں اور پھر انہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس قسم کے تعلقات استوار کرنے کا سبق دیتے ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ اس سلسلے میں اپنے شیخ کے ساتھ ایک مضبوط ربط کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مرید پر اپنی روحانی کیفیت کو وارد کر سکے۔ ہماری تصنیف "روحِ نماز" میں مزید روایات نقل کی گئی ہیں۔

علوم قولی، فعلی اور صنّاعی میں فرق

مولانا روم ؒ دفتر پنجم میں فرماتے ہیں کہ علوم کا اکتساب قول سے ہوتا ہے تمام نظری علوم قولی ہیں، جو انسان استادوں کی زبان سے اور ماہرین کی کتابوں سے اخذ کرتا ہے مگر جسے حرفت یا صناعی کہتے ہیں وہ محض سننے یا پڑھنے سے نہیں آتی بلکہ وہ کرنے سے آتی ہے۔ فن زرگری، کیمیا، فقر یا درویشی کتابیں پڑھنے سے نہیں آتے۔ درویشی کا مقصد تنویر یا تزکیہ باطن ہے۔ اگرچہ اچھے اقوال اور اعمال اس کے معاون ہو سکتے ہیں مگر اس کا اصل فیضان کسی اہل دل کی محبت سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس فیضانِ محبت سے جب انشراح صدر ہوتا ہے تو انسان کے اندر آبِ حیات اور حکمت کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ یہ چشمہ اندر سے بحر بیکراں سے ہمکنار ہے۔ روحانیت سینوں سے سینوں میں منتقل ہوتی ہے اور اس کا بہترین طریقہ صحبت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے شیخ کی ذات سے طریقِ رابطہ اختیار کرنا ہے۔ یہ علم سینہ ہے علم سفینہ نہیں۔ مولانا روم ؒ فرماتے ہیں ؎

علم آموزی طریقش قولی است   حرفت آموزی طریقش فعلی است

(علم سیکھنا ہو تو اس کا طریقہ اقوال سننا ہے۔ دستکاری سیکھنا ہو تو اس کا طریقہ عملی کام کرنا ہے)

فقر خواہی، آں بہ صحبت قائم است   نہ زبانت کار می آمد نہ دست

(فقر چاہتا ہے تو یہ صحبت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں نہ تیری زبان کام آتی ہے نہ ہاتھ)

تا دلش را شرح آں سازد ضیا   بس اَلَمْ نَشْرَحْ بفرماید خدا

(چونکہ فقر سیکھنے والے کے لئے ایک نور سینے کی انشراح کرتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "کیا ہم نے تیرا سینہ کھول نہیں دیا")

درجات کا تعین قربِ الٰہی کے مطابق ہوتا ہے

احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر شخص کا درجہ، اس کے قرب الٰہی کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی جس کو جتنا قرب الٰہی میسر ہوا اس کا درجہ بھی اتنا ہی بلند ہوا۔ احادیث میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کو تخلیق فرمایا اور اس کو ایک نہایت طویل مدت تک (شاید ۷۰،۰۰۰ x ۷۰،۰۰۰ سال سے زائد) اپنے قرب میں رکھا اور اس

کے بعد باقی مخلوقات کو تخلیق فرمایا۔ لہٰذا جو قرب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیب ہوا وہ کسی دوسرے نبی یا فرشتے کو حاصل ہونا ممکنات سے خارج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص اس قرب کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا جو قرب کا مقام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ غالباً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے تخلیق فرمانے کا منشاء بھی یہی تھا کہ کسی کو آپ کی ہمسری کا شرف نہ مل سکے۔

حضرت مجدّد الف ثانی ؒ نے مکتوبات شریف میں لکھا ہے کہ انہوں نے تمام اولیائے کرام، صحابۂ کرام، اہلِ بیت اور صحابۂ اربعہ حتیٰ کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامات کا مشاہدہ فرمایا اور ان کے قرب کے مقامات میں عبور حاصل کیا جس کو کچھ لوگوں نے غلط رنگ دیا اور کہا کہ حضرت مجدد علیہ الرحمہ خود کو ان تمام مقامات سے بلند اور بالا تصور کرتے ہیں حالانکہ آپ نے صرف ان مقامات کی زیارت کرنے کا ذکر فرمایا ہے اور خود کو ان مقامات کے عکس سے رنگین اور منقش پانے کا ذکر فرمایا ہے۔ جب ان آخری مقامات پر قیام کرنا کسی رسول کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا تو حضرت مجددؒ خود کو ان مقامات سے بلند و بالا کس طرح تصور کر سکتے ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ طریق رابطہ میں کامیابی سالک کی روح کی بلندی اور اس کی قوت پر مدار کرتی ہے۔ اگر سالک کی روح قوی اور صحت مند ہو تو رابطہ میں بھی تقویت اور استواری کا اظہار ہو گا۔

رابطہ وصل اِلی اللہ تک لے جاتا ہے

وصل کے لفظی معنی "ملانے" کے ہیں اور یہ اسم عین (ذات) اور معنی دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اَلْاِتِّصَالُ کے معنی اشیاء کے باہم اس طرح متحد ہو جانے کے ہیں جس طرح کہ قطر دائرے کے دونوں طرفین سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ (المفردات)

وصالِ تعین کا اٹھ جانا، ہستیٔ مجازی سے جدائی کا واقع ہو جانا اور اپنی خودی کے وہم سے بیگانہ ہو جانا وصالِ حق ہے (یعنی جو اپنی مجازی ہستی سے یا اپنے آپ سے الگ ہو جائے وہ اللہ کا وصال حاصل کر لیتا ہے) اور وہ شخص آشنائے حق ہو جاتا ہے۔

تو مباش اصلاً کمال این است و بس   تو زتو گم شو وصال این است و بس
(تو اپنے آپ میں قطعاً نہ رہ، بس یہی کمال ہے۔ تو اپنے آپ سے گم ہو جائے بس وصال یہی ہے)

واصل حق بھی حق ہی کہلاتا ہے کیونکہ اگر کسی سے تعینات اٹھ جائیں تو وہ مخلوق نہیں رہتا اور مخلوق کے اثرات اس سے زائل ہو جاتے ہیں۔ (سرّ دلبراں)

وصول بندے کا آئینۂ حق بن جانا اور اس سے ذات کا ظہور واقع ہونا وصول کہلاتا ہے۔
(سرّ دلبراں)

انسان اُسرار باطنی کو نسیان (بھلا دینا) تک پہنچا دے تو اسے اتّصال کہتے ہیں یعنی بندہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو موجود نہ پائے اور اس کا خیال صانع حقیقی کے سوا کسی اور کی طرف نہ ہو۔ یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں کہ تائب پر توبہ کا اور زاہد پر زہد کا اور مشتاق پر حال کا پردہ ہوتا ہے، مگر واصل کو کوئی شے حق سے چھپا نہیں سکتی۔

شیخ ابو سعید القرشیؒ کا ارشاد ہے کہ واصل وہ ہے جس کے پاس خدا خود پہنچے۔ وہ اس بات سے نہیں ڈرتا کہ وصل قطع، ہو جائے گا۔ شیخ سیّاریؒ فرماتے ہیں کہ واصل وہ ہے جس کو خدا کا قرب حاصل ہو۔ حضرت رویمؒ نے فرمایا کہ واصلین وہ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے جوڑ دیا ہو

اور مخلوق سے کٹ گئے ہوں۔ (عوارف المعارف)

رسالہ قشیریہ میں ایک حدیث اِنَّہٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ حَتّٰی اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ فِی الْیَوْمِ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً (میرے دل پر البتہ بادل چھائے جاتے ہیں. یہاں تک کہ میں دن میں ستر بار استغفار کرتا ہوں) کے بعد لکھا گیا ہے کہ آپ حق تعالیٰ سے درخواست فرماتے تھے کہ حقیقت کے غلبے کے وقت وہ آپ کے دل پر پردہ ڈال دے کیونکہ وجود حق کے ساتھ باقی رہنا ناممکن ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے چہرے کا انکشاف کر دے تو اس کے انوار ہر چیز کو جلا دیں گے۔ استغفار میں غفر کے معنی "پردے" کے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب وصال باری کے جلووں کی تابانی زیادہ دیر کے لئے میسر ہوتی تو اس کا برداشت کرنا بہت مشکل امر ہو جاتا تھا۔

رسالہ قشیریہ میں ایک شخص کا واقعہ حضرت منصور مغربیؒ نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص کسی درویش کی خدمت میں مصروف تھا اور اس کے پاس سے اس کی چچازاد بہن گزری اور اس کے دامن کے جلوے کو دیکھ کر وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس درویش کو جب اس قصے کا علم ہوا تو لڑکی کے خیمے میں گیا اور اس نوجوان کی سفارش کی کہ وہ لڑکی اس پر رحم کرے۔ اس لڑکی نے جواب دیا کہ یہ شخص تو میرے دامن کے غبار کی تاب نہیں لا سکتا تو میری محبت کی تاب کیسے لائے گا۔ جلووں کا برداشت کرنا ہر شخص کی ہمت کے مطابق ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے انوار کی تاب نہ لا سکے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو معراج کے موقع پر دیکھا اور آنکھ نہ جھپکی۔

وصول کسے کہتے ہیں؟

امداد السلوک میں ہے کہ وصول اس بات کا نام ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندہ کے قلب پر اپنے نور سے نظر فرمائے اور یہ نور جو بندہ پر غلبہ پا لیتا ہے حق تعالیٰ سے جدا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ نور بھی حق تعالیٰ کی صفتوں میں سے ایک صفت ہے اور بندہ اس کو نور الٰہی کی طاقت سے دیکھتا ہے. اس لئے کہ حق تعالیٰ کی صفات سے بعینہٖ متصف ہونا بشر کی طاقت سے بالکل باہر ہے۔ پس وصال کے معنی بجز اس کے کچھ نہیں کہ دنیا میں سر اور قلب سے مشاہدہ ہو اور آخرت میں آنکھ سے اور یہ جو وصال کے معنی بعض نے سمجھ لئے کہ بندے کی ذات حق تعالیٰ سے متصل ہو جائے تو یہ زندقہ و الحاد ہے. حق تعالیٰ اس اتصال سے بہت بالاتر ہے۔ آخرت کی رویت بھی بلا کیف ہو گی جیسا کہ دنیا کی توحید و معرفت اور علم و ایمان بلا کیف ہیں۔ جب تک دنیا میں کسی کا ایمان کتاب و سنت اور اجماع امت کے موافق نہ ہو گا اس وقت تک اسے آخرت کی رویت بھی ہرگز نصیب نہ ہو گی۔ جو دنیا میں ایمان سے محروم رہا اس کو آخرت میں خسارے کے سوا اور کچھ نہ ملے گا۔

کتاب اللمع میں کسی بزرگ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ وصل کی حقیقت "عقل کا رخصت ہونا" ہے۔ اسی کتاب میں ہے کہ وصل کا مفہوم غائب سے لاحق یا مل جانا ہوتا ہے۔ یحییٰ بن

معاذؓ فرماتے ہیں کہ جس کسی نے جب تک عرش کے نیچے کی اشیاء سے آنکھیں بند نہ کی ہوں وہ عرش کے اوپر جو کچھ موجود ہے وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، یعنی اس نے خالق عرش کے وصل تک رسائی حاصل نہ کی۔ وصل کے اصولوں کو ضائع کرنے کے باعث کسی کو وصل نصیب نہیں ہوا۔ طریق رابطہ میں بھی کوئی ذاتی غرض یا ذاتی مفاد کی صورتوں کا دخل نہ ہو تو اسی وقت مقصود سے ربط قائم ہو گا اور ایسے شخص کو ہی طریقت کی راہ پر استقامت حاصل ہو گی۔

علامہ اقبال نے "وصال" کے لفظ کو "اپنے محبوب سے ملاقات یا وصل" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ آئندہ صفحات میں علامہ اقبالؒ کے درج ذیل مصرع کی وضاحت آئین وصل میں کر دی گئی ہے۔ ۔

ذرّہ ہا صحراست از آئینِ وصل
(وصل سے بہت سے ذرّے صحرا بن جاتے ہیں)

وصل و فصل

وصل و فصل سے مراد دو آدمیوں یا دو گروہوں کی مصالحت اور نزاع (یعنی انہیں ملانے اور جدا کرنے) کے ہیں۔ علامہ اقبالؒ حکومتِ الٰہی کو واضح کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ بندۂ حق مردِ آزاد ہے۔ اس کی رسم و راہ، دین و آئین، خوب و ناخوب اور تلخ و شیریں وغیرہ سب اللہ کے احکام کے مطابق ہیں۔ انسان معمول کے مطابق اس دنیا میں اپنا فائدہ ہی دیکھتا ہے لیکن حق تعالیٰ کی وحی سب کا فائدہ پیش نظر رکھتی ہے۔ وحی کے احکام صلح و جنگ میں عدل پر مبنی ہیں۔ وہ دوست اور دشمن میں امتیاز نہیں کرتی اور مرد حق کو کسی سے خوف نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی حکومت کے علاوہ اور کسی کی حکومت ہو تو اس میں طاقتور کمزور پر مسلط ہو جاتا ہے اور وہ جبری قانون نافذ کرتا ہے۔ خدائی حکومت نیک و بد اور اچھے اور برے میں فرق پیدا کرتی ہے جبکہ کفر کی حکومت میں زود گیر شاہین، مُمولوں کو اپنے امور حکومت میں مشیر بناتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف   وصل و فصلش لَا یُرَاعِیْ لَا یَخَافُ

(احکام وحی صلح و جنگ دونوں میں عدل پر مبنی ہیں، وہ دوستی اور دشمنی دونوں میں نہ کسی کی رعایت کرتے ہیں اور نہ کسی سے ڈرتے ہیں)

واجب الوجود اور ممکن الوجود کا وصال (یعنی خدا اور بندے کا وصال)

زبورِ عجم کے حصۂ گلشنِ راز جدید میں سوال و جواب کی صورت میں اس مضمون پر تفصیلی کلام کیا گیا ہے۔ درج ذیل شعر میں یہ سوال موجود ہے کہ ممکن الوجود (یعنی انسان) اور واجب

الوجود (یعنی ذات باری تعالیٰ) کا باہم وصال کیسے ہو سکتا ہے اور قرب و بعد اور بیش و کم کی حقیقت کیا ہے؟ اس سے خدا اور بندے کے درمیان رابطہ، ارتباط، تلازم باہمی، ایک دوسرے کی معیّت یا اتّصال کا لزوم مراد ہے نہ کہ ملاقات اور وصل۔ وہ شعر حسب ذیل ہے۔

وصالِ ممکن و واجب بہم چیست حدیثِ قرب و بعد و بیش و کم چیست

اس سوال کے جواب میں علامہ" فرماتے ہیں کہ اس کائنات کے تین ابعاد (Diamensions) ہیں اور چوتھا بُعد وقت یعنی زمان ہے۔ خرد (عقل) سے اس دنیا کے بیش و کم کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس دنیا کے معیار کے مطابق عقل ان ابعاد سے کام لیتی ہے۔ اس کے زمان اور مکان دونوں اضافی ہیں۔ اس دنیا کے زمین و آسمان بھی اعتباری ہیں۔ مثلاً جہاں ہماری نظر رک گئی وہ ہمارے لئے آسمان ہے۔ اس کائنات میں مطلق ذات کو ڈھونڈنا نہیں چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز مطلق نہیں یعنی اللہ تعالیٰ خود قائم ہے اور باقی سب چیزیں اس کی وجہ سے قائم ہیں۔ کائنات کا کنارا اس کے اندر ہی ہے کیونکہ یہ محدود ہے۔ اللہ تعالیٰ کائنات کو ہر دم وسعت دے رہے ہیں۔

علامہ اقبال" فرماتے ہیں کہ ہماری عقل صرف اس دنیا کی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خرد یعنی عقل ابد کو نہیں سمجھ سکتی۔ عقل صرف چھلکے کو دیکھتی ہے مغز کو نہیں جانتی۔ ہم نے ماہ و سال کا تعین اس دنیا کے مطابق کیا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وقت ایک بسیط آن واحد ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل میں منقسم نہیں ہوتا۔ سورہ الاحقاف آیت ۳۵ میں ہے کہ اس دنیا میں گزاری جانے والی طویل عمر اللہ کے ہاں جانے کے بعد محض ایک آن یا لمحہ کی طرح محسوس کی جائے گی۔ علامہ اقبال" فرماتے ہیں کہ اگر وصال الٰہی مطلوب ہے تو اپنے آپ تک پہنچ جاؤ۔ باہر کے ہنگامے چھوڑ دو اور اپنے ضمیر کے اندر اتر جاؤ۔ تن اور جان اگرچہ دو چیزیں ہیں مگر ان کو الگ سمجھنا حرام ہے۔

علامہ فرماتے ہیں کہ فرنگ نے جب بدن کو روح سے الگ سمجھا تو انہوں نے مذہب اور حکومت کو بھی الگ کر دیا حالانکہ اسلام میں ایسا کرنا درست نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت مکر و فن میں لگ گئی اور تن بے جان ہو گیا۔ علامہ مسلمانوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ عقل کو دل کے ساتھ لے کر سفرِ حیات طے کریں۔ اگر مسلمان ترک قوم کی طرح فرنگ کی تقلید کرنے لگے تو وہ اپنے دین سے دور ہو جائیں گے۔

علامہ فرماتے ہیں کہ انسان جس کائنات کو دیکھتا ہے وہ تو محض ایک مشت خاک ہے۔ فلاسفر مردہ بدن کی آرائش میں مصروف ہیں۔ ان کے پاس دم عیسیٰ اور ید بیضا جیسی کوئی چیز موجود نہیں۔ دانش فرنگ حکمت سے خالی ہے۔ پیچ و تاب کھانے والی اس (متغیر) کائنات پر انحصار کرنا درست نہیں، بلکہ انسان کو اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی

پانے کی طرف توجہ دینا چاہئے۔ انسان عالم جزوی ہوتے ہوئے پوری کائنات سے اکبر ہے۔ عقل نے جو ایجاد کیا ہے اس کو بھی سمجھنا ضروری ہے مگر اسی میں ہی گم نہیں ہو جانا چاہئے بلکہ اپنے اندر سفر جاری رکھنا چاہئے۔ عقل کی مدد سے اس جہان چون و چند کو اپنے تصرف میں لاؤ اور اس دنیا کی گرفتاری سے نکل کر اپنے مقام کو جو اس کائنات سے باہر ہے تلاش کرو اور ایسے جہاں کی طرف توجہ کرو جو ہر سمت اور جہت یا زمان و مکاں سے آزاد ہے۔

اس تمام گفتگو سے علامہ ؒ کی مراد یہ ہے کہ مادی دنیا کی طرف صرف اتنی توجہ دینا ضروری ہے جس سے نظام حکومت اور کاروبار حیات چلتا رہے۔ بندے کی حقیقی توجہ کا صرف اللہ کی طرف مرکوز ہونا ایک مسلمان کے لئے زیادہ اہم ہے۔ اگر کوئی اس طرح زندگی کو ڈھال سکے تو بندہ واصل باللہ ہو جاتا ہے۔ اختصار کے پیش نظر علامہ اقبال ؒ کا متعلقہ کلام یہاں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

آئینِ وصل

آئین کا لفظ اسم ہے اس کے معنی طرز، اصول یا ہر قسم کی تنظیم کے ظاہر کرنے کے ہیں اور اس سے مراد ادائیں، آئینِ قدرت یا تقدیر بھی لئے جاتے ہیں۔ جیسے علامہ اقبال ؒ نے فرمایا ہے۔

کارہا پابندِ آئیں بود شد (بہت سے کام ایک آئین کے پابند تھے، اس لئے ایسا ہوا)

وصل کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ آئینِ وصل، مرکبِ ناقص ہے جس کے معنی میں اس اصول کا ہونا لیا جاتا ہے جو قدرت نے سمندر کے قطرے کا بھاپ بن کر اڑنے اور پھر بادل کی شکل میں برسنے اور اپنی اصل (یعنی سمندر) سے مل جانے کے لئے بنا دیا ہے۔ ایسا ہی اصول ذرّوں کے لئے بنایا ہے جنہیں ہوائیں اور آندھیاں اڑا کر لے جاتی ہیں اور وہ مل کر ریت کا میدان بن جاتے ہیں۔ اسی طرح حالات انسانوں کو ایک دوسرے سے ملنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور مختلف طبیعتوں کے انسان مل بیٹھتے ہیں۔ روحوں کے ملنے کا بھی آئین ہے۔ کچھ روحیں پہلے عالم ارواح میں مل بیٹھتی ہیں تو اس دنیا میں بھی ان کا ملاپ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کبھی کسی سے پہلی ملاقات پر ہی محسوس ہوتا ہے کہ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔ یہ روحوں کے اتصال کے باعث ہوتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ روحوں کا ایک دوسرے سے فیض لینا مقدر میں لکھا جا چکا ہے، لہٰذا کسی نہ کسی بہانے سے وہ ایک دوسری سے فیض لینے کے لئے باہم مل جاتی ہیں۔ علامہ اقبال ؒ فرماتے ہیں کہ جو کائنات کو مسخر کرتا ہے، وہ پہلے خود کسی آئین کا پابند بنتا ہے (مراد اس آئین سے آئینِ اسلام ہے)۔ ہوا پھول کے قید خانے میں رہ کر خوشبو بن جاتی ہے اور خوشبو قید ہو کر آہو کا نافہ بن جاتی

ہے۔ ستارے اسی قانون میں رہ کر اپنی منزلیں طے کرتے ہیں۔ گلِ لالہ ہمیشہ جلتا رہتا ہے۔ سبزہ قانونِ قدرت کی پابندی سے اگتا ہے۔ جب قطرے اور ذرے اس وصل کے قانون کی پابندی کرتے ہیں تو قطرے سے دریا اور ذرّے سے صحرا بن جاتے ہیں۔

قطرہ ہا دریاست از آئینِ وصل ذرہ ہا صحراست از آئینِ وصل
(وصل کے قانون کی پابندی سے قطرے دریا اور وصل سے ہی ذرّے صحرا بن جاتے ہیں)

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی تو چرا غافل زایں ساماں روی
(ہر شے کی حقیقی پختگی آئین سے ہے تو کیوں اس سامان سے بے خبر جارہا ہے)

آئینِ وصل کے اصولوں کے مطابق سالک کے لئے لازم ہے کہ وہ آئینِ اسلام پر عمل پیرا ہونے کی نیت سے کسی مردِ حق پرست کے ساتھ ربط قائم کرے تاکہ اس آئین کے تحت وہ واصل باللہ ہو سکے۔

وصل کی راہ میں رکاوٹیں

نشانِ منزل (ص ۲۲۲ پر) راقم الحروف نے اللہ تعالیٰ کے وصال کی راہ میں چار رکاوٹوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس جگہ تنگیٔ قرطاس کے باعث فقط ان کا خلاصہ بیان کیا جارہا ہے۔ یہ وہ رکاوٹیں ہیں جو ابلیس نے خدا کے وصل کی راہ میں انسانوں کے لئے نافذ کی ہیں۔ کچھ صوفیا کا خیال ہے کہ یہ رکاوٹیں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی راہ کے لئے حائل کی ہیں تاکہ مجھ تک صرف وہی انسان آسکیں جو ان بندشوں کو توڑنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس کی مثال یوں پیش کی جا سکتی ہے کہ گورنمنٹ ہاؤس کے دروازے سے لے کر گورنر کی رہائش گاہ تک پہنچنے کے لئے چند پہرے دار یا حکومت کا عملہ کئی جگہوں پر متعین کیا جاتا ہے اور گورنر سے صرف وہی مل سکتا ہے جس کے پاس ملنے کی سند موجود ہو اور کئی جگہوں پر تفتیش کا ہونا اس غرض سے ہوتا ہے کہ کوئی غلط آدمی گورنر تک نہ پہنچ سکے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں چار رکاوٹوں کا حائل کرنا ابلیس کے ذمہ پر عائد کیا گیا ہے۔ ابلیس کی مذکورہ چار رکاوٹیں یا حربے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ **علم نافع سے محروم کر دینا :** حضرت امام غزالیؒ کا قول ہے کہ علم ایک کیفیت پیدا کرتا ہے اور اعمال اس کیفیت سے ہی صادر ہوتے ہیں۔ اپنی اور خدا کی پہچان (معرفت) کے لئے علم ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ بے علم لوگوں کے لئے خدا تک پہنچنا بعید از ممکنات ہے۔ اس علم سے مراد صرف مدرسوں کا علم ہونا مقصود نہیں۔ ان پڑھ اشخاص بھی بہت عالم فاضل ہو سکتے ہیں۔ ابلیس نے شیاطین کو اس بات پر تعینات کیا ہے کہ لوگوں کو دین کا علم حاصل نہ ہونے پائے، چنانچہ ہمارے تقریباً ۹۵ فیصد سے زائد مسلمان علمِ دین سے نابلد ہیں یعنی تقریباً ۹۵ فیصد لوگ تو صرف اسی بات پر واصل باللہ ہونے سے روک دیئے جاتے ہیں کہ ان کو دین کا قطعاً کوئی علم نہیں ہوتا۔ اس قسم کے لوگوں کی

اکثریت بے نمازیوں کی جماعت میں ہوتی ہے۔ ابلیس کی خواہش یہ ہے کہ مسلمانوں کو نہ تو دین کا علم ہو اور نہ ہی وہ دین کی طرف مائل ہوں اور اس طرح واصل باللہ ہونے کے بجائے واصلِ جنہم ہو جائیں۔ معاذ اللہ اکثر مسلمانوں کو نماز، وضو اور غسل کے فرائض کا بھی علم نہیں۔ فرض اور واجب میں کیا فرق ہے؟ یہ تو اکثر نمازیوں کو بھی معلوم نہیں۔ اس رکاوٹ کا علاج یہ ہے کہ پورے ذوق کے ساتھ علم حاصل کیا جائے، یعنی ایسا علم جو ضروری اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

۲ - ذوقِ عمل کو التوا میں ڈالنا : اگر مسلمانوں کی ایک قلیل جماعت علم کو حاصل کر لے یا کوئی عالم مسلمانوں کے ایک گروہ کو یکجا کر کے ان کے علم کی کمی کو پورا کر دے تو ابلیس کے پہلے حربے کا تدارک تو ہو جائے گا مگر ابلیس فوراً اپنے دوسرے حربے یعنی انسان کو عمل سے غافل کرنے کے حربے کو حرکت میں لے آتا ہے۔ دوسرا حربہ (رکاوٹ) یہ ہو گا کہ لوگ عمل کی سعادت حاصل نہ کر سکیں، لہٰذا ابلیس لوگوں میں بہت سے خیالات پیدا کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ عمل کا معاملہ کل پر ٹل جائے، کیونکہ ایک دو دن تک تو یہ جذبۂ عمل بالکل سرد ہو جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ وقت زخموں کو بھی مندمل کر دیتا ہے۔ چنانچہ علم کی کیفیت سے متاثر شدہ لوگوں کے دلوں میں شیطان یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ آج تو نہیں کل سے عمل شروع کر دیں گے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ ابھی تو بہت عمر باقی ہے کچھ دنوں بعد دیکھا جائے گا۔ غرضیکہ ہزاروں بہانے تراش کر مسلمانوں کے دلوں میں عمل نہ کرنے کے لئے القا کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اگر عمل کا جذبہ التوا میں چلا گیا تو یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ انسان ہرگز عمل نہ کر سکے گا۔ اس شیطانی حربے کا علاج یہ ہے کہ انسان دل میں یہ عہد کرے کہ کل سے نہیں بلکہ آج سے ہی عمل شروع کرنا ضروری ہے۔

۳ - تکبّر کے باعث وصل کی راہ سے روکنا : اگر کوئی شخص علم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور عمل کی دہلیز کو بھی پھلانگ گیا تو ایسے شخص کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی اپنے فضل و کرم سے امداد کرے گا۔ ایسے شخص کی زندگی کو صالح کر دیا جاتا ہے اور اس سے کرامات کا صدور ہونے لگتا ہے۔ لوگ اس کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔ اس کی دعا میں قبولیت کا اثر پیدا ہونے لگتا ہے۔ جب ایسا شخص ان تمام خوبیوں کو ملاحظہ کرتا ہے تو شیطان اس بات کا احساس پیدا کرنے لگتا ہے کہ اب تو آپ بہت بڑے بزرگ اور صاحب کرامت ہو گئے ہیں۔ اگر کسی مسلمان کے دل میں ایسے خیالات پیدا ہونے لگیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ تکبر کا شکار ہو گیا ہے اور وہ واصل باللہ تو کیا، شیطان کی طرح راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے۔ شیطان کی اس رکاوٹ کا علاج یہ ہے کہ انسان تکبر نہ کرے اور سمجھے کہ یہ میرا نیک ہونا تو اللہ تعالیٰ کی ایک عطا ہے یا اس شخص کی مہربانی ہے کہ جس نے مجھے نیکی پر مائل کر دیا۔ ایسا سمجھنے سے تکبر پیدا نہ ہو گا۔

۴ - شرک خفی میں الجھا دینا : اگر کوئی مسلمان درجِ بالا تینوں حربوں (رکاوٹوں)

سے کامیابی کے ساتھ نکل گیا تو شیطان اسے شرک خفی میں الجھا دیتا ہے۔ شرک خفی یہ ہے کہ کسی کام کی تکمیل میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور ذات کو فاعل حقیقی یا مددگار سمجھنا۔ اس سلسلہ میں اولیاء اللہ کی دعاؤں کو اللہ کی ہی مدد تصور کیا جانا چاہئے اور یہ کہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں بزرگ کی دعا سے میرا فلاں کام درست کر دیا۔ اس حالت میں بھی فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہی کہا جائے گا۔ شرکِ خفی بہت معمولی نوعیت کا شرک ہے جس سے انسان مشرک یا خارج از اسلام تو نہیں سمجھا جاتا البتہ اولیاء اللہ کی شخصیت سے اس قسم کے شرک کی بھی توقع نہیں کی جاتی۔ اس قسم کے شرک میں مبتلا ہونے والا مرتبہ ولایت پر فائز نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (یعنی اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے محفوظ فرما...... ابراہیم آیت ۳۵) یہاں بتوں کی پوجا سے مراد سونے چاندی اور دولت کے بت ہیں اور اس دعا میں ایسے بتوں کی محبت سے پناہ مانگی جا رہی ہے نہ کہ پتھر کے بتوں سے کیونکہ انبیاء سے اور ان کی اولاد سے یہ بات ہرگز متصور نہیں ہوتی کہ وہ بتوں کی پوجا کریں۔ چنانچہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کو ہی فاعل حقیقی سمجھنا چاہئے۔ شریعت کے مطابق یہ کہنا شرک خفی ہو گا کہ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو میرا فلاں کام کبھی نہ ہوتا البتہ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو میرے فلاں کام میں مددگار بنا دیا۔

جب کوئی مسلمان شیطان کی مذکورہ بالا تمام رکاوٹوں کو عبور کر لیتا ہے تو اس کے لئے وصل الٰہی کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اگر ایک رکاوٹ پر بھی رک گیا تو وصل الٰہی متصور نہیں ہو سکتا۔

وصول الی اللہ کا مطلب

درجِ بالا کلام سے ظاہر ہوا کہ سالک کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے علم حاصل کرے اور اپنے عقائد اور اعمال کو درست کرے اور اس کے بعد مذکور بالا دونوں حربوں سے بچنے کی تدبیر کرے۔ وصال و اتصال ماسوا اللہ سے منقطع ہو جانے کا نام ہے۔ اس وصال کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ قلب کا حجاب اٹھا دینے کے بعد سالک محبوبِ حقیقی کا جمال دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے لگے اور اس طرح کرنے سے رفتہ رفتہ دوامِ مشاہدہ کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ سالک اس بات کی کوشش کرے کہ وصال کے بعد بلند مقامات یعنی انس اور بسط وغیرہ تک جا پہنچے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری ؓ سے فرمایا کہ جو مسلمان بندہ اپنے مسلمان بھائی کی زیارت کے لئے نکلے تو حق تعالیٰ کے لطف و کرم سے ستر ہزار فرشتے اس کے پیچھے چلتے ہیں اور اس کے لئے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ الٰہی اس بندے نے خاص تیرے لئے تیری راہ میں مواصلت اختیار کی اور محض اسلام کی وجہ سے ایک مسلمان سے ملنے کے لئے نکل کھڑا ہوا، تو بھی اس بندہ کو اپنا واصل بنا لے۔

وصال کے یہی معنی ہیں کہ غیر خدا سے چھٹکارا حاصل کر لے اور حق تعالیٰ جل شانہ میں محویت ہو جائے، نہ یہ کہ دو چیزوں کے باہم مل جانے کو خدا اور بندے کے اتصال پر قیاس کرے۔ اس طرح سوچنے سے بندہ مرتد بن جاتا ہے اور اس اتصال کو کفر سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ جتنی غیر اللہ سے دوری ہو گی اسی قدر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو گا اور مرتبہ وصل عروج پکڑے گا۔

مراقبہ غیر اللہ کی نفی کے بغیر ممکن نہیں

حضرت توکل شاہ صاحبؒ کے ایک خلیفہ سے روایت ہے کہ شاہ صاحب ؒ کو کسی نے ایک اشرفی بطور نذرانہ پیش کی۔ آپ نے اس کو اپنی چادر میں باندھ لیا کیونکہ اس وقت کوئی درویش موجود نہ تھا ورنہ عموماً آپ نذرانوں کو فقرا میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ اسی اثنا میں شاہ صاحب ؒ مراقبہ میں مشغول ہوئے مگر مراقبہ میں دل لگانے کے باوجود دل نہ لگا۔ توبہ و استغفار کے بعد بھی وہی پریشانی لاحق رہی۔ آپ نے سوچا کہ خدایا مجھ سے کیا قصور ہوا، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر قدرت نے مدد کی اور دل میں خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ اشرفی اس آفت اور بلا کا سبب ہے۔ جب اس اشرفی کو سڑک پر پھینک دیا تو مراقبہ میں دل لگ گیا۔

روایات میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک مرتبہ جنگل میں عبادت کرنے کے بعد زمین پر آرام فرما ہوئے تو آپ نے شیطان کو دیکھا کہ ان کے پاس کھڑا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ تو یہاں ایک رسول کے پاس کیوں کھڑا ہے؟ کہنے لگا کہ آپ کے پاس میرا سامان موجود ہے، اس لئے میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ پوچھا کہ تیرا وہ کیا سلمان ہے جس کے لئے تو یہاں آیا ہے؟ کہنے لگا کہ آپ کے سر کے نیچے جو اینٹ آرام کی غرض سے موجود ہے وہ میرا سامان ہے۔ چنانچہ آپ نے وہ اینٹ اپنے سر کے نیچے سے نکال کر پھینک دی اور شیطان وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ان حکایات سے معلوم ہوا کہ جب تک کوئی غیر اللہ سے فارغ نہ ہو جائے اس وقت تک مراقبہ یا حضور قلب میں دل نہیں لگایا جا سکتا۔

وصول الی اللہ کے چار رکن

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ؒ نے (رسالہ مکیہ) امداد السلوک میں تحریر فرمایا ہے کہ چار باتیں وصول الی اللہ کی رکن ہیں۔ اول دینِ حق میں عبرت (یعنی دینداروں کو دیکھ کر حرص کرے اور بے دینوں پر متأسف ہو)، دوم مکاشفات و تجلیات کے مشاہدوں کے وقت اعلیٰ حوصلگی رکھے (مشاہدات میں جو کچھ نظر آئے تو اسے مقصود نہ سمجھ لے اور اپنی طلب کو ختم نہ کر دے بلکہ رضائے حق اور وصول و قرب ذات کو اپنا مطلوب سمجھے اور آگے بڑھتا رہے)، سوم ہمت کی حفاظت (طلبِ مقصد میں دیر ہو جائے تو ہمت نہ ہارے بلکہ اگر مشاہدات نہ ہوں تو گھبرا کر طریقت کو ہاتھ سے چھوڑ نہ دے) اور

چہارم شیخ کا احترام اور برادران طریقت پر شفقت کیونکہ یہ باتیں ناقصوں کو نصیب نہیں ہوتیں۔

درج بالا باتوں کے علاوہ مرید کے لئے ضروری ہے کہ ظاہر و باطن اور خلوت و جلوت میں خدا تعالیٰ کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھے اور ہر حال میں اخلاص کی شان کو برقرار رکھے۔ صدق و اخلاص کے بعد قوی امید ہے کہ وصول الی اللہ کے لئے معرفت حاصل ہو جائے گی۔ حضرت ابو درداؓ سے ایک حدیث قدسی منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

مَنْ طَلَبَنِيْ فَقدْوَجَدَنِيْ وَمَنْ طَلَبَ غَيْرِيْ فَلَمْ يَجدْنِيْ (حدیث)

جس نے مجھ کو طلب کیا اس نے مجھے پالیا اور جس نے میرے سوا غیر کو طلب کیا وہ مجھے نہیں پاتا۔

سالک کے لئے ضروری ہے کہ اس کی عبادات اور مکاشفات کا مقصد ذات خداوندی کے لئے ہو نہ کہ جنت کی طمع اور دوزخ کے خوف سے۔ اگر عبادت کا نظریہ ایسا ہو تو خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کو اپنا دوست رکھتا ہے۔ کچھ لوگ وصلِ الہٰی کے تین راستے بیان کرتے ہیں۔ پہلا راستہ اختیار کا راستہ ہے جس میں کثرت صوم و صلوٰۃ، وظائف، ذکر، تسبیح، تلاوت، حج، جہاد اور دیگر اعمال اسلام شامل ہیں۔ دوسرا راستہ ریاضتوں اور مجاہدوں کا ہے جس میں ریاضت شاقہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب اور وصل حاصل ہو جاتا ہے اور تیسرا راستہ عشق و محبت سے مقاماتِ طریقت کو طے کرنے سے متعلق ہے اور یہ سب سے زیادہ موثر اور درمیانی طریقہ ہے۔ اس کے ذریعے تو سالک چند لمحات میں ہی واصل باللہ بن سکتا ہے۔

جائے کہ زاہدے بہ صد ماہ می رسد　　　مستِ شرابِ عشق بہ یک آہ می رسد

(وہ جگہ جہاں ایک زاہد سینکڑوں مہینوں میں پہنچتا ہے، مستِ شرابِ عشق ایک آہ میں پہنچ جاتا ہے)

خود سے غائب رہنے والا ہی خدا کا وصل حاصل کرتا ہے

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بندے پر حیرت ہوتی ہے جو خدا کو پہچاننے کے بعد عبادت کرتا ہے یعنی حیرت اس بات پر ہے کہ وہ بندہ خدا کو پہچاننے کے بعد ہوش میں کیسے رہ سکتا ہے! کیونکہ جس نے اللہ کو پہچان لیا وہ تو اس قدر متحیر ہو جاتا ہے کہ اس کو تو دنیا کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ روایات میں ہے کہ ایک شخص حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں تیس سال تک مصروف رہا لیکن وہ جب بھی آپ کے سامنے آتا تو آپ پوچھتے کہ تیرا نام کیا ہے؟ آخر ایک دن اس شخص نے عرض کیا کہ کیا آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں کہ بار بار مجھ سے میرا نام پوچھتے ہیں۔ فرمایا کہ مذاق نہیں کرتا بلکہ میرے قلب اور روح میں اللہ کا نام اس طرح جاری و ساری ہو جاتا ہے کہ اس کے نام کے سوا مجھے کسی کا

نام یاد ہی نہیں رہتا۔

حضرت داتا گنج بخش" کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ ایک دن حضرت ذوالنون مصری" کا ایک مرید حضرت بایزید بسطامی" کی خدمت میں حاضر ہوا اور دروازے پر دستک دی تو حضرت بایزید" نے پوچھا کہ تو کون ہے اور کسے چاہتا ہے؟ مرید نے عرض کیا کہ بایزید کو! فرمایا وہ کون ہے اور کہاں ہے؟ مجھے تو مدت ہو گئی بایزید کو ڈھونڈھ رہا ہوں۔ میں نے اسے اب تک نہیں پایا۔ حضرت ذوالنون مصری" کو جب حضرت بایزید" کا یہ حال معلوم ہوا تو فرمایا ذَهَبَ اَخِیْ فِی الذَّاهِبِیْنَ فِی اللهِ (یعنی بھائی بایزید" جانے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حضوری میں چلا گیا)

حضرت داتا گنج بخش" فرماتے ہیں کہ خود سے غائب رہنے سے اللہ تعالیٰ کا حضور حاصل ہوتا ہے اور جو خود سے غائب نہیں وہ حاضر بہ حق نہیں ہو سکتا اور جو حق میں حاضر ہے۔ وہ غائب اور یقیناً غائب ہے۔ حضرت جنید بغدادی" فرماتے ہیں کہ ایک وقت مجھ پر ایسا تھا کہ زمین اور آسمان والے میری حیرت پر روتے تھے اور اب کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں ان کی غیبت پر روتا ہوں اور کبھی میں نہ ان سے باخبر ہوتا ہوں نہ خود اپنے آپ سے"۔ آپ کا یہ حال کمال درجے کی حضوری پر دلالت کرتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی" نے فرمایا ہے کہ میں ۳۰ سال تک عبادت کرتا رہا مگر مجھ پر حق تعالیٰ کا دروازہ مصائب کے برداشت کرنے کے بعد ہی کھلا اور جب قلبی لگاؤ کے ذریعے چلا تو منزل تک پہنچ گیا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا کیا کہ کل کائنات کو اپنی انگلیوں کے درمیان دیکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کی معرفت کے ایک حبہ (دانہ) میں جو لذت ہے وہ جنت کی نعمتوں میں کہاں۔ خدا کی یاد میں فنا ہو جانا زندہ و جاوید ہو جانا ہے۔

خداشناسی کے لئے خدا کی محبت ضروری ہے

حضرت بایزید بسطامی" فرماتے ہیں کہ محشر میں اہل جنت کے سامنے کچھ صورتیں پیش کی جائیں گی اور جو کسی صورت کو اپنا لے گا (یعنی اس سے راضی ہو گیا تو) وہ دیدار الٰہی سے محروم ہو جائے گا۔ فرمایا جو خدا شناس ہو وہ خدا کو ضرور دوست رکھتا ہے کیونکہ محبت کے بغیر معرفت بے معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن قلوب کو بار محبت اٹھانے کے قابل تصور نہیں کیا ان کو عبادت کی طرف لگا دیا کیونکہ محبت کا بار سوائے عارف کے اور کوئی نہیں برداشت کر سکتا۔ اگر مخلوق خود اپنی ہستی کو پہچان لے تو خدا کی معرفت خود بخود آجاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ بندے کو ایسا وقت ضرور نکالنا چاہئے جس میں اپنے مالک کے سوا کسی پر نظر نہ اٹھائے۔ حضرت حبیب عجمی" نے ایک روز اپنی کنیز سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ہماری کنیز کو ذرا بلانا۔ اس کنیز نے جواب دیا کہ میں تیس سال سے آپ کے گھر میں کام کر رہی ہوں کیا ابھی تک آپ میری صورت سے آشنا نہیں ہوئے؟ فرمایا کہ گزشتہ تیس سال سے مجھے یہ مجال نہ ہوئی کہ

میں اپنی نظروں کو اللہ کی طرف سے ہٹا کر کسی اور کی طرف ایک لحہ کے لئے بھی کروں، تو پھر تجھے کیسے پہچان سکتا ہوں۔ اگر خدا سے محبت ہو تو بندہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا۔

وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

وصل اور ہجر میں الگ الگ کیفیات پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ وصال میں رویت و دید، ملاپ و سنگم اور حضوری کی لذتیں پائی جاتی ہیں لیکن فراق اور ہجر میں اضطراب، لگن، جستجو اور طلب کی لذتیں اس قدر حیات آمیز ہوتی ہیں کہ عاشق کی دلسوزیاں اسے وہ دولت عطا کر دیتی ہیں جو وصال کے نصیب سے بہت دور ہوتی ہیں۔ افسانوی رنگ میں ان دونوں پر قلم اٹھانے والے مقالہ نویس بہت طویل اور خوبصورت تحریریں پیش کر سکتے ہیں، مگر اس کتاب میں ایسے کلام کی گنجائش نہیں، البتہ چند خوبصورت نکات موضوع گفتگو پر پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال ؒ بال جبریل میں لکھتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاں سوز و ساز کی قدر و منزلت ہے ان کے نزدیک وصل سے بڑھ کر ہجر میں لذت اور شیرینی پائی جاتی ہے۔ سوز و گداز میں جو کیفیات پائی جاتی ہیں وہ وصل کے نصیب سے بعید ہیں۔ وصل میں آرزوؤں کی موت ہے کیونکہ علامہ اقبال ؒ نے فرمایا ہے کہ "زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش" اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی گریہ و زاری کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ سالکینِ راہ طریقت شب خیزیوں کی آہ و زاری میں جو کچھ حاصل کر لیتے ہیں وہ سالہا سال کی عبادت و ریاضت میں بھی حاصل نہیں ہوتا (اس سلسلے میں کثرت عبادت اور ذوق شب خیزی کا مضمون ہماری کتاب "حسنِ نماز" میں مطالعہ فرمائیں)۔ مولانا روم ؒ نے مثنوی میں ایک نمازی کا واقعہ لکھا ہے کہ جب وہ مسجد میں نماز کے لئے پہنچا اور اسے معلوم ہوا کہ نماز با جماعت ادا ہو چکی ہے تو اس نے ایک سرد آہ بھری جس کا نور ساتویں آسمان تک گیا۔ ایک عارف نے جب اس نور کو آسمان پر سے گزرتے ہوئے ملاحظہ کیا تو اس نمازی سے کہا کہ اگر تم میری با جماعت نماز کا ثواب لے لو اور اس آہ کا اجر مجھے دے دو تو پھر بھی مجھے خسارہ نہیں۔

علامہ اقبال ؒ نے بال جبریل میں "ذوق و شوق" کی نظم میں لکھا ہے کہ اہل عشق کو کسی کام کی تکمیل میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی کیونکہ یہی جذبۂ ذوق و شوق اور سوز و اضطراب اسے کشاں کشاں اپنی منزل تک کسی حیلے بہانے کے ساتھ یا کششِ ذوق کے باعث کھینچ کر لے جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہمیشہ فراق میں ہی گرمیٔ آرزو پائی جاتی ہے اور "ہائے وھُو" میں موجود گرانمایہ سوزش بھی فراق ہی کی بدولت ہوتی ہے۔ آپ کا نظریہ ہے کہ موج بھی ہمہ وقت فراق کے باعث محو جستجو رہتی ہے اور قطرے کی آبرو بھی فراق میں ہی پائی جاتی ہے کیونکہ جب قطرہ سمندر میں مل جاتا ہے تو اپنی انفرادی حیثیت کو ختم کر دیتا ہے اور پھر اسے کوئی شخص قطرے کے نام سے یاد نہیں کرتا، گویا سمندر کے ساتھ اس کا وصال اس کی موت کا باعث بنتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد
عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
عینِ وصال میں مجھے، حوصلۂ نظر نہ تھا
گرمیٔ آرزو فراق، شورشِ ہائے وھُو فِراق

عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب
گرچہ بہانہ جُو رہی، میری نگاہِ بے ادب
موج کی جستجو فِراق، قطرہ کی آبرو فِراق

علامہ اقبالؒ بانگ درا میں "دو ستارے" کی نظم میں لکھتے ہیں کہ دو ستارے جب بہت مدت کے بعد قریب آکر ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارا یہ وصل اگر ہمیشہ کے لئے ہو تو کیا اچھی بات ہو اور اللہ تعالیٰ ہم پر کرم کرے تو ہماری ایک جیسی ہی چمک ہو جائے۔ لیکن ستاروں کا ملاپ (اور دنیا میں بندوں کا ملاپ) جب بھی نصیب ہوتا ہے تو یہ وصل اصل میں فراق کا پیغام بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں وصل کو دوام نہیں بخشا ہر چیز گردش میں ہے۔ ہر چیز کی راہِ معیّن ہے اور اس جہان کو جدائی کے قانون پر بنایا گیا ہے۔ صوفیہ کا خیال ہے کہ وصال اس دنیا کی دولت نہیں۔ یہ تو اگلے جہان کی سوغات ہے۔ یہاں ہم ملتے ہیں تو بچھڑنے کے لئے۔ مگر طریقِ رابطہ کے ذریعے ہم اگلے جہان سے وابستگی حاصل کر لیتے ہیں اور اس رابطے میں وہ سرور ملتا ہے جو انسان کے لئے معراج کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ (یعنی نماز مومنوں کے لئے معراج ہے) والی حدیث سے وہی لذت مراد ہے جو مومن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کے توسل سے حاصل ہوتی ہے اور انسان اس دنیا میں ہوتے ہوئے دوسرے جہان سے منسلک ہو جاتا ہے۔

وصال میں کچھ پابندیاں بھی عائد ہوتی ہیں اور جویانِ وصل کو وصل کے حاصل کرنے کے لئے کچھ قربانیاں دینا ایک لازمی امر ہے۔ وصل کا گھر وہ گھر ہے جو لٹ جانے کے بعد آباد ہوتا ہے۔ وصال حاصل کرنے والے کے لئے کچھ شرائط اور قیود عائد ہوتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ایک نظم وصال کے عنوان سے اور دوسری نظم میں پھول کا تحفہ عطا ہونے کے عنوان سے درج ذیل اشعار لکھے ہیں۔

تری حیات کا جوہر کمال تک پہنچا
دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی

اٹھانے صدمۂ فرقت وصال تک پہنچا
قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی

جمالِ الٰہی کے دیکھنے والا کسی اور طرف نگاہ نہیں کرتا

روایات میں ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت میرے پاس آئی اور اس نے اپنے شوہر کے خلاف شکایت کی کہ وہ مجھ پر سوت لانا چاہتا ہے۔ میں نے کہا "بی بی!

شریعت نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے تو اسے اپنے اس ارادے سے کوئی منع نہیں کر سکتا۔" وہ عورت بولی! "آپ کی بات درست ہے کہ شریعت نے چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی ہے لیکن اگر اسلام اس بات کی اجازت دیتا کہ میں اپنے حسن و جمال کو آپ کے سامنے بے نقاب کر سکتی تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ جس کی بیوی اس قدر حسین و جمیل ہو اس کے لئے دوسری عورت کی طرف توجہ کرنا ہرگز روا نہیں"۔ عورت کا یہ قول سن کر حضرت جنیدؒ بے ہوش ہو گئے اور جب ہوش میں آئے تو آپ نے فرمایا کہ اس عورت کے اس قول سے میرے ذہن میں باری تعالیٰ کا وہ فرمان گھوم گیا جس میں اس نے فرمایا ہے کہ اگر میرے لئے اہل جہان کو اپنا جمال بے نقاب دکھانا روا ہوتا تو اہل جہاں کو معلوم ہو جاتا کہ ان کے لئے میرے سوا کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا ہرگز مناسب نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کا لگاؤ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جائے اس کے لئے یہ ہرگز روا نہیں کہ وہ غیر اللہ کی طرف نگاہ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جب معراج کے دوران اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا تو کسی اور طرف قطعاً متوجہ نہ ہوئے۔ (دیکھئے سورہ والنجم)

نفسانی خواہشات کا ترک وصل میں مدد کرتا ہے

حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا ہے کہ نفسانی خواہشات چھوڑ دینا دراصل واصل الی اللہ ہو جانا ہے اور جو واصل الی اللہ ہو جاتا ہے مخلوق اس کی فرمانبردار ہو جاتی ہے۔ جو شخص بھوک اور مخلوق کی طرف سے اذیت رسانی کو برداشت کرتا ہے اور مخلوق سے خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے وہ خدا کے بہت نزدیک ہوتا ہے۔ آپ کا قول ہے کہ خدا کی یاد کا مفہوم اپنے نفس کو فراموش کر دینا ہے۔ جو شخص خدا کو خدا کے ذریعے شناخت کرتا ہے وہ زندہ و جاوید رہتا ہے برخلاف اس کے کہ جو اپنے نفس کے ذریعے خدا کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ جب مخلوق سے کنارہ کش ہو کر انسان کی اپنے عیوب پر نظر پڑنے لگے تو اسی وقت اسے قرب الٰہی محسوس ہوتا ہے۔ فرمایا کہ اگر فرعون فاقہ کشی کرتا تو خدائی کا دعویٰ نہ کرتا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ خواہ عرش، کرسی یا قلم ہو یا کوئی پیغمبر یا فرشتہ ہو تو انسان ان تمام چیزوں کو خود ہی اپنے اندر پاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ انسان حق میں فنائیت کے بعد تمام چیزوں کو اپنے اندر ہی ضم پاتا ہے کیونکہ حق میں سب چیزیں موجود ہوتی ہیں۔

ایک ہی شخص میں ہجر اور وصل کی متضاد کیفیات

انسان خیر اور شر کا نمائندہ ہے۔ کبھی اس پر خیر غالب آجاتی ہے اور کبھی وہ شر سے

اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ وہ کفر کی حدود کے بہت قریب آجاتا ہے اور ذرا سی مزید لغزش ہو جائے تو کفر کی حدود بھی پھلانگ جاتا ہے۔ انسان کی ان کیفیات پر بہت سی احادیث بھی ناطق ہیں. مگر اس کتاب میں اس موضوع پر زیادہ تفصیل میں جانا زیر نظر تحریر کا مقصود نہیں. البتہ یہ حقیقت سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسان کی کیفیات اس کے قلب کی کیفیت پر انحصار کرتی ہیں اور قلب بذات خود تغیرات احوال کا نام ہے کیونکہ یہ بہت جلد ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں منقلب ہو جاتا ہے۔ اسی انقلاب کے باعث اسے قلب کہا جاتا ہے۔ جب ہم کسی شیخ کامل کی تلاش کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہی ہوتی ہے کہ ہمارا دل اچھی کیفیات کی طرف بدل جائے اور مراقبہ اور رابطہ میں بھی ایسا ہی انقلاب رونما ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا کیفیات میں تغیر کے ساتھ ساتھ وصل اور ہجر کی کیفیات بھی بدلتی رہتی ہیں۔ علامہ اقبال بانگ درا کی ایک رباعی میں فرماتے ہیں کہ یہ کاروبار آشنائی بہت پریشان کن شئے ہے اور میرے کلام کی رنگیں نوائی اس سے بھی زیادہ پریشان کن ہے کیونکہ کبھی تو میں وصل کی گھڑیوں میں خود کو لطف کی کیفیت میں پاتا ہوں اور کبھی میں جدائی اور تنہائی کی گھڑیوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ میرا کلام ان دونوں کیفیات سے متاثر ہوتا ہے۔

پریشاں کاروبارِ آشنائی   پریشاں تر مری رنگیں نوائی
کبھی میں ڈھونڈتا ہوں لذّتِ وصل   خوش آتا ہے کبھی سوزِ جدائی

اللہ والوں کے احوال ان کی قلبی کیفیت کی تبدیلی سے تو بدل ہی جاتے ہیں لیکن قلبی کیفیتوں کا دنیاوی اغراض و مقاصد کے لئے بدلنا یا وصالِ الٰہی کا دعویٰ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دور رہنا سوائے نفاق قلب کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کبھی ایک شخص خانہ کعبہ میں بیٹھ کر بھی اللہ سے دور ہوتا ہے اور کبھی صنم خانے میں بتوں کے سامنے بیٹھنے والا مقربِ بارگاہِ الٰہی بن جاتا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ۔

کافرے بیدار دل پیشِ صنم   بہ زدیندارے کہ خُفت اندر حرم
(بیدار دل والا کافر خواہ بت کے سامنے ہو. اس دیندار سے بہتر ہے جو حرم میں بھی سو گیا)

اسلام میں وحدت کے تصور سے صرف یہ بات ہی متصور نہیں کہ مسلمان ایک خدا کو مانیں، بلکہ اس میں وحدت خیالات، وحدتِ فکر و افکار، وحدتِ کردار و عمل اور وحدتِ نظریات کا بھی بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے عمل اور سوچ میں اگر اختلاف و افتراق ہو تو وہ یگانگت اور مماثلت سے خارج اور تفرقہ یا نفاق کا شکار ہو جائیں گے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ایک رات حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھجوروں کا ٹوکرہ مسجد نبوی میں لائی تو آپ نے سب کو دو دو کھجوریں تقسیم فرمائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے

ہیں کہ کھجوریں اس قدر لذیذ تھیں کہ میں نے آپ سے مزید دو کھجوروں کا سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب کے حصے میں دو کھجوریں ہی آسکتی ہیں۔ صبح کی نماز کے بعد بعینہٖ یہی واقعہ پیش آیا اور مسجد میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سب کو دو دو کھجوریں تقسیم فرمائیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مزید کھجوروں کا سوال کیا، تو آپ نے فرمایا "کیا رات کو خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں دو سے زیادہ کھجوریں عطا فرمائی تھیں، جواب تم مجھ سے مزید کھجوروں کا سوال کر رہے ہو؟" افسوس ہے کہ آج مسلمانوں میں یہ ہم آہنگی مفقود ہو گئی ہے۔ علامہ ؒ فرماتے ہیں

سر زمیں اپنی قیامت کی نِفاق انگیز ہے — وصل کیسا، یاں تو اِک قربِ فراق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب — ایک ہی خرِمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
لذتِ قربِ حقیقی پہ مٹا جاتا ہوں میں — اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

علامہ اقبال ؒ فرماتے ہیں کہ جب دنیا کے لوگ آداب بود و باش اور تہذیب انسانیت سے نابلد تھے، اس وقت اسلام نے تمام اہل دنیا کو اخوت، محبت اور خلوص کا سبق سکھایا اور پابند ملت اسلامیہ کو یہ بات ذہن نشین کرائی کہ اگر کوئی قوم ایمان، کمالِ انسانیت اور اخوت کا ارادہ رکھتی ہے تو اسے اخلاق و کردارِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنانا ہو گا اور بو لہبی کے اصولوں سے دور رہنا ہو گا کیونکہ جو لوگ اس کے بین بین رہنا پسند کرتے ہیں، ان کو سوائے منافقت کے اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔ آپ نے ضربِ کلیم میں امرائے عرب کے عنوان سے لکھا ہے کہ ؎

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو — وصالِ مصطفوی ؐ، افتراقِ بو لہبی

وصل میں ہجر کی کیفیات

وہ اولیائے کرام جن کو وصالِ الٰہی میسر ہے، انہیں کبھی وصل میں بھی ہجر کی کیفیات محسوس ہوتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وصال کے اندر جو کیفیات میسر ہوتی ہیں ان کے برداشت کرنے میں صاحب وصال کو مشکل لاحق ہوتی ہے جیسے کہ حیرت شاہ وارثی (راقم الحروف کے جالندھر والے گھر کے ہمسایوں کے ہاں جن کا آنا جانا رہتا تھا) نے فرمایا ہے۔ ؎

جلوۂ خال نے مارا — مجھ کو ان کے جمال نے مارا
لوگ مرتے ہیں ہجر کے مارے — مجھ کو ان کے وصال نے مارا

خواجہ غلام فرید ؒ نے بھی فرمایا ہے۔ ؎

بھانویں ہجر تے بھانویں وصال ہووے — دوناں دیاں دکھ لذتاں نیں
جتھاں خود قرب ہے دوری — اوتھاں کیا ہجر کیا مہجوری

خواجہ غلام فریدؒ فرماتے ہیں کہ جہاں قرب بھی ہجر بن چکا ہو وہاں ہجر اور وصل بے معنی ہو جاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ عاشق کی طرف سے اور معشوق کی طرف سے بھی انانیت کا زور ہوتا ہے۔ انا سے مراد یہ ہے کہ انسانی جسم میں ایک مضغہ ہے اور اس میں فواد (دل) ہے اور فواد میں روح ہے اور روح میں سر ہے اور سر میں خفی اور خفی میں اخفیٰ اور اخفیٰ میں اَنا ہے۔ اس اَنانیت سے اشارہ ہے ذاتِ مطلق (اللہ) کی جانب۔ بندے میں جو اَنا ہے وہ اَنائے حقیقی کی آواز ہے (بازگشت)

ایک اور جگہ حضرت غلام فریدؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ عاشقان الٰہی پیمانوں اور صراحی سے شراب نوش نہیں کرتے بلکہ دریا کے دریا نوش کر لیتے ہیں تاہم وہ اس جوش و جنوں اور تلاطمِ عشق میں خاموش اور پر سکون رہتے ہیں اور کبھی حلّاج کی طرح اناالحق کے نعرے نہیں لگاتے۔ کسی شاعر نے ایک فارسی کی رباعی میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ جب ذات حق ہر جگہ موجود ہے تو سیرالی اللہ (اللہ کی طرف سیر) اور سیر من اللہ (اللہ کی طرف سے سیر) کا کیا مطلب ہوا۔ اسی طرح مولانا رومؒ نے مثنوی میں لکھا ہے کہ جب ہم یہ بات کہتے ہیں کہ فلاں شخص خدا تک پہنچ گیا تو اس قول سے کیا مراد ہے؟ خود ہی دوسرے مصرعے میں فرماتے ہیں کہ یہ سفر مکانی نہیں بلکہ علمی اور غیر فانی ہے۔ جیسے علامہ اقبال نے بھی فرمایا ہے۔

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

اس شعر میں آپ کا مطلب یہ ہے کہ جب سالک علم الیقین سے عین الیقین میں پہنچ کر تقلیدی نہیں بلکہ تحقیقی اور تصدیقی ہو جاتا ہے تو پھر اپنی سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں فرماتے ہیں کہ عملاً سفر سے کچھ حاصل نہیں ہو گا بلکہ خضر علیہ السلام کی طرح گوہر مقصود کو مجمع البحرین سے حاصل کرنا چاہئے (یعنی ایک بحر سالک کے اندر ہوتا ہے اور دوسرا سمندر اللہ کا ہوتا ہے گویا جب سالک کی روح ذات حق میں فنائیت حاصل کر لے گی تو گوہرِ مقصود (اللہ) خود بخود مل جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سالک فانی فی اللہ بھی ہو اور باقی باللہ بھی۔ حضرت شیخ صدر الدین قونوی نے اس رباعی کے متعلق فرمایا کہ اس سے مراد ایک نسبتِ جامعہ کا قائم کرنا مقصود ہے جس میں دو حکم شامل ہوں یعنی حکمِ حقیقت اور حکمِ مجاز۔ حکمِ حقیقت سے بندہ فانی فی اللہ ہو جائے اور حکمِ مجاز سے مقامِ دوئی یعنی شہادت پر واپس آکر باقی باللہ ہو جائے۔ اس طرح سالک عین وصل میں ہجر کے مزے اڑاتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے حضرت باقی باللہؒ کو خط میں لکھا کہ اب میری یہ حالت ہے قرب بھی بعد بن گیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سالک واصل بھی ہوتا ہے اور مہجور بھی۔ اسی کو مقام جامعیّت کہتے ہیں۔

وصل میں فراق کا ہونا

قرآن مجید میں اگرچہ سورہ ق کی آیت ۵۰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (یعنی ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں تو پھر انسانوں کی بہت بڑی کثرت خدا سے دوری اور فراق کی کیفیت کیوں محسوس کرتی ہے؟ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جیسے اوپر بیان ہوا ہے کچھ لوگوں کو وصلِ الٰہی کا شرف بھی حاصل ہوتا ہے مگر وہ وصل میں ہوتے ہوئے بھی خود کو فراق میں ہی تصور کرتے ہیں۔ واصلین کی جماعت میں کچھ ایسے باکمال لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جن کو ہر وقت اللہ کا وصل حاصل ہوتا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں کہ جب وہ ایک لمحہ کے لئے بھی خدا سے حجاب میں آکر غافل ہو جائیں تو وہ خود کو مرتد تصور کرتے ہیں۔ آپ سے یہ قول منقول ہے "اِنَّ لِلّٰہِ عِبَادًا لَوْحَجَبُوْا عَنِ اللّٰہِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ لَاَارْتَدُّوْا"

وصال کی حالت میں ہجر یا فراق کی کیفیات میں امتیاز کرنا صرف اس صورت میں ہی ممکن ہے جب کوئی شخص قرب و بعد کی حقیقتوں کو دیکھنے والی آنکھ بھی رکھتا ہو۔ علامہ اقبالؒ نے اسی بات کو ارمغان حجاز میں ایک رباعی کی صورت میں بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہمارا وصال بھی ایسا وصال ہے جس میں نفس کی آلودگی کے باعث فراق موجود رہتا ہے اور اس بات کو سمجھنے کے لئے کسی اہل نظر کی نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے جو ہماری اس آلودگی کو دور کر سکتی ہو۔ آپ نے ایک مثال کے ذریعے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ موتی اگرچہ دریا کی آغوش میں رہتا ہے مگر دریا میں رہتے ہوئے بھی دریا سے الگ ہوتا ہے اور گوہر کا پانی بہ ابرِ نیساں سے تعلق رکھتے ہوئے بھی دریا سے الگ ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قرب میں رہتے ہوئے اس کی رویت حاصل کرنا اہل طریقت اور اہل نظر کا ہی کام ہے۔ ؎

وصالِ ما وصال اندر فراق است ۔۔۔ کشودِ ایں گرہ غیر از نظر نیست

(اللہ تعالیٰ سے ہمارا وصال، وصال کے اندر بھی فراق ہے۔ یہ عقدہ اہل نظر کے بغیر کھل نہیں سکتا)

گہر گم گشتۂ آغوشِ دریا است ۔۔۔ ولیکن آبِ بحر، آبِ گہر نیست

(بیشک گوہر (خودی) آغوش دریا (باری تعالیٰ) میں گم ہے، لیکن دریا کے پانی اور گوہر کے پانی میں بہت فرق ہے)

عین وصل کی حالت میں بندوں کا خدا سے دوری کی حالت میں رہنے پر ہمیں شعراء کا بہت سا کلام ملتا ہے مگر یہاں فقط چند ایک شعر پیش کئے جا رہے ہیں۔ ؎

اے وائے بد نصیبی کہ ملتا نہیں نصیب ۔۔۔ سایہ کی طرح گرچہ جہاں ہو تم وہیں ہوں میں

اِتّصالِ بےتکیّف، بے قیاس ۔۔۔ ہست "ربُّ النّاس" باجانانِ ناس

(بے کیف اتصال (ملاپ) غیر متصور ہے اگرچہ لوگوں کا رب لوگوں کی جان سے بہت قریب ہے)
دوست نزدیک تر از من بمن است ویں عجب تر کہ من از وے دورم
(میرا دوست (اللہ تعالیٰ) مجھ سے بھی میری نسبت نزدیک تر ہے لیکن یہ زیادہ حیران کن بات ہے کہ میں پھر بھی اس سے دور ہوں)

اللہ تعالیٰ کا قرب جو "نَحْنُ اَقْرَبُ" سے متصور ہے اس سے قرب مکانی نہیں بلکہ قرب صفاتی و حالی مقصود ہے (یعنی ہم بولتے ہیں وہ سنتا ہے یا ہم جو کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے وغیرہ) قرب سے مراد صفات الٰہی سے متصف ہونا، سیرِ قطرہ بہ جانبِ دریا اور حجابِ خودی کا اٹھنا ہے اور بُعد سے مراد صفاتِ بشری میں مقیّد رہنا، لذتِ نفسانی میں گرفتار رہ کر مبدأ حقیقی (اللہ تعالیٰ) سے دور اور حقیقت حال سے بے خبری میں رہنا ہے۔ انسان اپنے سے جتنا قریب ہے حق تعالیٰ سے اتنا ہی دور ہے۔ قرب و بُعد کے ان معانی کو سمجھنے کے بعد، علامہ اقبالؒ کے درج بالا اشعار کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو حافظ شیرازیؒ نے یوں بیان کیا ہے۔
میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست تو حجابِ خودی حافظؔ از میاں برخیز
(عاشق اور معشوق کے درمیان کوئی آڑ نہیں ہے۔ اے حافظ تو خود اپنے لئے ایک پردہ ہے، درمیان سے اٹھ جا)

ہجر بھی وصال کے مقامات میں سے ہے

خودی کی کامیابی اس بات میں مضمر ہے کہ عاشق کو محبوب کی ذات کا ادراک حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی خودی ہمہ وقت اور ہمہ حال جدوجہد میں مصروف رہتی ہے اور جدوجہد کرتے رہنے میں ہی انسان کی اصل کامیابی ہے۔ وصل ہمیشہ دیر طلب ہوا کرتا ہے کیونکہ انسان کی جدائی اور ہجر اس کے وصل کی قدر و منزلت کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو بہترین انداز میں ساخت کیا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو ہر کوئی واصل باللہ بن سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بات کو پسند فرمایا ہے کہ اس کا وصال اس کے حقداروں اور اہلیت رکھنے والوں کو ہی مل سکے ورنہ دوسری صورت میں ہر کوئی جنیدؒ اور بایزیدؒ بننے کا دعویٰ کر بیٹھتا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے کشف المحجوب میں مشاہدے اور مجاہدے کے بارے میں خوبصورت انداز میں بحث کی ہے اور یہ کہا ہے کہ کچھ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مجاہدوں کے بعد مشاہدات حاصل ہوتے ہیں یعنی مَنْ طَلَبَ وَجَدَ یا مَنْ جَدَّ وَجَدَ (جس نے کوشش کی اسی نے پالیا) اس حقیقت کو قرآن نے بھی درج ذیل لفظوں میں بیان فرمایا ہے:-

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (اَلْعَنْكَبُوْت ۶۹) وہ لوگ جنہوں نے ہمارے معاملے میں مجاہدہ کیا تو انہیں ہم اپنی راہیں ضرور دکھادیں گے۔

اس حقیقت کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم باوجود حصول قرب اور وصل مطلوب کے اور عاقبت کی طرف سے بے فکر کیئے جانے کے دن بھر عبادتیں اور راتوں کو شب بیداریاں فرمایا کرتے تھے اور آپؐ کی عبادات اس قدر زیادہ تھیں کہ مجاہدات سے بھی آگے بڑھ چکی تھیں، حتیٰ کہ سورۂ طہٰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا طٰهٰ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤى (یعنی ہم نے آپ پر یہ قرآن اس لئے نہیں نازل فرمایا کہ آپ اس قدر مشقت میں پڑ جائیں۔ (سورۂ طہٰ: ۲۰)۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے دوسرے گروہ کا قول بھی نقل کیا ہے کہ ان کا نظریہ اس سے بالکل برعکس ہے اور وہ کہتے ہیں کہ مَنْ وَجَدَ طَلَبَ یعنی جس نے پالیا اس نے طلب کیا۔ ایسے لوگ درج بالا آیت کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ وَالَّذِيْنَ هَدَيْنَاهُمْ سُبُلَنَا جَاهَدُوْا فِيْنَا ۔ یعنی جنہیں ہم نے راہ دکھائی انہوں نے ہی ہماری راہ میں مجاہدہ کیا۔ ان کا قول ہے کہ جن کو مشاہدہ یا قرب نصیب ہو جائے تو یہ وہی لوگ ہیں جو مجاہدات میں لگے رہتے ہیں۔ اس بحث کو انشاء اللہ ہم اپنی کتاب "اسلام اور روحانیت" میں مزید تفصیل سے بیان کریں گے۔ فی الحال اس موضوع پر نشان منزل کے صفحات ۱۴۴ تا ۱۶۱ مطالعہ فرمائیں۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کا موقف یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ رسیدہ (یعنی پہنچا ہوا) آسودہ ہوتا ہے مگر طالب پر آرام اور آسودگی درست نہیں۔ اس کو مجاہدہ کرتے ہی رہنا چاہئے تاکہ مشاہدوں (وصول) کی راہ کھل جائے۔ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اطاعت کی طرف قدم اٹھاتے ہیں، توفیق الٰہی بھی انہیں کا مقدر بنتی ہے۔ علامہ اقبال نے رسائی کا اصول یوں بیان فرمایا ہے۔ ؎

خودی روشن زنورِ کبریائی است ‌ ‌ رسائی ہائے او از نارسائی است
(خودی اللہ تعالیٰ کے نور سے روشن ہے۔ انسان کی کوشش ناتمام میں ہی اس کی کامیابی ہے)
جدائی از مقاماتِ وصالش ‌ ‌ وصالش از مقاماتِ جدائی است
(اس (اللہ) کا ہجر، اس کے مقامات وصال میں سے ہے اور اس کا وصال، مقامات جدائی میں سے ہے)

جو کوئی واصل باللہ ہو گیا وہ بھی ایک بایزیدؒ ہے

حضرت شمس الدین سیالویؒ نے ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے كُلُّ تَقِيٍّ وَّنَقِيٍّ فَهُوَ آلِيْ یعنی ہر متقی اور پاکیزہ میری (روحانی) اولاد میں

ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مرید بھی شیخ کی روحانی اولاد میں شامل ہوتا ہے اور جب مرید شیخ سے رابطہ قائم کرے تو وہ اپنے شیخ کی ذات میں اس طرح ڈوب جائے کہ اپنی کسی حرکت و سکون کو اپنا نہیں بلکہ پیر کا سمجھے حتیٰ کہ پیر و مرید کی صورت ایک جیسی ہو جائے۔ فرماتے ہیں کہ شیخ بہاؤالدین زکریاؒ اور شیخ شہاب الدینؒ جب ایک جگہ بیٹھ جاتے تو لوگ دونوں میں تمیز نہ کر سکتے تھے۔ ان کا درجہ اتحاد اس قدر بڑھ گیا تھا کہ دونوں کی شکل و صورت بھی ایک ہو گئی تھی۔ حضرت سیالویؒ فرماتے ہیں کہ مرید صادق کو اپنی حاجت پیر کے آگے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پیر کی امداد ہر وقت مرید کو پہنچتی رہتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ مرید پیر کی محبت اور اطاعت میں اس طرح غرق ہو جائے کہ وہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مظہر کو دیکھ سکے بقول مولانا رومیؒ۔

گر تو ذاتِ پیر را کردی قبول　　　　ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسولؐ
گر جدا بینی زحق تو خواجہ را　　　　گم کنی ہم متن، ہم دیباچہ را

(اگر تو نے پیر کی ذات کو قبول کیا ہے تو پیر کی ذات میں خدا اور رسول دونوں شامل ہو گئے اور اگر تم نے خواجہ یعنی پیر کی ذات کو خدا سے جدا دیکھا تو گویا تم نے کتاب حق کا دیباچہ اور متن دونوں کو الگ کر دیا۔)

حضرت سیالویؒ نے فرمایا کہ ہر وقت تصور شیخ کا شغل کرنے سے نفسانی خطرات اور شیطانی وسوسوں سے رہائی ملتی ہے۔ یہ رابطہ گناہوں کے مقابلے میں ڈھال ہے۔ ذکر اور تصور شیخ سے مرید اپنی منزل مقصود تک جلد پہنچ جاتا ہے۔ اولیائے کرام کے ہاتھ اور پاؤں چومنا جائز ہیں کیونکہ حدیث میں صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اور پاؤں کا بوسہ دیا ہے بلکہ جبریل علیہ السلام نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج پر لے جانے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلوؤں کو بوسہ دیا مگر اولیا کے علاوہ امراء اور سلاطین کے ہاتھوں کو بوسہ دینا جائز نہیں۔ ہر سلسلہ میں ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق مقام محبوبیت حاصل کرتا ہے اور حضرت بایزید بسطامیؒ کی طرح اپنی ایک انفرادیت قائم کر سکتا ہے۔

تو مگو کاندر جہاں یک بایزیدےؒ بود و بس　　　　ہر کہ واصل شد زجاناں بایزیدےؒ دیگر است

(تم یہ نہ کہو کہ دنیا میں صرف ایک ہی بایزید ہو گزرا ہے، بلکہ جو خدا سے واصل ہو گیا وہ بھی ایک طرح کا بایزیدؒ ہے)

ہر شخص یہی سوچتا ہے کہ میں کسی صورت میں بھی بزرگی میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ لیکن لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب کی روحوں کو راہ خدا میں عمل پیرا ہونے کی استطاعت بخشی ہے۔ اگر کوئی شخص کوشش کرے اور اسی طرز پر اپنی زندگی کو ڈھال لے جس پر حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنے شب و روز کو ڈھالا، تو اگرچہ داتا گنج بخشؒ کے مقام و مرتبہ پر تو نہ پہنچ سکے گا (کیونکہ اس

کے لئے ویسا عمل کرنا ممکن نہیں) لیکن ان کے مقام کے آس پاس کہیں تو پہنچ ہی جائے گا۔ قانونِ مکافاتِ عمل اللہ کی طرف سے سب کے لئے یکساں ہے۔ ان پڑھ، بے وقوف اور نالائق شخص بھی اپنی کوششوں کو زیادہ کر دے تو اس کی کوششوں کے مطابق اسے ضرور مقام عطا کیا جاتا ہے۔

واصل باللہ ہونے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ عبادات اور ریاضات کی ادائیگی میں اخلاص نیت کو مدنظر رکھے۔ حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں کہ اگر عبادت سے رب کا ملنا ممکن ہوتا تو مسجد کے مولویوں سے زیادہ واصل باللہ کوئی نہ ہوتا. اور اگر نہانے دھونے سے ملتا تو مچھلیوں اور مینڈکوں کو ملتا اور آخر میں فرماتے ہیں۔ ۔

رب انہاں نوں ملدا باہو، نیتاں جنہاں دیاں اچھیاں ھوُ

واصل باللہ ہونے کی نسبت جنت میں داخل ہونے کی راہ قریب ہے

حضرت ابوالحسن خرقانیؒ فرماتے ہیں کہ جنت میں داخلہ کی راہ قریب ہے لیکن واصل الی اللہ ہونے کی راہ دور ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسان کو دن میں تین ہزار بار مر کر زندہ ہونا چاہئے پھر کہیں جا کر شاید ایسی حیات جاوداں حاصل ہو سکے جس کے بعد موت نہیں۔ (نفی اثبات میں اپنے وجود کو ختم کرنا اور پھر وجود میں آنے کا عمل پایا جاتا ہے۔ اس سے مر مر کر زندہ ہونا مراد ہے۔ ایسے ہی اچھی خواہشات کو اس طرح ترک کرنا کہ ہر خواہش پر دم نکلے، بار بار مرنے کے مترادف ہے) آپ فرماتے ہیں کہ جب تم راہ خدا میں اپنی ہستی کو فنا کر لوگے تب تمہیں ایسی ہستی مل جائے گی جو فنا ہونے والی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے پر ایک ایسا راستہ کھل جاتا ہے جس سے معرفت و شہادت نصیب ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس راستے سے بندے پر خود کو ظاہر کر دیتا ہے۔

حضرت ابوالحسن خرقانیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر بندے کو کسی نہ کسی مشکل سے دوچار کر کے اپنے سے جدا کر دیتا ہے لیکن شجاعت یہ ہے کہ بندہ تمام چیزوں کو چھوڑ کر خدا سے اس طرح رابطہ قائم کر لے کہ وہ اسے اپنے سے کبھی جدا ہی نہ کرے۔ فرمایا زمین پر بہت سے چلنے پھرنے والے لوگ مردہ ہیں اور زمین میں بہت سے مدفون لوگ زندہ ہیں۔ فرمایا کہ عبادت و معصیت (گناہوں) کو چھوڑ کر خدا کے بحر کرم اور دریائے بے نیازی میں اس طرح غوطہ لگاؤ کہ خود کو نیست کر کے اس کی ہستی میں ابھر جاؤ۔ جس کی زندگی خدا کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتی وہ اپنے نفس و قلب اور روح پر قدرت نہیں رکھ سکتا۔ خدا کے ہمراہ مشاہدہ کرنے کا نام ہی بقا ہے۔ خدا اپنے کرم سے اپنی مخلوق میں جس کو چاہے اپنی ذات سے (بذریعہ صفات) آگاہ کروا دیتا ہے اور اگر اپنی صفات کے بجائے اپنی ذات کے ذریعے آگاہ کرواتا تو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے والا کوئی نہ رہتا، یعنی اگر خدا کی ذات سے واقفیت ہو جاتی تو بندے حیرت و تحیر میں اس طرح غرق ہو جاتے کہ کلمہ بھی یاد نہ رہتا۔

رابطہ اور تجلّیاتِ الٰہی

لغت۔ ذات و اسماء و صفات و افعال الٰہی کا کسی پر پھینکا جانا تجلّی کہلاتا ہے۔ لغت میں تجلّی کسی چیز کو ظاہر کرنے یا ظاہر ہونے کو کہتے ہیں۔ ذاتِ مطلق (اللہ تعالیٰ کی ذات) کا ظاہر ہونا براہ راست قابل برداشت نہیں، اس لئے اس کا برداشت ہونا کسی لباس تعین (مخصوص شکل) ہی میں ممکن ہے۔ وہ حالت یا شان جس میں حق تعالیٰ کا یا اس کی کسی صفت کا یا اس کے کسی فعل کا اظہار ہو وہ تجلّی ہے۔ (سرِ دلبراں)

چونکہ اللہ تعالیٰ کے ظہور کی شانیں لاانتہا ہیں اس لئے اس کی تجلّیات بھی مختلف اور لاانتہا نوعیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ہر شخص پر اس کی استعداد کے مطابق جداگانہ تجلّیات ہوتی ہیں۔ جو تجلّی ایک شخص پر ایک مرتبہ ہوتی ہے وہ پھر دوبارہ اس پر یا کسی اور پر نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر لحہ ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔ (دیکھئے سورہ الرحمٰن آیت ۲۹) جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات لامتناہی ہے ویسے ہی اس کی تجلّیات کا نئی نئی شان میں پے در پے وارد ہونا کوئی نئی بات نہیں۔

اے ترا بر طورِ دل ہر دم تجلّائے دگر   طالبِ دیدارِ تو ہر لحظہ موسائے دگر

(اے اللہ! طورِ دل پر ہر دم تیری ایک نئی تجلّی ہوتی ہے۔ تیرے دیدار کا طالب بھی ہر لحہ ایک نیا موسیٰؑ ہوتا ہے)

اللہ تعالیٰ کی تجلّیاتِ خاص صرف اُن لوگوں پر وارد ہوتی ہیں جو اہلِ استقامت ہیں۔ مظہر جانِ جاناں کے ایک شعری کلام میں اسی حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ؎

بر اہلِ استقامت فیض نازل می شود مظہرؔ   نمی دانی تجلّی گِردِ کوہِ طور می گردد

(اے مظہرؔ اہلِ استقامت پر ہی فیض نازل ہوتا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تجلّی کوہ طور کے گرد ہی چکر کاٹتی رہتی ہے)

مخلوق کا وجود حق تعالیٰ کے ظہور یا تجلّی و تمثیل کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ اس کی تجلّی و تمثیل کے بغیر خلق میں سے کسی چیز کی صورت کا ہونا ممکن ہی نہیں۔ یہ ایک دوسرے کے آئینے ہیں۔ آئینۂ ظہورِ حق میں مخلوق کا ظاہر ہونا ضروری ہے اور آئینۂ ظہور مخلوق میں حق تعالیٰ کا ظاہر ہونا بھی ضروری ہے۔

ظہورِ تو بمن است و وجودِ من از تو　　　فَلَسْتَ تَظْهَرُ لولَایَ لَمْ اَکُنْ لَولَاکَ
(تیرا ظہور مجھ سے ہے اور میرا وجود تجھ سے ہے۔　　پس تو ظاہر نہیں ہوتا میرے بغیر اور میں نہیں ہو سکتا تیرے بغیر)

نہ او را بے نمودِ ما کشودے　　　نہ ما را بے کشودِ او نمودے
(حق تعالیٰ کا ظہور ہماری صورتوں کے بغیر نہیں کھلتا۔ اور نہ ہی ہم اس کی تجلی کے کھلنے کے بغیر ظاہر ہو سکتے ہیں)

خواجہ قادر بخش جہانخیلی ؒ اپنے مریدوں سے فرمایا کرتے تھے کہ اپنے محبوب و مطلوب کے سوا کسی کی طرف بھی نہ دیکھا کرو۔ اگر ایسا ہو تو پھر جا کر کہیں کوئی طالب کمال کو پہنچتا ہے اور انوارِ رحمانی اس پر وارد ہوتے ہیں۔ سائیں توکل شاہ صاحب ؒ نے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے کہ حضرت قادر بخش ؒ پر ایسا وقت بھی آیا کرتا تھا کہ ان کا رنگ تبدیل ہو جاتا اور کبھی ان کا رنگ زرد، کبھی سرخ، کبھی سبز اور کبھی سفید ہو جایا کرتا تھا۔ جب ان سے دریافت کیا تو فرمایا توکل شاہ! فقیروں کی حالت ایک جیسی نہیں رہتی اور نہ وہ ایک حالت پر رہتے ہیں۔ جس طرح انوار الٰہی برستے ہیں اسی طرح سالک کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہر روز ایک نئی شان ہوتی ہے جیسا کہ قرآن میں وارد ہے کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَاْنٍ (سورہ الرحمٰن: ۲۹) ایسے ہی سالک کے لطائف کے انوار بھی ہمہ وقت انوار الٰہیہ کے رنگوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں اور جسمانی حالت سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ حضرت قادر بخش ؒ فرماتے ہیں کہ مرید کے لئے لازم ہے کہ مرشد کے باطنی فیض سے اپنے قلب کا تزکیہ اور تصفیہ کرے۔ اگر مرشد کے قلب کی طرف متوجہ ہو جائے تو ضرور کچھ نہ کچھ فیضان حاصل کر لیتا ہے۔ ؎

باسوختگاں بہ نشیں، شاید کہ تو ہم بسوزی　(دل جلے ہوؤں کے ساتھ بیٹھو، شاید تمہیں بھی یہ سوز نصیب ہو)

ذات اور صفات میں فرق

ذات ۔ وجودِ، ہستی، ہست، ذاتِ بحت، ذاتِ صرف، ذاتِ ہُوہُو، ذاتِ ساذج وغیرہ سب کے ایک ہی معنی ہیں، یہ تمام الفاظ وجود حق تعالیٰ کی طرف بلا اعتبار صفات و تعینات کے اشارہ کرتے ہیں۔ ذات باری تعالیٰ کو مرتبہ واحدیت بھی کہتے ہیں کیونکہ اس مرتبہ میں ذات کی جملہ صفات بالاعتبارات کا ظہور ہوتا ہے۔ ذات اس وجود مطلق کو کہتے ہیں کہ جس پر تمام اعتبارات، اضافات، نسبتیں اور وجوہات ساقط کر دی جاتی ہیں، کیونکہ یہ کہا جاتا ہے کہ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (یعنی اس کی مثل کوئی شیٔ نہیں ہے) اور وہ بے چوں اور بے چگون ہے۔

صفات ۔ جن باتوں سے ذات کا ظہور ہو اس کو صفت کہتے ہیں۔ اس کی چند قسمیں ہیں۔

۱۔ **صفات ذاتیہ** :۔ جن کے ساتھ ذات حق تعالیٰ موصوف ہو سکتی ہے اور اس کی ضد کے ساتھ

موصوف نہ ہو سکتی ہو مثلاً قدرت ذات حق تعالیٰ کی صفت ہے اور اس کی ضد (عجز) کے ساتھ وہ موصوف نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح علم سے ذات موصوف ہے، جہل کے ساتھ موصوف نہیں ہو سکتی۔

۲۔ صفاتِ فعلیہ :۔ وہ صفات ہیں جن کی ضد کے ساتھ بھی اس کی ذات موصوف ہو سکتی ہے مثلاً رحمت اور غضب، قہر اور شفقت وغیرہ

۳۔ صفاتِ جمالیہ :۔ وہ صفات جن کا تعلق لطف اور رحمت سے ہو۔

۴۔ صفاتِ جلالیہ :۔ وہ صفات جن کا تعلق جلال اور قہر سے ہو۔

تجلّیاتِ فعلیہ، صفاتیہ اور ذاتیہ کا کھلنا

مکتوب نمبر ۵۸، دفتر اول، حصہ دوم میں (ص ۱۹۴ پر) حضرت مجدد الف ثانی ؒ فرماتے ہیں کہ جس راہ کے طے کرنے کے ہم درپے ہیں وہ سارا سات قدم ہے۔ جس طرح انسان کے سات لطیفے ہیں۔ دو قدم تو عالم خلق میں ہیں جو قالب (بدن) اور نفس سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی عالم امر میں۔ ان سات قدموں میں ہر قدم پر دس ہزار حجابات اٹھاتے ہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ یہ تمام ظلمانی اور نورانی حجابات ستر ہزار ہوتے ہیں۔ اول قدم میں جو عالم امر میں رکھتے ہیں تجلّیٔ افعال ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرے قدم میں تجلّیٔ صفات اور تیسرے قدم میں تجلّیاتِ ذاتیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر تجلّیات میں فرق کے مطابق آگے ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ ان سات قدموں میں بندہ اپنے سے دور اور حق سبحانہ کے نزدیک ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان قدموں کے مکمل ہونے سے قرب الٰہی بھی مکمل ہو جاتا ہے اور اس وقت وہ فنا اور بقا سے مشرف ہو کر ولایت خاصہ کے درجے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ میں سیر کی ابتدا عالم امر سے اختیار کی جاتی ہے اور عالم خلق کو بھی اس سیر کے ضمن میں طے کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ طریقہ (نقشبندیہ) سب طریقوں سے زیادہ قریب ہے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ لازمی طور پر دوسروں کی انتہاء ان کی ابتداء میں درج ہے۔

انسان کے اندر ایک تجلّی زار موجود ہے

وہ انسان جو روحانی زندگی کو اپنانے کے لئے سرگرداں ہو، ہمہ تن ذات الٰہی کی تجلیات کا متمنی ہوتا ہے۔ ہر انسان کے اندر ایک تجلی زار موجود ہوتا ہے اور اس کو کھولنے کے بہت سے روحانی طریقے بیان کئے جاتے ہیں، جس کا کچھ ذکر راقم الحروف کی کتاب "حضور قلب" میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس تجلّی زار کو دیکھنے کے لئے ایسی حیات طیبہ کی ضرورت ہے جو پاکیزگی کی حامل، اضطراب اور شوق و ذوق سے بھرپور اور ان تمام اسباب کو پیدا کرنے کا عزم رکھتی ہو جو اس تجلّی کے حصول میں

مطلوب ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال" فرماتے ہیں کہ جستجوئے حق میں سرگرداں انسان نے وصل الٰہی حاصل کرنے کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ کو توڑ دیا ہے۔ اپنے وطن اور اپنے مالک سے دوری کو ہٹانے کے لئے انسان کب تک روتا رہتا۔ آخر کار اس نے اس دوری سے بچنے کی راہ نکالی اور وہ جلووں کی تجلّی زار میں آباد ہونے لگا جیسے کہ علامہ اقبال" نے فرمایا۔

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت میں روتی چشمِ آدم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہو

درجِ بالا اشعار میں علامہ" نے کم ہمت انسانوں کو اس بات سے آگاہ کیا ہے کہ انہیں اپنی ہلکی پھلکی عبادات کے بل بوتے پر حاصل کردہ وصال کی شبنم پر کفایت نہیں کرنا چاہئے بلکہ انہیں تو چاہئے کہ اپنی عالی ہمتی کا ثبوت دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے وصل کے سمندر سے بھی راضی نہ ہوں اور انہیں ہر عطائے لقاء پر " هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ " کا نعرہ لگانا چاہئے۔ انسان کو شمع کے گرد طواف کرنے والے کیڑے کی طرح شمع کی مقید روشنی پر اکتفا کرنا درست نہیں بلکہ اپنے اندر موجود "تجلّی زار" جس میں ہمہ وقت دیدار الٰہی کے جلوے ملتے ہیں، آباد ہونا چاہئے۔ اس جلوہ زار میں اللہ تعالیٰ کی ذات كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ کے انداز سے ہر روز نئے روپ میں نظر آتی ہے۔

اسی اندازے کے مطابق، جو اوپر بیان ہوا، علامہ اقبال" اپنی ایک نظم میں اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ جب انسان کا دل سوز سے خالی اور نگاہ پاک نہ رہے تو اس میں بہادری اور بیباکی کے تاثرات مفقود ہو جاتے ہیں۔ ایک مسلمان کو یہ جان لینا چاہئے کہ تجلیات الٰہیہؑ کو حاصل کرنے کی استطاعت بھی خاکی انسان کی صلاحیتوں میں رکھی گئی ہے اور اسے دنیا کی خس و خاشاک پر نظر رکھنے سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ کم حوصلگی کمزور انسان کی علامت ہے۔ علامہ" فرماتے ہیں۔

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

بجلی ہوں! نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

بالِ جبریل کی ابتدا میں علامہ اقبال ایک نظم میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا ہے اور اس انسان کی پیدائش پر ہی تمام مخلوقات میں شور برپا ہو چکا تھا کہ کوئی ایسا محرمِ ذاتِ الٰہی پیدا ہو گیا ہے جس کی نگاہوں کے اٹھ جانے سے تمام کائنات مسخر کر دی گئی ہے اور ذاتِ الٰہی کی تجلیات میں بھی خلل اندازی ہونے لگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بھی انسان سے یہ شکوہ ہے کہ اس نے اس خدا کو بھی فاش کر دیا جس کو كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِيًّا کہہ کر صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا۔ علامہ اقبال" درج ذیل اشعار میں اللہ تعالیٰ سے گلہ کرتے ہیں کہ الٰہی تو نے یہ کیا کیا کہ انسان کو، جسے تو نے مدت مدید

تک چھپاکر رکھا تھا اسے تخلیق آدمؑ کے دن فاش کر دیا۔ علامہ کو اپنے فاش ہونے کی فکر اس لئے ہوئی کہ انسان کا راز فاش ہونے سے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات و تجلّیات اور حکمت کے تمام راز انسان کے ہاتھوں فاش ہو گئے۔ راز اگر فاش ہو جائے تو راز نہیں رہتا۔ فرماتے ہیں ۔

میری نگاہِ شوق سے شور حریمِ ذات میں — غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیّلات میں — میری نگاہ سے خلل تیری تجلّیات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا — میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

غور کا مقام ہے کہ تخلیق انسان سے پہلے تمام مخلوقات، حتیٰ کہ جلیل القدر فرشتے بھی اپنی حیثیت، ماہیت اور معرفت سے قطعاً نابلد تھے۔ اس عرفان کے رموز و اسرار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد تک مخفی رہے حتیٰ کہ آپؐ نے حقائق اشیاء اور نکتہ ہائے دقیق سے پردہ کشائی فرمائی۔ جبرائیل علیہ السلام کو اپنی حیثیت اور قبولیت خدمت کا قطعاً اندازہ نہ تھا۔ مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوا تو جبریل علیہ السلام کی تعریف سورۂ التکویر میں ان الفاظ میں کی گئی کہ وہ ایک معزز قاصد، قوت والا، عرش کے ہاں عزت والا اور سب فرشتوں کا سردار اور وہاں کا امین ہے۔ اس سے پہلے وہ اپنی حیثیت کے علم سے نابلد تھے اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت تھی کہ جس کا حصہ جبرئیلِ امین کو ملا اور پوری کائنات میں ہر شئے کو بھی ملا۔

تجلّیاتِ صفات کی معیّت سے اللہ کی معیّت ملتی ہے

تمام علمائے کرام اس بات پر متفق ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے اس لئے اس کا کلام (قرآن) بھی قدیم ہے۔ اس حقیقت کو علامہ نے بھی اپنے درج ذیل ایک شعر میں بیان کیا ہے۔ ایک حدیث شریف میں بھی ہے کہ انسان کو جس کے ساتھ محبت ہو اسی کے ساتھ اس کا حشر و نشر بھی ہو گا. چنانچہ قرآن (یعنی اللہ کے کلام) کے ساتھ رہنے والے حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے ہی ساتھ ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ حیّ و قیوم ہے، لہٰذا انسان میں بھی قرآن کے باعث زندۂ جاوید ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تقریباً تمام صفات کا کچھ نہ کچھ حصہ ان لوگوں کو بھی مل جاتا ہے جو اس کی معیّت میں زندگی گزارتے ہیں۔ احادیث سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ قرآن اور رمضان، قاری اور روزے دار کی شفاعت کریں گے اور ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب تک قرآن کے پڑھنے والا جنت میں داخل نہ ہو جائے گا اس وقت تک قرآن ایک نورانی حسین اور جمیل شخص کی صورت میں قبر اور حشر میں اس کے ساتھ رہے گا۔

علامہ اقبالؒ نے قرآن کی عظمتوں اور برکتوں پر بہت طویل کلام کیا ہے اور اس سلسلے میں راقم الحروف نے علامہ کے کلام کا ایک اچھا خاصہ حصہ وضاحت کے ساتھ اپنی کتاب "سرمایہ ملت" کے اوراق میں شامل کر دیا ہے۔ یہاں صرف چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں۔ ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم

(وہ کتاب زندہ جسے قرآن حکیم کہتے ہیں۔ اس کی حکمت لازوال ہے اور یہ کتاب قدیم ہے)

نکتۂ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

(یہ قرآن وجود عالم کا نکتۂ راز ہے۔ بے استقلال شخص اس کی قوت سے قرار پکڑتا ہے)

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

(جو میرے دل میں ہے اسے صاف صاف کہے دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ قرآن محض ایک کتاب نہیں، یہ تو کوئی اور ہی چیز ہے)

اندر او تقدیر ہائے غرب و شرق سرعتِ اندیشہ پیدا کن چوں برق

(قرآن میں مشرق و مغرب کی تقدیر موجود ہے۔ اس کے ذریعے اپنے اندر بجلی جیسی تیز رفتاری پیدا کر)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ قرآن چونکہ زندہ کتاب ہے اس لئے اس کے پڑھنے اور عمل کرنے والوں کو بھی حیاتِ جاوداں مل جاتی ہے بلکہ وہ خود بھی سراپا قرآن بن جاتے ہیں۔ علامہ اس بات کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جس طرح قرآن ہدایت اور فلاح کی راہیں دکھاتا ہے اسی طرح مومن بھی پورے عالم کو ہدایت اور فلاح کی راہیں دکھلاتا ہے۔ لہٰذا مومن اگرچہ قاری نظر آتا ہے لیکن حقیقی معنوں میں یہ بذات خود ایک چلتا پھرتا قرآن ہے۔ ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ وہ مخلوق جو قرآن سے وابستگی نہیں رکھتی مثلاً چوپائے اور دیگر حیوانات۔ ان کی خوراک گھاس پھوس ہے اور وہ خوراک کھا کر زندہ رہتے ہیں اور اس دنیا میں ہی قربان کئے جاتے ہیں اور ان کا گوشت کھانے کے کام آتا ہے جبکہ نورِ حق (قرآن) سے مستفید ہونے والے انسان، قرآن کی طرح زندہ و جاوید ہو جاتے ہیں اور ان پر موت حرام ہے۔ ؎

ہر کہ کاہ و جو خورد قرباں شود ہر کہ نورِ حق خورد قرآں شود

(جو بھی گھاس پھوس کھاتا ہے، وہ قربان کر دیا جاتا ہے، اور ہر شخص جو نور حق سے مستفید ہوتا ہے قرآن بن جاتا ہے)

ایک مسلمان کو اگر اللہ تعالیٰ کے صفتِ کلام کے علاوہ باقی ماندہ صفات سے فیضان بھی حاصل ہو جائے تو اللہ کی معیّت ان تمام صفات کے ملنے سے بھی میسر ہو جاتی ہے۔

ربط میں تجلیاتِ کلیم اور مشاہداتِ حکیم جیسے معاملات پڑتے ہیں

"کلیم" کا لفظ اللہ سے کلام کرنے والے کی طرف استعارہ ہے اور اس سے مراد تنہائی میں راز و نیاز میں مشغول ہونا ہے۔ علامہؒ نے مرد مومن اور فقیر کامل کے لئے بھی "کلیم" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آپ کا مطلب یہ ہے، کہ جو شخص کلیم اللہ کی طرح حق کا پیغام دے وہ بھی کلیم ہی ہوتا ہے۔ مصلح شخص کو بھی علامہ نے کلیمے نے نوازے کہا ہے۔

"حکیم" کا لفظ ایسے شخص کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو دانا، منطقی، فلسفی یا علم ہیئت کا عالم ہو۔

انسان اپنے احساس و ادراک سے اشیائے کائنات میں کچھ جلووں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اگر وہ جلوے نہ ہوں تو ہر شے بیکار، بے سود اور بے مصرف ہو کر رہ جائے۔ اسی لئے ارمغان حجاز میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

جہاں غیر از تجلی ہائے ما نیست   کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست

(ہماری تجلیات کے بغیر جہاں کچھ نہیں، ہمارے بغیر روشنی اور آواز کا کوئی اظہار نہیں)

جہاں جلوے نظر آنے لگیں وہ تجلی گاہ کہلاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ توفیق الٰہی، اللہ کی رحمتوں کے قاسم (بانٹنے والے) ہیں۔ اس اعتبار سے ہستی مومن ایک تجلی گاہ ہے علامہ نے اسرار و رموز میں فرمایا۔

ہستیٔ مسلم تجلی گاہِ او   طور ہا بالد زگردِ راہِ او

(مسلمان کا وجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مہبط (نزول کی جگہ) ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گرد راہ سے کئی طور پیدا ہوتے ہیں)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ پرتوِ ذاتِ باری تعالیٰ ہیں، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی تجلّیات کا انتساب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک سے آج بھی تجلیات حق کا انعکاس امت کو اولیائے کرام کے واسطہ سے ملتا ہے۔ مومن جب تجلیاتِ الٰہی کو اپنی ذات میں جذب کر لیتا ہے تو اسے ان تجلّیات سے مقام فنا نصیب ہوتا ہے تو پھر اس کی ہستی میں اور تجلّی میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ علامہ فرماتے ہیں کہ اہل حکمت اپنی نگاہِ تجلّی پر رکھتے ہیں جب کہ اہلِ معرفت تجلّی کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ علامہ نے شاعر کے سینے کو بھی تجلّی زار کہا ہے۔

آں نگہ را بر تجلّی می زند   این تجلّی را بخود گم می کند

(حکیم تو تجلّی پر نگاہ رکھتا ہے   اور عارف تجلّی کو اپنے اندر سمو لیتا ہے)

رابطۂ شیخ رکھنے والے سالکین کو تجلّیاتِ کلیم اور مشاہداتِ حکیم سے واسطہ رہتا ہے

کیونکہ سالک مذکورہ بالا تجلیات سمیٹتا بھی ہے اور کبھی کچھ چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے جابجا اس بات پر اپنے اس نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے کہ مسلمان نوجوانوں کی تربیت میں، علم و فن کے ساتھ ساتھ اہل اللہ کے فیضانِ نظر سے بھی استفادہ کرنا ضروری ہے۔ اگر بنیادی تربیت کو غلط انداز میں یا ان کی تربیت کو مغربیت کے رنگ میں ڈھالا جائے، تو اس میں چاک و چوبند نوجوان تو پیدا ہو سکتے ہیں مگر کسی اہلِ دل یا صاحبِ نظر ہستی کا رونما ہونا ممکن نہیں۔ فرماتے ہیں کہ جب مدرسے میں ہی بچے کا گلہ گھونٹ دیا جائے تو اس کی زبان سے لاالہ الا اللہ کی صدا کیونکر بلند ہو گی اور ان حالات میں غزالیؒ و رومیؒ جیسی صاحبانِ علم و عرفان ہستیوں کا پیدا ہونا تو نہ صرف مشکل ہے بلکہ بعید از ممکنات بھی ہو گا۔ فرماتے ہیں۔

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیمؑ　　کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
وہ علم کم بصری جس سے ہمکنار نہیں　　تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

درج بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قوم کے طالب علم کو تجلّیاتِ کلیم اور مشاہداتِ حکیم کا درس نہ ملا ہو تو اس قوم کے جوانوں میں عشق و محبت کے اصول اور پیغمبرانہ نقطۂ نظر کیونکر پروان چڑھ سکے گا اور ایسا علم یقیناً کم بصری پر محمول کیا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے فرنگی مفکروں اور فلاسفروں پر بہت نقطہ چینی کی ہے اور ان کے فلسفے کی بے مائیگی اور لادینیت پر کافی حاشیہ آرائی کی ہے۔ مثال کے طور پر نٹشے کو ہی لیجئے کہ وہ خدا کی ذات کا منکر تھا اور فقط زمانے کو ہی خدا سمجھتا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ بعض اخلاقی افکار کے باعث اس کا قلب مومن تھا مگر خدا کا منکر ہونے کی وجہ سے اس کا دماغ کافر تھا۔ وہ "لَا" تک تو پہنچ گیا مگر "اِلَّا" تک نہ پہنچ سکا یعنی وہ سائنس کی رو سے نفیٔ خدا کا قائل تھا، مگر اِلَّا اللہ (ایک خدا کی موجودگی پر ایمان لانے) تک نہ پہنچ سکا۔ اس کا یہ قول ہے کہ زمانہ ہی خدا ہے۔ اس طرح وہ اس حدیث قدسی تک پہنچ گیا کہ جس میں لَاتَسُبُّوا الدَّهْرَ کا قول ہے یعنی زمانے کو برا نہ کہو لیکن آگے نہ جا سکا۔ علامہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ اس زمانے میں ہوتا تو میں اسے سمجھاتا کہ اللہ کی ذات کیا ہے اور وہ خدا کے انکار سے تجلیاتِ کلیم اور مشاہداتِ حکیم سے محروم نہ رہتا۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں　　تو اقبال اس کو سمجھاتا کہ ذاتِ کبریا کیا ہے

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ نٹشے کو انسان کی منزل کا کچھ علم نہ تھا کیونکہ اس نے کبھی روحانی دنیا کی راہ کا سفر طے ہی نہیں کیا تھا۔

نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے حکیم تو نے　　مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے نہ تو رہ نشین نہ راہی

نٹشے کے متعلق علامہؒ کا پیش کردہ نظریہ بہت دلچسپ ہے، لیکن یہ تحریر اس مضمون کی متحمل نہیں۔ جسے شوق ہو تو وہ فلسفہ اقبال پر لکھی گئی کتب (خاص طور پر اقبال اور مغربی مفکرین از جگن ناتھ آزاد۔ فلسفہ اقبال از وحید الدین، اقبال شناسی از مشرف احمد۔ اقبال کا فلسفہ خودی از محمد عثمان و دیگر کتب) کا

مطالعہ کرے۔ کے۔ ایم۔ نیاز کی کتاب "اقبال بمقابل دیگر شعراء جو راقم الحروف نے ترتیب دی ہے بھی قابل مطالعہ ہے۔

اکثر لوگ تجلّیاتِ الٰہیہ سے دور ہیں

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تجلّیات کا ظہور تو ہوتا رہتا ہے مگر لوگوں کی عام آنکھوں سے یہ تجلیات دیکھی نہیں جاسکتیں۔ بلکہ ان تجلّیات الٰہیہ کا مشاہدہ فقط اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب چشم بصیرت کثرت ذکر اور روحانی اشغال کے بعد کھل جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہ (جدھر بھی تم منہ کر لو وہیں ذات خداوندی کی رحمت تمہاری طرف متوجہ اور موجود ہوتی ہے۔ (البقرہ ۱۱۵) تفسیر ابن کثیر کے مطابق اس آیت سے مراد یہ ہے کہ ذکر اور دعا وغیرہ میں تم جدھر بھی منہ کر لو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رضا کو وہیں پاؤ گے کیونکہ ہر طرف اللہ کی پسندیدہ جہت ہے۔ اگر وجہ اللہ سے مراد اللہ کا قصد یا نیت لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم جدھر بھی منہ کرو گے ادھر ہی اللہ کا ارادہ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ یعنی اللہ تعالیٰ کا علم ملکیت، قدرت اور خلق وغیرہ لامحدود ہیں اور تمام عالم کو گھیرے ہوئے ہیں۔

علامہ اقبال ؒ نے بانگ درا کی ایک نظم "شمع" میں شمع سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ تیرا جلنا اس لئے ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے تجلّی سے دور ہے اور عام لوگ تیری روشنی کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نور ہے۔ اس کے بعد شمع کے متعلق فرماتے ہیں کہ تو جل رہی ہے اور بینا بھی ہے مگر تجھے اپنے سوزِ دروں کی خبر نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر شے دانستہ یا نادانستہ طور پر ایک اللہ کی عبادت میں مشغول ہے اور اسی ذات کبریا کی تعریف و توصیف اور حمد و ثنا میں حسب حال مگن ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی محبت کے سوز و اضطراب میں سیماب وار ہوں اور اپنے دل کے اضطراب سے باخبر بھی ہوں۔ فرماتے ہیں اس سوز کا ہونا اور بات ہے اور اس کا احساس ہونا اور بات ہے۔ علامہ فرماتے ہیں اللہ کا شکر ہے کہ اس بے نیاز ذات نے مجھے اپنے اس سوز کا احساس بھی عطا کر رکھا ہے۔

روایات میں ملتا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی ایک مرتبہ شب قدر کے موقع پر اپنے حرم میں تشریف فرما تھے کہ آپ کی اہلیہ نے فرمایا کہ آج کی رات کئی لوگوں کی زندگی کے پتے شجر حیات سے کٹ چکے ہوں گے۔ اس پر مجدد الف ثانی ؒ نے فرمایا کہ اس شخص کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ جس کا پتا کٹ چکا ہو اور اس کو علم بھی ہو کہ اس کا پتا کٹ چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی سال حضرت مجدد الف ثانی ؒ کا وصال ہوا۔ اللہ کے فراق میں ہر شجر اور حجر گریہ کنعاں اور فریاد رساں ہے، لیکن جو لوگ حقیقت حال سے آگاہ ہوں ان کی عبادت، گریہ اور ہائے ڈھو کی نوعیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ شمع کے نام سے لکھی گئی نظم میں سے علامہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جلتی ہے تو کہ برقِ تجلّی سے دور ہے   بیدرد تیرے سوز کو سمجھے کہ نور ہے

بینا ہے اور سوزِ دروں پر نظر نہیں
تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں
آگاہِ اضطرابِ دلِ بےقرار بھی
میں جوشِ اضطراب میں سیماب وار بھی
احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا
تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ خواہ کسی نام سے کوئی اللہ کو پکارا کرے مگر پکارنے کا انداز درست ہونا چاہئے۔ دل میں جب بے چینی اور اضطراب کی حالت طاری ہو جائے تو سالک کی بات سنی جاتی ہے اور اگر کوئی سلسلہ کے بزرگوں کی توجہ کا طالب ہو تو تب ہی اس کا شیخ سالک کی طرف توجہ فرماتا ہے اور رابطۂ شیخ میں کامیابی حاصل ہوتی ہے ورنہ خاردار جھاڑی پر ہاتھ پھیرنے والی بات ہے۔

ہر شے اللہ کی تجلّیات کے لئے سرگرداں ہے

یہ ایک عام فہم بات ہے کہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے اُکُلَّ شَيْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ ۔ مولانا رومؒ اس کی مثال یوں پیش کرتے ہیں کہ حوض اور نہر کا پانی اگرچہ حوض یا نہر میں مقید ہوتا ہے مگر ہوا اس کو رفتہ رفتہ خشک کر کے اڑاتی ہوئی اپنی جنس میں داخل کرتی رہتی ہے کیونکہ آب اور ہوا دونوں میں عنصری تناسب موجود ہے۔ اسی طرح ہماری جان رفتہ ایک اور عالم کی طرف پرواز کرتی ہے جو ہماری روح سے مناسبت رکھتا ہے۔ جس قسم کی روح ہو اسی قسم کے عالم کی طرف اس کا میلان ہوتا ہے۔ جس قوم کا جس قسم کا مذاق ہو اس کی آنکھیں اسی قسم کے نصب العین پر لگی رہتی ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ جزو اپنے کل سے پیوست ہونے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس اصول کی بنا پر انسان کی روح وَاِذَا نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ (اور جب میں انسان میں اپنی روح پھونک دوں سورۂ الحجر آیت ۲۹) کے عمل سے دنیا میں آئی۔ اس لئے وہ اپنے اصلی وطن عالم ملکوت کی طرف جانے کے لئے بے چین رہتی ہے اور ہر چیز بالاتفاق نور مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے تخلیق ہوئی ہے اور نور مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اللہ کے نور سے ماخوذ ایک نور ہیں اس لئے شجر اور حجر بھی اسی خدا کی طرف رجوع کئے رہتے ہیں جو سب کی اصل ہے۔ کسی درخت کے بیج کو جب زمین میں بویا جاتا ہے تو اس میں سے جو پہلی کونپل نکلتی ہے اس کا منہ اوپر کی طرف ہوتا ہے اور اس کا یہ عمل خدا کی تلاش کرنے پر دلالت کرتا ہے جس نے اس کو پیدا کیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ سرو کے درخت بھی اسی صورت میں قیام کئے ہوئے ہیں گویا وہ خدا کی طرف اپنی انگلیاں اٹھائے ہوئے ہیں۔ تمام درخت اوپر کی طرف ہی بڑھتے ہیں اور ثقل ارض کے باوجود وہ اس کی مخالف سمت کو بڑھتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر فرشتے کو بھی اپنے خالق کی تلاش رہتی ہے۔ انسان کو بھی یہی سبق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خالق کے سوا کسی اور طرف متوجہ

نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی معرفت کے لئے پیدا فرمایا ہے اور وہ یہی چاہتا ہے کہ وہ بھی اپنے خالق کے سوا کسی کی طرف توجہ نہ کرے۔ قرآن اور احادیث میں اس بات پر بہت اشارات ملتے ہیں کہ انسان کو اپنے رب کے ذکر و فکر میں ہی مشغول رہنا چاہئے اور انسان کو اس کے خالق نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر تو ہمہ وقت اور ہر حال میں میری طرف متوجہ رہے گا یا یہ کہ اگر تو میرے لئے ہو جائے گا تو میں تیرے لئے ہو جاؤں گا۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اس موضوع پر بہت کلام کیا ہے جس کا یہاں شامل کرنا موضوع کتاب کے دائرے سے باہر ہے۔ دیگر شعرا کا کلام اگر اس موضوع پر تلاش کیا جائے تو کئی دفتر اس کی ضخامت پر مشتمل ہوں گے۔ مرزا غالب کے دیوان کا پہلا شعر بھی اسی موضوع پر ایک سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتا ہے کہ ہر شے بزبان خامشی یہ فریاد کر رہی ہے کہ مجھے کس نے اور کس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور ہر شے کی حقیقت کس قدر کاغذی حیثیت رکھتی ہے۔ ؎

نقش فریادی ہے کِس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے لئے آنکھ چاہئے

اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس کی صفات سے ہی پہچانی جاتی ہے اور اس کی صفات اس کی ذات سے جدا نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اسی لئے فرمایا کہ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (پاکی ہے آپ کے رب کو، جو عزت والا رب ہے وہ پاک ہے ان کی باتوں سے۔ الصّٰفّٰت ۱۸۰) ترمذی کی ایک حدیث (مشکوٰۃ شریف کے باب بدا الخلق) میں ہے کہ پیدائش مخلوق سے پہلے اللہ تعالیٰ عماء میں تھا کہ نہ اس کے اوپر ہوا تھی اور نہ اس کے نیچے ہوا تھی اور اس نے اپنے عرش کو پانی پر پیدا کیا۔ عماء کنایہ ہے اس سے کہ اس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی۔ عماء کے معنی بادل کے بھی لئے جاتے ہیں اور اس کی کیفیت کسی کو معلوم نہیں۔ کوئی اس سے حجاب جلال مراد لیتا ہے اور کوئی غیب ہویتِ ذات بلاظہور بتاتا ہے یعنی یہ مظاہرِ صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

باب الرویاء مشکوٰۃ شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو اس طرح دیکھو گے جیسے تم چاند کو دیکھتے ہو لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ چاند کی طرح کسی حدود اربعہ میں نظر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک مومن اللہ تعالیٰ کو بآسانی دیکھ سکے گا۔ یہ رویت جمالیہ ہو گی اور قیامت کے روز ہو گی۔ کفار کو بھی رویت باری تعالیٰ ہو گی مگر وہ قہر و جلال سے ہو گی۔ اس کے بعد وہ مجوب ہو جائیں گے تاکہ انہیں حسرت اور عذاب زیادہ ہو۔ اولیائے کرام کا یہ مسلک ہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار جمالی اور صفاتی حاصل ہو سکتا ہے مگر اس کے لئے دیکھنے والی آنکھ درکار ہے۔

برائے دیدنِ روئے تو چشمے دیگرم باید — کہ ایں چشمے کہ من دارم جمالت رانمی شاید

(آپ کے دیکھنے کے لئے کسی اور قسم کی آنکھ درکار ہے۔ کیونکہ وہ آنکھ جو میں رکھتا ہوں آپ کے جمال کو نہیں پا سکتی)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ہر شے پر قدیر اور محیط ہونے کا ذکر آیا ہے۔ جہاں قدیر کا لفظ آیا ہے وہاں مراد یہ ہے کہ اللہ کی ذات قدیر ہے اور محیط سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات سے محیط ہے۔ مراقبہ قدیر، مراقبہ محیط سے اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ اول الذکر میں مراقبۂ اصلِ ذات حاصل ہوتا ہے اور مؤخر الذکر میں ظلال اور صفات کا ملاحظہ ہونا ہوتا ہے۔

تو محیطی بر ہمہ اندر صفات وزہمہ پاکی و مستغنی بذات

(تو اپنی صفات سے ہر چیز پر محیط ہے، اور تو ایسی ذات ہے جو ہر چیز (صفات) سے پاک اور مستغنی ہے)

آنچہ در ذاتش تفکّر کرد نیست در حقیقت آں نظر در ذات نیست

(جس نے اس کی ذات میں تفکر نہیں کیا تو حقیقتاً اس کی نظر ذات باری تعالیٰ پر نہیں ہے)

نیست آں پندارِ او زیرا براہ صد ہزاراں پردہ آمد تا الٰہ

(اس کی شان کبریائی اس سبب سے نامعلوم ہے کہ خدا تک (پہنچنے) کی راہ میں لاکھوں پردے حائل ہیں)

اگرچہ بندے اور خدا کے درمیان ستر ہزار پردے ہیں تاہم اس دنیا کی ہر شے میں اسی ایک خدا کے حسن کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ ہر چیز اسی کا پتہ دے رہی ہے کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

آئینہ ساخت عالم و خود را بخود نمود عکسِ جمالِ اوست نہاں و عیاں کہ ہست

(اس نے عالم کو آئینہ بنایا ہے اور اپنے آپ کو خود ظاہر کیا ہے۔ اس دنیائے ظاہر و مخفی میں اس کے جمال کا عکس ہے)

چوں حسنِ او بہ نقشِ جہاں کرد جلوۂ ظاہر نمود از ہمہ کون و مکاں کہ ہست

(جب اس کے حسن نے جہان کی شکل میں جلوہ دکھایا، تو اس کون و مکاں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ ہے)

کو نام و کو نشان زغیر و کجاست غیر یار است ظاہر از ہمہ نام و نشاں کہ ہست

(اس کے علاوہ کس چیز کا نام و نشان ہے کوئی چیز اس کا غیر نہیں، ہر وہ چیز جس کا نام و نشان ہے خدا اس میں ظاہر ہے)

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اسماء و صفات کے ظہور جنت اور دوزخ ہیں۔ (اسم سے مراد وہ عبارت ہے جس سے اللہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ وہ اشارہ باعتبار ذات ہو یا اس کی صفت کے اعتبار سے ہو) دوزخ صفت قہاری کا ظہور ہے اور کافر کی روح جو قہر سے پیدا ہوئی دوزخ کی طرف گئی کیونکہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف جاتی ہے۔ مولانا روم" فرماتے ہیں۔

نوریاں مر نوریاں را طالب اند   ناریاں مر ناریاں را جاذب اند
(نوری، نوریوں کے طالب ہیں   اور   جہنمی جہنمیوں کو کھینچنے والے ہیں)

صفات، ذاتِ الٰہی سے جدا نہیں

صوفیہ کا قول ہے کہ قرآن مجید کو اگر ساتھ رکھا جائے تو تعویذ کا کام بھی دیتا ہے اور اگر حفظ کر لیا جائے تو گویا حافظ نے اسے اپنے دل میں رکھ لیا۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ کلام ایک صفت ہے اور صفت کو ذات کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اللہ کی صفات اللہ تعالیٰ سے کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ کسی ذات سے جب کسی صفت کا اظہار ہو تو اس کی ذات کا نام وہی ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم خدا کی صفت رازق یا خالق کو ہی لیں تو معلوم ہو گا کہ جب اس صفت کا اللہ تعالیٰ سے اظہار نہ ہوا تھا تو وہ صفت اس میں اس وقت بھی موجود تھی اور اللہ تعالیٰ اس وقت بھی رازق اور خالق تھا۔ لہٰذا کہا جاتا ہے کہ ذات سے صفات جدا نہیں ہوتیں۔

جب آدمی سے کوئی کلام کرتا ہے، تو وہ اس کی طرف دیکھتا ہے، متوجہ ہوتا ہے اور مخاطب کا کلام سنتا ہے۔ کلام سننے کے وقت وہ قوت ارادی کو بھی کام میں لاتا ہے، تو گویا صفت کلام میں صفت سمع، صفت بصر اور صفت ارادہ بھی شامل ہوتی ہے۔ لہٰذا جس کے پاس قرآن ہے اس کے پاس صفت کلام ہونے کے علاوہ گویا اللہ تعالیٰ کی ذات پاک بھی ساتھ ہوتی ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ قرآن میں شفا ہے فِیْهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ اور نیز فرمایا وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظَّالِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں وہ چیزیں جو (باعث) شفا ہیں اور سراپا رحمت ہیں اہل ایمان کے لئے اور قرآن نہیں بڑھاتا ظالموں کے لئے مگر خسارہ کو (بنی اسرائیل - ۸۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں قرآن کا دخل پایا جاتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے شفا، رحمت اور دیگر صفات کا شامل ہونا لازمی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود شافی کریم اور رحیم بھی ہے۔

تجلّیات ہی سے صفات پیدا ہوتی ہیں

سرِّ دلبراں میں ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی بندے پر اسم اللہ کے اعتبار سے تجلی فرماتا ہے تو وہ بندہ بالذات فنا ہو جاتا ہے اور حق اس کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ صفات میں بندہ صفات کے انوار کے تحت آ جاتا ہے۔ گویا ایک صفت کی کشتی میں یہاں تک تیرتا ہے کہ اس کی حد کو بطور اجمال (نہ کہ بطور تفصیل) پالیتا ہے، یعنی وہ یہ تجلی صرف بطور اجمال (خلاصہ کے طور پر) پاتا ہے۔ اس میں تفصیل کو کوئی دخل نہیں۔ جب بندہ ایک صفت کے عرش پر صفات کے اڑن کھٹولے پر اڑ کر پہنچتا ہے تو وہ اس صفت کے ساتھ موصوف ہو جاتا ہے اور اس صفت کا مظہر بن جاتا ہے (وہ صفت اس میں ظاہر ہونے

لگتی ہے) اسی طرح دوسری صفت اس پر لاحق ہوتی ہے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے صفات کی تکمیل کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ قرب نوافل اور قرب فرائض کی منزلوں پر پہنچتا ہے، جہاں حق تعالیٰ بندے کی سمع اور بصر (کان اور آنکھ) بن جاتا ہے۔ یہاں نور عبد گم ہو جاتا ہے اور روح خلقی فنا ہو جاتی ہے اور ہیکل عبدی (شکل و صورت یا نقشہ) میں حق سبحانہ تعالیٰ قائم ہو جاتا ہے۔ حضرت بہاؤالدین نقشبندؒ فرماتے ہیں کہ سلوک سے مقصود یہ ہے کہ معرفتِ اجمالی، تفصیلی ہو جائے۔ یعنی جو چیزیں خلاصے کے طور پر دل میں نظر آتی ہیں وہ ظاہر میں تفصیلاً نظر آجائیں اور سالک اپنے خارج میں ہر چیز کا مشاہدہ کرے۔

تجلیات جو سالک پر راہ فنا میں وارد ہوتی ہیں وہ بالعموم چار قسم کی ہوتی ہیں۔ (۱) تجلیٔ آثاری (یہ تجلی صوری ہے جو کسی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام نے آگ کو دیکھا تو اس میں خدا کی آواز سنی) خواب بھی تجلی صوری ہے۔ ۲۔ تجلیٔ فعلی (کسی فعل میں اللہ کے فعل کو متجلی پانا) ۳۔ تجلیٔ صفاتی اس میں سالک اللہ تعالیٰ کو امہات صفات یعنی حیات، علم، قدرت، ارادوں، سمع بصر، کلام وغیرہ میں متجلی پاتا ہے۔ اور ۴۔ تجلی ذاتی (اس میں سالک فانی اور گم ہو جاتا ہے اور ادراک کھو بیٹھتا ہے اور حق باقی رہتا ہے مثلاً منصور حلاج کا " اَنَا الحَق" کہنا۔ اس فنائیت کے بعد لقائے حق سے باقی ہونے کو بقا باللہ کہتے ہیں۔ اس حال میں اللہ کا رنگ اس پر غالب ہوتا ہے اور وہ جملہ ذرات کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے اور اللہ کی صفات سے متصف ہو جاتا ہے اور کسی چیز کو غیر خود یا اپنے سے خارج نہیں پاتا۔ کمال توحید عیانی سے یہی مراد ہے اس کے علاوہ اور بہت قسم کی تجلیات بھی ہیں مثلاً تجلیات اکملی، ظہوری، رحمانی، رحیمی، شہودی، جمادی، نباتی اور حیوانی بھی تجلیات کی ہی قسمیں ہیں۔

اولیاء کو غلبہ حال میں کثرت (یعنی موجودات خارجیہ) نظر نہیں آتی۔ وحدت ہی نظر آتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ دن کے وقت آفتاب کی شعاعوں کے سامنے ستارے نظر نہیں آتے حالانکہ ستارے موجود ہوتے ہیں۔ اولیائے شہودی (وحدت الشہود والے) جب دل میں خدا کے نور کے عکس کو دیکھتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اصل کا نہیں عکس کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ عکس کو عکس ہی جانتے ہیں جبکہ وجودی (وحدت الوجود والے) عکس کو عین (اصل) سمجھتے ہیں، جیسے مجنوں عامری ایک سانولی لیلےٰ کے عشق میں ایسا مستغرق ہوا کہ وہ ہر شخص کو حتیٰ کہ اپنے والد کو بھی لیلےٰ ہی گمان کرتا تھا۔

کچھ صوفیا سے منقول ہے کہ لیلتہ القدر کی تجلی جب کسی کو میسر ہو جائے تو کئی لوگ اس کی تاب نہیں لا سکتے اور بے ہوش ہو جاتے ہیں اور بعض کی نظر خیرہ ہو جاتی ہے اور بعض پر رقت اور قشعریرہ (لرزہ) طاری ہو جاتا ہے جو مصافحہ جبرئیل کی علامت ہے۔ اس وقت جو بھی دعا مانگی جائے قبول ہوتی ہے اور احوال و واردات کھلنے لگتے ہیں۔

حضرت ابو محمد عبداللہ بن احمد نے حضرت ابو ہریرہ ؓ کی ایک حدیث اپنی کتاب میں لکھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی تجلی دکھائی تو ان کی بصارت کا یہ عالم ہو گیا کہ وہ رات کے اندھیرے میں دس فرسخ (میل) کے فاصلے پر اگر کوئی چیونٹی کسی صاف پتھر پر ہوتی تو آپ اسے بھی دیکھ لیتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کئی میلوں کے فاصلے پر چیونٹی کی گفتگو سنی اور اس کو سن کر تبسم فرمایا جس کا ذکر سورہ النمل میں موجود ہے۔ مجاہدؒ تابعی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیچھے بھی کئی چیزوں کو ایسے ہی دیکھتے تھے جیسے آگے کی چیزوں کو ملاحظہ فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ ؓ کا قول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اندھیرے میں بھی اسی طرح دیکھتے تھے جیسے اجالے میں۔ یہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ تجلیات کے باعث ممکن ہوتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ "بے تجلی مرد دانا راہ نبرد" یعنی مرد حق بے تجلیٔ حق راہ نہیں پاتا۔ ایک جگہ آپ فرماتے ہیں ۔

بے تجلی زندگی رنجوری است   عقل مہجوری و دیں مجبوری است

(یہ روحانی تجلی کی روشنی نہ ہو تو زندگی میں رنج و محن رہ جاتا ہے. عقل ساتھ چھوڑ جاتی ہے اور دین مجبوری محض رہ جاتا ہے)

علامہ اقبالؒ کا یہ قول کہ مرد حق بے تجلیٔ حق راہ نہیں پاتا درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضرت باقی باللہؒ کا قول ہے کہ ان کے مرشد فرمایا کرتے تھے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی بندے پر ارادت کی صفت سے تجلی نہ فرمائے تب تک وہ بندہ اہل اللہ کا سلوک طے نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی کا مرید ہو سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کو جس طرح کی تجلی میسر ہو اس سے ویسی ہی صفات کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ صوفیہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاص تجلیات سوا لاکھ قسم پر ہیں اور وہ تجلیات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع میں شامل سوا لاکھ صحابہ کرام میں منتقل فرمائیں اور یہ تجلیات ہر زمانے میں ایک سے دوسرے زمانے کے لوگوں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ ہر زمانے میں ایک نہ ایک آدمی ان تجلیات پر قائم رہتا ہے جسے اس کی روحانی طبع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عوام اور خواص پر تجلّیات کا اثر

حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ تجلی انوار حق کی تاثیر ہے، جو مقبولان بارگاہ پر ہوتی ہے، جس سے وہ اس درجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ حق کو دیکھتے ہیں۔ اسی لئے رویت بالقلب اور رویت بالعین دو صورتوں میں رکھی گئی ہے۔ تجلی ایک ایسی چیز ہے جس کو اگر کوئی چاہے تو دیکھے اور اگر نہ چاہے تو نہ دیکھے۔ ایک صورت دیکھنے کی یہ ہے کہ کسی وقت دیکھ سکے اور کسی وقت نہ دیکھ سکے۔ کچھ ایسے بھی اہل نظر ہوتے ہیں کہ بہشت میں بھی اگر نہ دیکھنا چاہیں تو نہ دیکھیں کیونکہ ان کے لئے تجلی سے خود کو پردہ میں رکھنا ان کے اختیار میں ہے اور یہ بات انؒ کے لئے روا ہے لیکن رویت پر پردہ جائز نہیں ہوتا۔

کتاب اللمع میں ہے کہ حق تعالیٰ کے انوار کا خدا کی طرف رجوع کرنے والے سالکین کے دلوں پر چمکنا تجلی کہلاتا ہے۔ ابوالحسین نوری" فرماتے ہیں کہ اگر کسی پر انوار واحوال کی تجلی پڑے تو اس سالک کی خوبیوں کو حسن ملتا ہے اور ان کے پوشیدہ ہونے سے خوبیاں قبیح ہو جاتی ہیں، یعنی جب قلب پر نور حق نے ظہور کیا تو تاریک دل روشن ہو جاتے ہیں اور اس کے عکس سے سیاہ ہو جاتے ہیں۔ رسالہ قشیریہ میں ہے کہ عوام تو "سر" (سر الٰہی یا وجود باری) کے پردے میں ہیں اور خواص دوام تجلی میں ہوتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ اِذَا تَجَلّٰی لِشَیْئٍ خَشَعَ لَہٗ (الحدیث) — جب اللہ تعالیٰ اپنی تجلی کسی چیز پر ڈالتا ہے تو وہ شے اللہ کے آگے عاجزی اور خشوع کرنے لگتی ہے۔

اس سے معلوم ہو گا کہ صاحبِ سِرّ مشاہدہ کے وصف میں ہوتا ہے اور صاحب تجلی ہمیشہ اپنے خشوع کی صفت میں ہوتا ہے۔ سِرّ عوام کے لئے سزا ہے اور خواص کے لئے رحمت کیونکہ اگر ان کے لئے اللہ تعالیٰ پردہ نہ ڈال دے تو یہ لوگ سلطان حقیقت (یعنی اللہ تعالیٰ کے حقیقی انوار) کے سامنے فنا ہو جائیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ ان پر کوئی چیز ظاہر کرتا ہے اسی طرح ان پر پردہ بھی ڈال دیتا ہے۔ عام صوفیا کی حظ یا مزے کی زندگی تجلی میں اور مصیبت کی زندگی سر میں ہوتی ہے (سر کا نور صاحب دل اور رَاسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ کو ہی ہوتا ہے مگر) خواص پر جب تجلی حق ہوتی ہے تو وہ طیش (جلال) میں ہوتے ہیں اور جب پردے میں ہوں تو حظ کی طرف لوٹ آتے ہیں اور مزے میں ہوتے ہیں۔

حضرت ثناء اللہ پانی پتی" نے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ (آلایۃ) کی تشریح میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو امانت انسان کو دینا چاہی وہ نورِ عقل کے علاوہ نارِ عشق تھی۔ فرماتے ہیں کہ نور عقل کے ذریعے فراست حاصل ہوتی ہے اور یہ ہر عابد اور زاہد کو مل جاتی ہے مگر نارِ عشق ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ یہ عشق کے ذریعے اہل اللہ اور خواص میں ہی پیدا ہوتی ہے اور اس کا خاصہ یہ ہے کہ جس کو یہ معرفت مل جائے اس کے لئے خدا اور بندے کے درمیان حائل شدہ تمام حجابات کو جلا دیتی ہے۔ فرماتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عاشقوں کو تجلّیات ذاتیہ عطا کی جاتی ہیں اور باقی تمام عوام جنّات اور ملائکہ کو تجلّیات صفات ہی ملتی ہیں کیونکہ وہ تجلّیات ذاتیہ کی اہلیت نہیں رکھتے (تفصیل کے لئے راقم الحروف کی کتاب "بیعت کی تشکیل اور تربیت" ملاحظہ فرمائیں)

ہر انسان کو حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے وصل الٰہی ملتا ہے

صوفیا کا قول ہے کہ تمام زمین اور جہاں کی تمام اشیاء ایک نور کے دریا میں ڈوبی

ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور یہ عنصری تجلّیات عالم خلق سے منسوب ہیں۔ اس سے اوپر عالم امر کی تجلیات کا دور شروع ہوتا ہے اور یہ سلسلہ لاانتہا تک پہنچتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ میں خدا تعالیٰ تک تو پہنچ گیا مگر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طناب تک نہ پہنچ سکا۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی صفات علمی کا ظہور ہوتا ہے تو نور کا ایک بے کنار سمندر موجیں مارنے لگتا ہے۔ اس صفت علمی کی تجلی سے تمام انبیاء کی ارواح پیدا کی گئیں۔ اس سمندر کا نام حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس حقیقت کو تعین اول بھی کہتے ہیں۔ یہاں کسی ولی یا امتی کا ذکر تو کیا کسی رسول کا بھی گزر نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قرب میں سب سے اعلیٰ مقام یہی ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے قرب کا تعلق ہے تو اس کے متعلق یہ معلوم ہونا چاہئے کہ عرش کے اوپر عالم امر میں ہی اللہ کے قرب میں ہر انسان کی ایک حقیقت موجود ہوتی ہے اور ہر انسان کو اپنے درجے اور استعداد کے مطابق اسی حقیقت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ساتھ معیت حاصل ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ (یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو — سورہ الحدید۔ ۴) چنانچہ ہر ولی اپنی اسی حقیقت اور معیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے واصل ہوتا ہے، مگر حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم مقامات قرب میں سب سے اعلیٰ مقام ہے اور یہ مقام بہت بلند ہے۔ اس مقام کو حاصل کر کے واصل ہونا بہت محال ہے۔ اس مقام پر انبیاء کا بھی گزر ممکن نہیں تو پھر کسی ولی کا کیا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

ربط ہے ناتمام قلبِ سلیم کے بغیر

زندہ دل خلّاقِ اعصار و دھور جانش از تقلید گردد بے حضور
(زندہ دل آدمی نئے زمانے اور نئے عہد پیدا کرتا ہے، اس کی جان تقلید سے بے کیف و بے حضور ہو جاتی ہے)

راقم الحروف کی کتاب "حضور قلب" میں قلب سلیم اور دیگر ضروریاتِ قلب سے متعلق اچھی خاصی تفصیل تحریر کر دی گئی ہے۔ یہاں قلبِ سلیم پر نہایت مختصر گفتگو تحریر کی جارہی ہے تاکہ قارئین پر قلبِ سلیم کی اہمیت کو واضح کر دیا جائے اور عوام کو اس بات سے متعارف کرایا جائے کہ جب تک دل کی کیفیت درست نہ ہو اس وقت تک سالک کا روحانی دنیا کے کسی شعبے میں قدم رکھنا بعید از قیاس اور بے مقصد ہو گا۔

ہے ساز پہ موقوف نواہائے جگر سوز ڈھیلے ہوں اگر تار تو بیکار ہے مِضراب

طریقِ رابطہ میں قلب سلیم کا لزوم

قلبِ سلیم کا تقاضا ترکِ خواہشات نفسانی ہے۔ تصوف میں ترک سے مراد یہ ہے کہ دنیا اور آخرت کے تمام خیالات کو اس طرح ترک کر دیا جائے کہ دوبارہ ان خیالات کو شعور میں لانا ممکن ہی نہ رہے۔ صوفیا کے نزدیک ترک سے مراد ترکِ زخارف (سونا چاندی یا خوبصورت چیزوں کا ترک) ہے تاکہ ہم اس قسم کے ترک کے باعث فطرت سے قریب ہو جائیں۔ قلب سلیم کو فطرت شناس ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے جو سکوت لالہ و گل سے ہم کلامی کر سکتا ہے۔ جیسے علامہ اقبال نے فرمایا۔

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

اللہ کے نزدیک کام آنے والی چیز قلب سلیم ہے کیونکہ دنیا کا مال اور اولاد بھی

زخارف میں شامل ہے جیسا کہ قرآن میں ہے۔

يَوْمَ لَايَنْفَعُ مَالٌ وَلَابَنُوْنَ ۙ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ؕ (الشعراء ۸۸-۸۹) جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے۔ مگر وہ شخص جو لے آیا اللہ تعالیٰ کے حضور قلبِ سلیم۔

قلبِ سلیم سے مراد "مومن کا دل" لیا جاتا ہے جو کہ کفر اور نفاق کی بیماریوں سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ جبکہ کافر کے دل کے بارے میں فرمایا گیا ہے "فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ" یعنی ان کے دل میں بیماریاں ہوتی ہیں اور ان کے خرچ کردہ مال کو بھی قبول نہ کیا جائے گا اور ان کی مسلمان اولاد کی دعا ان کے حق میں مقبول نہیں ہوتی۔

قلب اگر ہنگامہ خیز نہیں تو ربط بھی نہیں

علامہ اقبالؒ نے قلب کی حیثیت سے آگاہ کرتے ہوئے بہت طویل کلام کیا ہے۔ جب کسی چیز کی طلب نہیں تو وہ چیز کیسے مل سکتی ہے۔ اپنی نظم "فقر و ملوکیت" میں فرماتے ہیں کہ جس کے سینے میں قلب سلیم ہو وہ اپنے اس کمال کے باعث ضرب کاری کا حامل ہوتا ہے۔ جواب شکوہ میں بھی آپ نے اس راز کو افشا کیا ہے کہ قلبِ سلیم کے بغیر اوج ثریا (بلند مقام) حاصل نہیں ہو سکتا۔

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے ‌ ‌ ‌ ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بیباکی و بیتابی سے ‌ ‌ ‌ تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم ‌ ‌ ‌ پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے بدن میں ذوقِ تجلی کا جوہر پنہاں ہے اور جب تک اس کے دل میں سوز نہ ہو اور اس کی نگاہ پاک نہ ہو (جو قلب سلیم کی ضروریات میں سے ہیں) اس وقت تک انسان صاحب ادراک نہیں ہو سکتا اور گفتار میں بے باک نہیں ہو سکتا۔

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے ‌ ‌ ‌ پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے
ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں ‌ ‌ ‌ غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

انسان کے دل میں پوری کائنات کے ہنگامے موجود ہیں مگر چراغ راہگذر (یعنی عقل) کو اس کی خبر نہیں ہو سکتی۔ اگر دل میں جوش جنوں موجود ہو تو پھر کسی اور شے کی مدد کی ضرورت نہیں۔ وہ دل جس کی آرزوؤں اور تمناؤں میں وصلِ یار کا ذوق و شوق ہنگامہ خیز ہو تو ایسا دل ہی اپنے یار سے ربط کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ خون جگر کی گرمی کے باعث ہی انسان فطرت کے خزانوں کا علم اور دید کا شرف حاصل کر سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا؟ چراغِ راہگزر کو کیا خبر ہے؟

میں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

ماہیتِ قلب کی تبدیلی ارادۂ انسانی سے ہے

تصوف کا پہلا قدم قلب کی مدد سے ہی اٹھتا ہے اور تصوف سے مراد دل ہی کی اصلاح ہونا لیا جاتا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک ارادت اور ارادۂ انسان کا دل سے گہرا تعلق ہوتا ہے، مگر جدید علم والے اسے دماغ کی پرورش اور اصلاح سے متعلق سمجھتے ہیں۔ طریقت میں قوتِ ارادی ہی وہ قوت ہے جو انسان کو کسی بھی راہ پر لگاتی ہے اسی لئے طریقت کو ارادت بھی کہہ دیتے ہیں۔ حقیقت کی راہ میں حائل ستر ہزار حجابات کے اٹھانے کی ہمت انسان کا ارادہ ہی کر سکتا ہے۔ یہ قوت اس قدر زبردست، ناقابل تسخیر اور پرعزم ہوتی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ نے اللہ تعالیٰ کا عرفان ارادوں کے ٹوٹ جانے سے ہی اخذ کیا ہے، جیسے کہ آپ کا ارشاد ہے عَرَفْتُ رَبِّي بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ یعنی انسان کے ارادے کو جو چیز شکست دے سکے، وہی سب سے بڑی قوت ہو سکتی ہے اور ارادوں کو توڑنے والی قوت صرف خدا کی قوت ارادی ہے اور کچھ نہیں۔ لہٰذا ہمارے پختہ ارادے ٹوٹ جائیں تو ایک بات جو سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ ایک خدا ضرور موجود ہے جس کی وجہ سے ارادے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب ہم کسی چیز کا ارادہ کریں تو اس کو کہتے ہیں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

چونکہ ارادہ کی قوت کا انحصار مرید پر ہوتا ہے اس لئے ارادے کو مرید کا فعل کہا جاتا ہے۔ یہ قوت مرید میں پہلے سے موجود ہو تو شیخ اس کو صحیح راہ پر لگا سکتا ہے، ورنہ اس کو کہہ دیتا ہے کہ طریقت تجھے قبول نہیں کرتی۔ قوت ارادی کو بڑھانے کے لئے تطہیر قلب ضروری ہے کیونکہ دل میں بہت سی نفسانی خواہشات کے پائے جانے سے قلب میں انتشار اور پراگندگی پیدا ہوتی ہے اور ذہنی انتشار کے ہوتے ہوئے تو گناہگاروں کو بھی گناہ میں لذت نہیں ملتی۔ چہ جائیکہ طاعت، مراقبے اور رابطے کا ذوق اس منتشر الخیال شخص کے اندر پیدا ہو سکے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیفتہ نے کہا ہے۔

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ طاعت میں کچھ مزہ ہے، نہ لذت گناہ میں

رابطہ اور مراقبہ میں قلبِ سلیم کی حفاظت ضروری ہے

قلبِ سلیم کی حفاظت مراقبے اور توجہ سے کی جاتی ہے۔ ماحول کا نفسیاتی اثر ہر انسان پر ہوتا ہے۔ اگر ایامِ حمل میں عورت کو بری چیزوں سے واسطہ پڑے تو اس کا اثر پیدا ہونے والے بچے پر بھی ہو جاتا ہے۔ اگر کسی خوبصورت شخص کو سب لوگ بدصورت کہیں تو وہ خود کو نہ صرف بدصورت سمجھنے لگے گا بلکہ واقعی بدصورت ہو جائے گا. اسی لئے وَالعَكسُ فِي العَكسِ (یعنی عکس میں عکس ہی تو ہوتا ہے) کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مراقبہ اور توجہ الی اللہ و توجہ الی الشیخ کو تصوف کے اولین مراحل میں ہی رواج دیا جاتا ہے۔ اولیائے کرام کی سیرت کی کتب دیکھیں تو "توجہ" کے ذریعے شخصی کردار میں انقلاب کی بے شمار داستانیں ملیں گی۔ صحبت کی غایت بھی یہی ہے کہ شیخ کی طرف توجہ سے کسی سالک کا دل, قلب سلیم کے خواص پیدا کر لے۔

مراقبہ اور ربط قلب کے ذریعے. جس ہستی کے ساتھ ربط قائم کیا جائے. مراقب (مراقبہ کرنے والا) کے دل میں اس ہستی کے خواص اور اخلاق پیدا ہونے لگتے ہیں, حتی کہ وہ اس ہستی کے ذریعے سب کچھ اپنے اندر جذب کر لیتا ہے, رابطہ قائم کرنے والا انجذاب قلبی سے اپنے ایام کا راکب بن جاتا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

جہاں بینی کا شوق ہو تو ذوقِ دیدار پیدا کرو

اللہ تعالیٰ کے لقاء کا شرف اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جس کے پہلو میں درد آشنا دل اور ذوق دیدار کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہو۔ ست اور نااہل لوگ اللہ تعالیٰ کی لقا اور اس کی رضا سے محروم رہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے دیدارِ الٰہی کے متعلق جو کلام کیا ہے اس کا کچھ حصہ ہماری تصنیف "حضور قلب" میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ جس نے خود کو پہچان لیا گویا اس نے خدا کو پہچان لیا۔ اسی پہچان کو علامہ اقبالؒ نے خودی کے عرفان کا نام دیا ہے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ نے فرمایا ہے کہ خدا کا پہچاننا یہ ہے کہ جس نے خود کو بندہ جانا اس نے خدا کو خدا جانا, ورنہ بہت سے انسان تو خود کو ہی خدا تصور کرتے ہیں, اگرچہ وہ زبان سے خود کو بندہ ہی کہتے ہوں۔ قرآن میں اشارہ ملتا ہے کہ بندوں کی اکثریت تو ایسی ہے کہ جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کو ہی خدا سمجھ لیا ہے۔ (دیکھئے سورہ الجاثیہ آیت ٢٣) عرفانِ خویش ہی عرفان خدا ہے۔ علامہؒ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ جب ہم خود کو تلاش کریں تو اس تلاش کے بعد ہمیں خدا ملتا ہے اور

جب ہم خدا کو تلاش کرتے ہیں تو بالآخر ہمیں اپنا ہی پتہ ملتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسرارِ خدائی کو پہچاننے کا یوں اظہار کیا ہے۔

مرے دیدار کی ہے اک یہی شرط　　کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے

جہاں میں لذتِ پرواز حق نہیں اس کا　　وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

ہے گلہ مجھ کو تری لذتِ پیدائی کا　　تو ہوا فاش تو ہیں اب مرے اسرار بھی فاش

زِ ما نگاہ طلب، گر تو می خواہی جہاں بینی

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جو آنکھ سرمۂ فرنگ سے روشن ہو وہ پرکار و سخن ساز تو ہو سکتی ہے لیکن محبت الٰہی میں نمناک نہیں ہوتی۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک جس شخص کا دل سوز سے خالی ہو اور نگاہ میں پاکیزگی نہ ہو تو ایسا شخص نہ تو حق بات کہنے کی جرات کر سکتا ہے اور نہ ہی خدائی اسرار کا محرم ہو سکتا ہے۔ آپ کے فرمان سے یہ مراد ہے کہ جو شخص اسلامی شعار پر عمل پیرا اور کسی مرد کامل کی نگاہ لطف و کرم کو طلب کرے تو ایسا کرنے سے ہی اس کے قلب و نظر جہاں بینی کے لائق ہو سکتے ہیں۔ علامہؒ مسلمانوں کو نصیحت فرماتے ہیں کہ وہ دلوں کو دنیاوی امور کی تحصیل میں ہی نہ الجھائے رکھیں بلکہ اسے اللہ کی طرف مائل رکھیں کیونکہ یہ دل اللہ کا حرم ہے۔ جو لوگ "لاالٰہ" کی حکمرانی کو مان کر اسی کی اقلیم میں آجاتے ہیں وہ تمام کائنات کو اپنے نہاں خانۂ دل میں گم کر لیتے ہیں۔ ایسا سلوک اُسی وقت ممکن ہے جب انسان اللہ تعالیٰ سے اپنا ربط قائم کرے، جو کسی بزرگ کی صحبت میں رہ کر ہی ممکن ہوتا ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

نظر بہ صحبتِ روشندلاں بیفزاید　　زدردِ کم بصری توتیا چہ می جوئی

(روشن ضمیر حضرات کی صحبت میں نظر تیز ہوتی ہے، کم بصری کے دکھ کے لئے سرمہ کیوں تلاش کرتے ہو)

قلندریم و کراماتِ ما جہاں بینی است　　زما نگاہ طلب، کیمیا چہ می جوئی

(ہم قلندر ہیں اور جہاں بینی ہماری کرامت ہے۔ ہم سے نگاہ طلب کرو، کیمیا کس لئے تلاش کرتے ہو)

دل برنگ و بوئے کاخ و کُو مدہ　　دل حریم اوست جز با اُو مدہ

(اس جہاں کے محل و سرائے کی رنگ و بو سے دل نہ لگا۔ دل اللہ کا حَرم ہے، اس کے سوا کسی اور کے حوالے نہ کر)

ہر کہ حرفِ "لَااِلٰہ" ازبر کند عالمے را گم بخویش اندر کند

(جس کسی نے لاالٰہ کو ازبر کر لیا، اس نے گویا سارے جہاں کو اپنے اندر سمو لیا)

تو سلطانِ حجازی من فقیرم ولے در کشورِ معنی امیرم

(اے ابن سعود! تو حجاز کا سلطان ہے اور میں ایک فقیر ہوں۔ مگر میں معنوی ولایت کا امیر ہوں)

جہانے کو ز تخمِ "لاالٰہ" رست بیا بنگر بآغوش ضمیرم

(وہ جہان جو لاالٰہ کے تخم سے پیدا ہوا ہے آ! اسے میری آغوشِ ضمیر میں دیکھ)

درج بالا اشعار سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ طریقِ رابطہ میں پہلے تو ذکرِ "لَااِلٰہ" سے دل کی دنیا کو روشن کیا جاتا ہے اور پھر اس کے بعد اس میں پوری کائنات کو ملاحظہ کیا جاتا ہے بلکہ ایسی روش اختیار کرنے سے انسان کائنات کا حکمران بن سکتا ہے۔

علامہ اقبال ؒ فرماتے ہیں کہ دنیاوی مصائب و مشکلات اور خوف و ہراس پیدا کرنے والی بجلیاں میرے سینے میں کوئی اثر پیدا کیے بغیر ہی نالہ کناں رہتی ہیں اور جو آنکھ دیکھنے کی اہلیت رکھتی ہو وہ ہمیشہ مستعد اور ہوشیار رہتی ہے۔ اہل نظر تو زمانے کے حوادث کو اپنے لئے مکتب تصور کرتے ہیں اور زمانے کی ہر موجِ بلا کے طمانچوں کو استاد کا تھپڑ تصوّر کرتے ہیں۔ جو لوگ رات دن محنت اور جفاکشی میں وقت گزارتے ہیں وہ عیش و عشرت کی زندگی کیونکر بسر کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اہل اللہ پورا دن تو کاروبار حیات میں مصروف رہتے ہیں اور جب رات آتی ہے تو ساری رات اللہ کے حضور ذکر و فکر اور مراقبے میں گزار دیتے ہیں، تب کہیں جا کر وہ دیدۂ بینا حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

برقِ ایمن مرے سینے میں پڑی روتی ہے دیکھنے والی جو ہے آنکھ کہاں سوتی ہے

کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشاد شرق و غرب تیغِ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گزر

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب لُطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

نوائے نیم شب شاعر کی بارِ گوش ہوتی ہے نہ ہو جب چشمِ عالم آشنائے لطفِ بے خوابی

دل میں غوطہ لگاؤ تو وقت کی حقیقت آشکار ہو گی

علامہ اقبال ؒ امام شافعی ؒ کے قول کا حوالہ دیتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ وقت ایک کاٹنے والی تلوار ہے۔ اس کی ضرب سے پتھر پانی پانی ہو جاتا ہے اور سمندر خشک ہو جاتے ہیں۔ موسیٰ ؑ نے اسی سے کام لے کر چشمے جاری کئے اور دریائے نیل کو دو نیم کر دیا اور حضرت علی ؓ

نے درۂ خیبر کو اکھاڑا۔ اسی طرح روز و شب کے انقلاب جو ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں سمجھنے کے قابل ہیں۔ زندگی دوش و فردا ہی کا نام نہیں بلکہ اپنے دل میں دیکھو تو وہاں واردات کا ایک جہاں نمودار ہوتا ہوا معلوم ہو گا۔

علامہ ؒ فرماتے ہیں کہ انسان ایک خدائی راز تھا مگر وہ باطل کی طرف جھک گیا۔ زندگی وقت کے رازوں میں سے ایک راز ہے اور واقعات اسی سے جنم لیتے ہیں۔ وقت نے ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لیا ہوا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی معیت کو چھوڑ کر وقت کا غلام بن گیا ہے۔ وقت کی نہ ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ ہر زندہ انسان اپنے اصل (خدا) کی پہچان سے زندہ تر ہو جاتا ہے۔ زندگی زمان (زمانے یعنی وقت) سے ہے اور زمان زندگی سے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں بیان فرمایا ہے لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ وَاَنَا الدَّهْرُ (زمانے کو برا نہ کہو کیونکہ میں زمانہ ہوں)۔ وقت کا غلام گردش لیل و نہار میں ہی گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے جبکہ مردِ آزاد کے دل میں زمانہ گم ہو جاتا ہے۔ وہ خاکی ہونے کے باوجود خاک سے آزاد ہوتا ہے اور وقت کا غلام پنجرے میں مقید پرندہ کی طرح صبح و شام کے پھندے میں گرفتار اور لذتِ پرواز سے محروم رہتا ہے جبکہ مردِ آزاد کا سینہ وقت کے پرندے کے لئے پنجرہ اور قید خانہ کی مانند ہوتا ہے۔ غلام کی نشانی یہ ہے کہ وہ روزمرہ کے چکر میں جکڑا رہتا ہے اور کائنات کے اندرونی و مخفی خزانے کی دولت کو معلوم کرنے سے محروم رہتا ہے۔

علامہ اقبال ؒ اسرار خودی میں اپنی ایک نظم "اَلْوَقْتُ سَیْفٌ" میں فرماتے ہیں کہ آزاد مرد ہر وقت نئی نئی ایجاد و تخلیق میں مصروف رہتا ہے اور وہ محض پرکار کی طرح ایک دائرے میں چکر نہیں کاٹتا۔ آزاد کا حال، ماضی و مستقبل دونوں کا آئینہ ہے۔ غیب و حضور کا نکتہ اور مرور ایام کی رمز ایک راز کی طرح اس کے دل ہی میں پنہاں ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ وقت کے ساز کا نغمہ خاموش ہے۔ اگر تو وقت کا راز جاننا چاہتا ہے تو اپنے دل کے اندر غوطہ لگا۔ یعنی مراقبہ میں بیٹھو. مجاہدہ و ریاضت کی بھٹی سے گزرو، ذکر و فکر سے دِل کو گرماؤ تو وجدان تمہیں بتائے گا کہ زمان یا وقت کی اصلیت و حقیقت کیا ہے؟ جاننا چاہئے کہ مراقبے کا منشا بھی یہی ہے۔

نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت

(وقت کے ساز کا نغمہ خاموش ہے۔ اگر تو وقت کا راز جاننا چاہتا ہے تو اپنے دل کے اندر غوطہ لگا۔)

اس کلام کے بعد علامہ اقبال ؒ نے اس نظم میں اپنے اسلاف کی عظمتوں کے کارناموں کے احوال کو بیان کرنے کے بعد بتایا ہے کہ زمانے کو ترقی کی راہوں پر گامزن کرنے والی یہی مسلمان قوم تھی جو آج بدقسمتی سے عاقبت نااندیشی کی بنا پر فرامین خداوندی اور احکامِ الٰہی کو فراموش کر چکی ہے. جس کے نتیجے میں زوال و انحطاط کے عمیق گڑھوں میں جا گری ہے اور اپنے کارواں کے لٹ جانے کے احساس سے بھی عاری ہو چکی ہے۔

عصرِ حاضر کا غافل انسان خدا شناسی سے محروم ہے

آج کا انسان لذاتِ مادی اور خواہشات نفسانی میں اس قدر کھو چکا ہے کہ وہ مادیت و نفسانیت کو ہی اپنی زندگی کا حاصل تصور کرنے لگا ہے۔ اس کی عقلِ ناقص نے مادی افکار و نظریات میں تو اچھا خاصا مقام حاصل کر لیا ہے، مگر اس کی عقل عقلِ سلیم کا مقام حاصل نہ کر سکی۔ اسلام کے نزدیک وہی عقل، عقل سلیم گردانی جاتی ہے جو عقلِ کُل سے مربوط ہو۔ اسلام عقل کے مقابلے میں عشق کو، جو بحر بیکراں کی وسعت رکھتا ہے، زیادہ اہم مقام دیتا ہے، کیونکہ انسانی زندگی کی جملہ مشکلات کا حل عقل کے بس سے باہر کی بات ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ یہ عشق ہی ہے جو انسان کو ایک آہِ سرد سے وہ مقام عطا کر دیتا ہے جو عام رفتار سے سینکڑوں سالوں میں بھی حاصل نہیں ہوتا۔ انسان دنیا کے پیچ و خم میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے نفع و نقصان میں تمیز نہیں کر سکتا۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ عشق کا رتبہ ایک بحر بیکراں کی مانند ہے جبکہ عقل تو سانپ کی طرح انسان کو ڈس لیتی ہے۔ ؎

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار　　عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا

(عشق تو بحر بیکراں ہے اور عقل سانپ کی طرح ڈس لیتی ہے۔ آج کا انسان عقل کو نظر کے تابع نہ کر سکا)

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا　　آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

درج بالا نظم میں علامہ اقبال ؒ نے دانائے فرنگ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اہل فرنگ مشینوں کے آلات کی دنیا میں تو کامیاب ہو گئے ہیں لیکن ان کی یہ ترقی انسانیت کے دکھ درد کا علاج نہیں کر سکی۔ ستاروں پر کمند ڈالنے والا انسان اپنی باطنی اور روحانی کائنات کی ایک راہ گزر سے بھی آشنائی حاصل نہیں کر سکا۔ ظلمتِ آفاق کو شعاعیں بخشنے والا ظلمتِ حیات میں بھٹکتا نظر آ رہا ہے اور فلسفہ و حکمت کے خم و پیچ میں الجھ کر حقیقت شناسی اور احساس زیاں سے محروم ہو چکا ہے۔

علامہ اقبال ؒ نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ انسانیت کے مصائب و مشکلات جو ان کی زندگی کی نفسیاتی، معاشی، اخلاقی، وجدانی اور روحانی دنیا پر بری طرح اثر انداز ہو رہے ہیں، محض مادی ترقی سے دور نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے لئے ایک ایسے نظامِ حیات کی ضرورت ہے جس کی بنیاد مذہب اور ذات خداوندی کے عشق پر رکھی جائے۔ ایسے نظام کے تحت بسر ہونے والی زندگی عقل کو تابع فرمان الٰہی کرنے کی اہلیت رکھتی ہے اور انسانیت کو فیضان الٰہی سے معمور کرنے، نظر ابراہیمی سے سرشار کرنے اور رضائے الٰہی کو حاصل کرنے کی قدرت بھی رکھتی ہے اور یہی وہ عناصر ہیں جو دکھی انسانیت کو پرسکون اور

مطمئن زندگی بسر کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ طریق رابطہ ایک ایسا عمل ہے جس میں مطلوبہ سکون اور اطمینان کو حاصل کرنے کا سامان موجود ہے۔ یہ بات قرآن میں موجود ارشاد باری تعالیٰ سے ثابت ہوتی ہے کہ اللہ کی یاد میں ہی دلوں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ مراقبہ بھی ایک ایسی عبادت ہے کہ جس میں سالک کو ہمہ وقت یادِ الٰہی سے معمور رہنا میسر ہو سکتا ہے اور اپنی زندگی میں روحانی مسرت سے بھی ہمکنار ہو سکتا ہے۔

جہاں بانی سے جہاں بینی کا کام دشوار تر ہے

جہاں بانی، یعنی دنیا کے ممالک کو فتح کر لینا اور ان کے نظام کو چلا لینے کا کام تو خدا کو ماننے اور نہ ماننے والے بھی بخوبی انجام دے سکتے ہیں لیکن اس دنیا کو اس نظر سے دیکھنا اور پرکھنا جس میں اس کے خالق کی طرف سے عائد کردہ اغراض و مقاصد کی پابندی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، یہ ایک امرِ دیگر ہے۔ اسلامی حکمرانوں نے نہ صرف اپنے اماکن کے نظام کو درست کیا بلکہ انسانوں کو انسانیت کا پیغام بھی سنایا اور اپنے خالق کی پہچان اور عرفان کی راہوں کو پورے عالم پر روشن کیا ہے۔ جہاں بانی میں صرف مادیت کے نظام کی طرف توجہ دی جاتی ہے لیکن جہاں بینی میں تمام جہان کی دنیاوی وجدانی اور روحانی نگہبانی بھی کی جاتی ہے۔ اس میں ظالم اور جابر حکمرانوں کو روحانیت کا درس بھی دیا جاتا ہے اور یہ جذبہ تمام عالم میں پھیلایا جاتا ہے، جیسا کہ ہمارے اسلاف نے ایسی مثالیں قائم کی ہیں۔ جہانبانی میں امتیازِ ملک و قوم نہیں اور نہ ہی نسلی فضیلت اور تعصب ہے اور اس کے علاوہ امن اور سلامتی کو شرق و غرب کی وسعتوں تک پھیلایا جاتا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ایسا کام محض وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کی حیات کا مزاج شعلہ زن، ولولہ انگیز اور غیور قوموں کی طرح ہو۔ ایسے لوگ عابد اور جفاکش ہوتے ہیں اور مشکلات سے ٹکرانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کوئی قوم اس قدر جفاکش اور عابد و زاہد ہو تو اس کے حکمرانوں کے دل کی آنکھ کو روحانی بینائی حاصل ہوتی ہے۔ ؎

جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی

سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفاطلبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز

اہل اللہ ہی درجِ بالا پر وقار مقامات کے حامل ہونے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ کی طرف سے ہر وقت نئی روحانی غذا والی تجلّیات ملتی ہیں۔ وہ ہمہ وقت یادِ خدا، ذکر و فکر اور ربط و ضبط پر قائم و دائم رہتے ہیں۔ مقامِ ذکر کے کمالات اولیائے عظام کو عطا ہوتے ہیں اور مقامات فکر علمائے اسلام کو عطا ہوتے ہیں لیکن کامل اولیاء کو ان دونوں میں سے وافر حصہ ملتا ہے اور یہ حصہ ان کو خدا کی طرف سے علم الاسماء کے حکم کے تحت عطا ہوتا ہے، جو آدم علیہ السلام کو تخلیق کے وقت ملا تھا۔ ان کمالات کے ہوتے ہوئے انسان زمان و مکاں کی پیمائش کرتا ہے۔ طریقِ رابطہ کے حامل لوگوں کو اس

پیمائش میں وافر حصہ ملتا ہے۔۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

یہ ہیں سب ایک ہی مالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ

مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکان
مقامِ ذکر ہے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلیٰ

مشاہدے کی دولت غم و آلام برداشت کرنے والوں کو ملتی ہے

حضرت ابوالحسن خرقانیؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ کچھ نہ جاننے کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ ہم بہت کچھ جانتے ہیں، وہ درحقیقت کچھ نہیں جانتے اور جب یہ تصور کرلیں کہ ہم کچھ نہیں جانتے تو اس وقت اللہ تعالیٰ انہیں ہر شے سے واقف کر دیتے ہیں اور معرفت کے انتہائی درجات ان کو عطا فرما دیتے ہیں۔ آپ کا فرمان ہے کہ اپنے عقل و گمان سے کوئی بھی خدا کو نہیں پہچان سکتا۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو اس طرح نہیں پہچان سکے جیسے اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ لہٰذا جس شخص نے خدا کو جس قدر بھی جان لیا ہو وہ یہی تصور کرے کہ کاش میں خدا کو اس سے زیادہ پہچان سکتا۔

نیک لوگوں کو تو موت سے پہلے ہی رجوع الی اللہ ہو جانا چاہئے۔ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ نے فرمایا ہے کہ سب سے بہتر مریض قلب وہی ہے جو یادِ الٰہی میں بیمار ہوا ہو۔ ایسا مریض شفایاب بھی ہو جاتا ہے۔ جو لوگ دنیا میں غم و آلام برداشت کرتے ہیں ان کو اس کے صلے میں آخرت حاصل ہو جاتی ہے اور جو لوگ دنیا میں گریہ و زاری کرتے ہیں آخرت میں وہی مسکرا سکتے ہیں۔ صدقِ دل سے عبادت کرنے والوں کو خدا تعالیٰ اپنے کرم سے ان تمام اشیاء کا مشاہدہ کروا دیتا ہے جو قابلِ دید ہوتی ہیں۔ آپ کے اس کلام سے یہی سبق ملتا ہے کہ سالک کے لئے فکر مخلوق سے ہٹ کر رابطۂ شیخ میں مشغول ہونا بہتر ہے کیونکہ اسی کے ذریعے سالک واصل باللہ ہو سکتا ہے۔

رابطہ میں تخلیق ایک لازمی جزو ہے

لغت۔ لفظِ "تخلیق" اَلْخَلْقُ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کو بنانے یا پوری طرح اندازہ کرنے یا ابداع (یعنی کسی چیز کی ابتدا کرنے اور بغیر کسی مادے اور تقلید کے پیدا کرنے) کے ہیں اور اس کے معنی صورتوں کو تبدیل کرنا یا تحریف کرنے کے بھی ہیں۔

طریقِ رابطہ میں تخلیق کا ملکہ پایا جانا اس لئے ایک ضروری امر ہے کہ اپنے شیخ کو یا کسی اور ہستی کو اپنے سامنے حاضر کرنا عملِ تخلیق کا متقاضی ہے۔ اس صورت میں سالک اپنے شیخ یا کسی اور بزرگ ہستی یا ذات باری تعالیٰ (کے ظلالی جلووں) کو اس طرح ملاحظہ کرتا ہے گویا کہ وہ ہستی رابطہ کرنے والے کے سامنے موجود ہو۔ اس عمل میں اس کی صورت کو اپنے سامنے لانا ایسا ہی ہے جیسے کسی کی شبیہ کو روحانی دنیا میں تخلیق کیا جائے۔ طریقِ رابطہ اختیار کرنے کے لئے تخلیق کے عمل کو جاننا اور اس سے متعلق ضروری معلومات کا حاصل کرنا سالک کے لئے تربیتی اہمیت کا مقام رکھتا ہے۔

نشانِ منزل میں اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کے کرنے کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے لئے "امرِ کُنْ" (ہو جا) فرما دیتے ہیں تو وہ کام اسی لمحے میں ہو جاتا ہے اور جس چیز کو تخلیق کرنا چاہتے ہیں تو وہ فوراً تخلیق میں آجاتی ہے، گویا تخلیق میں جو چیز محرک ہے وہ اللہ کا "امر" یا حکم ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ (یٰسٓ-۸۲)

بے شک اس کا حکم یوں ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ فرماتا ہے اس کو ہو جا۔ پس وہ ہو جاتی ہے۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روح کو بھی "امر" کے نام سے موسوم فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ آپ فرما دیں کہ روح میرے رب کے حکم سے (ایک

اَلعِلْمِ اِلاَّقَلِیْلاً (بنی اسرائیل: ۸۵) چیز) ہے اور تمہیں اس کا علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا۔

سورہ یٰسٓ کی اوّل الذکر آیت نمبر ۸۲ سے معلوم ہوا کہ اللہ کا "امر" ہو جائے تو تخلیق وجود میں آجاتی ہے اور روح بھی اللہ کے امر سے ہے۔ احادیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روح کو، جو آدم کی اصل ہے، بہت طاقتیں عطا فرمائی ہیں۔ اگر روح چاہے تو زمین و آسمان کو ایک لقمہ میں نگل جائے۔ سائنس دانوں کا قول ہے کہ اگر ہم روشنی کی رفتار سے زیادہ رفتار حاصل کر لیں تو ہم دنیا کے گرد چکر کاٹنے سے پہلے ہی واپس آسکتے ہیں۔ ان کی مراد یہ ہے کہ اس کائنات میں تمام کام روشنی کی رفتار کے حساب سے ہوتے ہیں اور جب ہم اس کی رفتار سے تیز چلیں گے تو یقیناً ہم اس دنیا کے وقت سے آگے نکل سکتے ہیں (یعنی اس صورت میں منفی وقت "T" ممکن ہو سکے گا) صحیح بخاری کی ایک حدیث سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر کوئی روح چاہے تو وہ اعلیٰ علیّین سے زمین تک ایک لمحہ میں آسکتی ہے اور یہ وہ مسافت ہے کہ جس کو اگر عام دنیاوی رفتار سے طے کیا جائے تو پچاس ہزار برس میں طے ہو سکے گی۔ ان باتوں کے علاوہ دیگر بہت سی روایتوں سے روح کی طاقت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روح کو عطا کردہ طاقتوں کے پیش نظر جو چیز انسان کے ذہن میں آسکتی ہے اس کو عمل میں لانا روح کے لئے ناممکن نہیں۔

درج بالا حقائق سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ جن لوگوں کو روح پر تصرّف حاصل ہے اور وہ اس سے کام لینے کی استعداد بھی رکھتے ہیں۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے جو کام چاہیں اپنی روح کی طاقت کو بروئے کار لا کر عملی جامہ کی شکل دے سکتے ہیں۔ عالم ناسوت (یعنی اس دنیا) میں ہر چیز کسی نہ کسی ذریعے سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس دنیا کا طریقہ یہ ہے کہ یہاں جب ہم کسی شخص کو اپنی طرف بلاتے ہیں تو اسے آواز دیتے ہیں (اگر قریب ہو تو عام یعنی اپنے منہ کی آواز سے اور اگر دور ہو تو لاسلکی یا کسی اور ذریعے سے اس کو بلاتے ہیں) لیکن ہمارے اوپر موجود عالمِ ملکوت بھی اسی عالمِ محسوسات میں شامل ہے، کیونکہ ہماری دنیا کا یہ عالمِ مادی اس عالمِ ملکوت کی ہی ایک شاخ ہے۔ جو چیز ہمارے عالم ناسوت (یعنی اس دنیا) میں ہے وہ اوپر والے عالم ملکوت میں بھی موجود ہے۔ عالمِ دنیا اور ملکوت میں یہ فرق ہے کہ عالم ناسوت میں تو ہم آواز دے کر کسی کو بلا لیتے ہیں لیکن عالم ملکوت میں کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا تصوّر کرتے ہیں اور اس کی جانب اپنی روح کو متوجہ کرتے ہیں۔ اس توجہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ روح بھی ہماری طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ روح کو یہ طاقت حاصل ہے کہ جس چیز کی جانب وہ متوجہ ہو اس میں حلول بھی کر جاتی ہے لیکن اپنے مرکز (بدن) سے جدا نہیں ہوتی۔ روح کا قاعدہ ہے کہ جب وہ بحیثیت مجموعی کسی ایک تقاضے پر مرکوز (Concentrate) ہو جائے جسے روحانی زبان میں مراقبہ کہا جاتا ہے، تو روح حرکت میں آجاتی ہے۔ جب روح حرکت میں آجائے تو جس چیز کی طرف بھی وہ متوجہ ہو اس کے روحانی وجود کا مظہر سامنے آجاتا ہے۔ یعنی جس کی

طرف توجہ کی گئی ہو تو اس کی تخلیق ہو جاتی ہے اور وہ چیز سامنے آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولیائے کرام جب چاہیں اور جہاں چاہیں خود کو حاضر کر سکتے ہیں بلکہ بیک وقت کئی مقامات پر حاضر ہو سکتے ہیں اور جس کو چاہیں اپنے سامنے یا کسی اور جگہ حاضر کر سکتے ہیں۔ انہیں معنوں میں کسی نے کہا ہے۔

ع۔ اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے

روح کو یہ سب قوتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا فرمائی گئی ہیں۔ اولیائے کرام کے ہاتھوں صادر ہونے والے سب محیّر العقول کام ان کی روح کی عظیم قوت و استطاعت کے باعث ہوتے ہیں۔ مولانا روم ؒ نے فرمایا ؎

اولیاء را ہست قدرت از الٰہ تیرِ جستہ باز گردانند زراہ

(اولیائے کرام کو خدا کی طرف سے یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو راستے میں سے واپس کر دیتے ہیں)

روحی توانائی کے ذخائر حاصل کرنے کے لئے سخت مجاہدات کرنا ہوتے ہیں

تسخیرِ کائنات اور تخلیقی قوتوں کو حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ ایسی قوتوں کا خزانہ صرف اولوالعزم انبیاء و اولیاء کو ہی عطا کیا جاتا اور یہ لوگ سخت ریاضتوں اور اتباع شریعت کے بعد ہی اس مقام پر پہنچتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر کمند ڈالنے کے لئے ہمت مردانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مکتوبات سرہندی میں درج ذیل حروف میں حضرت معصوم صاحب نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"جس طرح موتی حاصل کرنے کے لئے سمندر میں غوطہ لگانا پڑتا ہے۔ اسی طرح آقائے کائنات کے لئے (یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لئے) خود کائنات ہی سے برقی و جوہری توانائی کی بھیک مانگنا پڑتی ہے اور اس مقصد کے لئے تجربہ، تجزیہ اور تحقیق و طلب کی کٹھن منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح روحی توانائی کے لامحدود ذخائر تک پہنچنے کے لئے بڑے جتن کرنا پڑتے ہیں۔ ذکر و تسبیح اور فکر و خلوت کے طویل دور سے گزرنا ہوتا ہے۔ یکسوئی میں کمال پیدا کرنے کے لئے بعض لوگ غاروں میں جا بیٹھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر وہیں رہ جاتے ہیں اور بہت کم واپس آتے ہیں اور جو آتے ہیں، وہ طاقت کا اتنا بڑا خزانہ ساتھ لاتے ہیں کہ جدھر نگاہ اٹھاتے ہیں، دلوں میں آسمانی محبت کی مقدس آگ بھڑکا دیتے ہیں، جبینیں ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لئے بے تاب ہو جاتی ہیں، وہ چاہیں تو آگ سے حرارت چھین لیں اور دریاؤں سے روانی۔ وہ اشارہ کریں تو عصائے شبانی اژدہا بن جائے، پیکر گل میں جان پڑ جائے اور چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں۔ یہ مہیب طاقت دل کی گہرائیوں میں نہاں ہے اور صرف ذکر و فکر سے عیاں ہوتی ہے۔ یہ طاقت انبیاء کے بعد اولیاء کو بھی بقدر مراتب ملتی ہے"۔

علامہ اقبالؒ کے کلام کا ایک طویل حصہ مؤمن کی ایسی قوتوں کی نشاندہی کرنے کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ آپ نے بو علی قلندرؒ کا ایک واقعہ فارسی نظم میں نقل کیا ہے جس میں بو علی قلندرؒ نے بادشاہ وقت کو اس بات پر سرزنش کی ہے کہ پانی پت کے ایک حاکم نے ان کے ایک مرید سے بے جا سلوک کیا تھا۔ آپ نے بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ اس حاکم کو اگر امرواقعی سزا نہ دی گئی تو کل صبح سورج نکلنے سے پہلے بادشاہ کی حکومت کسی اور کو دے دی جائے گی۔ اس پر بادشاہ نے آپ سے معذرت پیش کی۔

اقبالؒ کا پیش کردہ فلسفۂ تخلیق

علامہ اقبالؒ نے انسان میں پوشیدہ تخلیقی صلاحیتوں پر بہت طویل اور قابلِ ذکر کلام کیا ہے جس کا مکمل تذکرہ اس محدود تحریر کے احاطہ سے باہر ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کا فلسفۂ خودی، انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کے اردگرد ہی گھومتا ہوا نظر آتا ہے کیونکہ علامہؒ کے فلسفہ خودی کی غرض و غایت یہی معلوم ہوتی ہے کہ انسان اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ خوابیدہ صلاحیتوں کی شناخت کرکے انہیں اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں بروئے کار لائے۔ آپ کی شاعری کا واحد نصب العین بھی یہی تھا کہ مسلمان قوانین الٰہی کا مطالعہ کریں اور آئین خداوندی پر عمل پیرا ہو کر اپنی مخفی طاقتوں کو اس طرح ابھار سکیں کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرلیں۔

علامہ اقبالؒ کے نظریۂ تخلیق کے مطابق انسان کی تخلیقی فعلیت (تخلیقی کام کرنے کی استطاعت) نہ صرف اس کے اپنے وجود کے اثبات، اپنی کلّی ذات کی تکمیل اور شعور کی پختگی کے لئے ضروری ہے، بلکہ تخلیق ایک ایسا آئینہ ہے جس میں وہ اپنی قابلیت اور ہنر کا معائنہ بھی کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان تخلیق کے ذریعے اپنے اس خالقِ حقیقی کی ہدایت پر عمل پیرا بھی ہوتا ہے جس نے کبھی انسان کو حکم عدولی کی سزا میں جنت سے نکالا تھا۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس تخلیقی لذت کو کام میں لانے کے احکام موجود ہیں جبکہ ایک حدیث میں تو یہاں تک فرمایا گیا ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ (جس نے اپنے آپ کو (اور اپنی صلاحیتوں کو) پہچانا، گویا اس نے خدا کو پہچان لیا) فطرت پر انسانی روح کو برتری حاصل ہے اور انسان فطرت کی مہمات سے مقابلہ کرنے کے بعد ہی ایسی قوت حاصل کرتا ہے جو اسے تمام دنیاوی مقاصد کی تکمیل کے قابل بنا دیتی ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی زندگی اور صحت کا انحصار نفس اور فطرت کی مہمات کے خلاف مزاحمت کرنے پر ہے اور اس کی یہ صلاحیت، انسان کے پاس جو کچھ "ہے" کے مقابلے میں جو کچھ "ہونا چاہئے" کی تخلیق کرتی ہے۔ اگر یہ عملِ تخلیق قائم نہ رہے تو انسان پر انحطاط طاری ہو جاتا ہے اور بالآخر اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ خدا اور انسان دونوں ہی تخلیقِ مسلسل سے موصوف ہیں۔ اس طرح انسان خدا کا ہم نفس بن جاتا ہے اور اپنی روح میں زمان و مکان کی وسعتوں کو

سمٹتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ (انسان کے اپنے اندر بھی پوری کائنات مخفی ہے) ۔ علامہ فرماتے ہیں کہ فطرت کی حیثیت تو " ہے " کی مانند ہے اور اس کی کارکردگی " ہونا چاہئے " کی راہ میں ہماری کوششوں کے خلاف روڑے اٹکانا ہے، لیکن فن کار کو اس راہ کی مخالفتوں کے خلاف راہ ہموار کرنا ہوتا ہے اور یہ عشق و محبت کے ذریعے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

از محبت گشت ظاہر ہر چہ ہست   وز محبت می نماید نیست ہست

(محبت سے جو چیز مخفی ہو ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور محبت سے نیست (نہ ہونا) ہونا بن جاتا ہے)

علامہ کے نزدیک فنونِ عمارت، موسیقی، مصوّری حتیٰ کہ شاعری وغیرہ ابھی نامکمل ہیں اور ان سب کو ابھی جنم لینا ہے۔ انسان کو ابھی ایسا فن پیدا کرنا ہے کہ جو تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللہِ (اپنے اندر اللہ تعالیٰ کے اخلاق پیدا کرو) کے مطابق انسان میں ربّانی صفات کا انجذاب کرتے ہوئے اسے اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ کی آرزو کی بیکرانی سے ہمکنار کر دے اور جب ایسا ہو جائے تو پھر انسان نیابت الٰہی کا منصب حاصل کر لیتا ہے۔ علامہ اقبال زبورِ عجم کے حصہ دوم میں " انسان کے نام " کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

مقامِ آدمِ خاکی نہاد دریا بند   مسافرانِ حرم را خدا دہد توفیق

(تاکہ وہ آدمِ خاکی کا مقام متعین کر لیں (یا پالیں) خدا مسافرانِ حرم کو یہ توفیق دیتا ہے)

علامہ فرماتے ہیں کہ انسان فطرت کی تسخیر کے لئے اپنے فن اور تخلیقی صلاحیتوں سے کام لے سکتا ہے، اس حد تک کہ وہ نیابتِ الٰہی کا منصب بھی پا سکتا ہے۔ ایسی تسخیر اس آدم کے لئے بڑا اعزاز ہے، جسے کبھی جنت سے بے دخل کیا گیا تھا۔ یہ راستہ جدوجہد، تحرک اور بے چینی کا راستہ ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ اس راہ سے انسان تخلیق کی لذت سے سرشاری تو حاصل کر لیتا ہے مگر خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ علامہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس راستے کے علاوہ ایک راستہ اور بھی ہے اور وہ راستہ عشق کا راستہ ہے۔ یہ راستہ بھی جدوجہد، تحرک، اضطراب اور بے چینی کا راستہ ہے، البتہ اس راہ عشق سے انسان نہ صرف خدا تک پہنچ سکتا ہے بلکہ یہ عشق اس راستے کی تمام رکاوٹیں بھی دور کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام اس راہ پر چل کر سفر طے کرتے ہیں جس میں طریقِ رابطہ عشقِ شیخ کے باعث ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ ؎

عشق کی اِک جَست نے طے کر دیا قصہ تمام   اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ملکۂ تخلیق نقطۂ معراج تک پہنچ چکا تھا

قرآن اور احادیث سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ عالیہ، اوصافِ حمیدہ اور کمالات اس عروج تک پہنچ چکے تھے جہاں تک نہ تو آج تک کسی کو رسائی حاصل ہوئی ہے اور نہ کبھی کسی زمانے میں کسی کو حاصل ہو سکے گی۔ علامہ اقبالؒ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو درجۂ عروج حاصل ہونے، آپ کے بے مثل شارعِ اسلام ہونے اور آپ کے امتِ مسلمہ کے امور پر غور و فکر اور تدبر فرمانے کے انداز پر بہت طویل کلام کیا ہے، جس کا بیان اس تحریر کے احاطہ سے باہر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک عمل امت کے لئے مشعلِ راہ اور بہترین نمونۂ زندگی پیش کرتا ہے، جو ہر اعتبار سے خطا اور لغزش سے پاک اور مامون ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس حد تک خلاّقیت کی صفت سے موصوف تھے۔ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آپ کی امت کے ادنیٰ غلام جس کام کے لئے حکم فرماتے تو ان کا فرما دینا (بخاری شریف کی حدیث کے مطابق) حکمِ الٰہی جیسا رتبہ رکھتا تھا۔ مولانا رومؒ نے ایک ولی کی شان میں فرمایا ہے۔ ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

(اس کا کہنا خدا کا کہنا بن جاتا ہے۔ اگرچہ یہ کسی اللہ کے بندے کے حلقوم سے کہا گیا ہو)

علامہ اقبالؒ فلسفۂ خودی، ملکۂ تخلیق اور افکارِ تازہ وغیرہ کے متعلق بہت کچھ تحریر فرمانے کے بعد فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی راہ کی افضل ترین مثال ہیں، چنانچہ آپ افضل البشر اور خیرالبشر ہونے کے علاوہ، رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْن بھی ہیں اور زمان و مکاں پر حاوی بھی ہیں۔ علامہ نے آپ کی تعریف ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔ ؎

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسٓ، وہی طٰہٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک ایک برتر وجود کی حامل ہے۔ انہوں نے معراج جیسی نعمت کو حاصل کیا اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ جو جنت ان کے جدِامجد نے کھوئی تھی، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عشق کے انعام کے طور پر دوبارہ حاصل کر لی۔ آپ کی معراج نے یہ ثابت کر دیا کہ تمام آفاق، عالم بشریت کی زد میں ہے۔

سبق مِلا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اسوۂ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع جذبۂ تخلیق کو نمود بخشتی ہے

مذکورہ بالا تحریر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک سالکِ حق کی کامیابی و کامرانی اس کی نجات اور بلندئ درجات کے لئے اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ضروری ہے اور کامل اتباع سے انسان میں جذبہ تخلیق کی نمود بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اطاعت و اتباعِ پر ثبات و استقامت سے ملکۂ تخلیق تکمیل کی حد تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اتباع شریعت کے علاوہ اپنے اوقات کو ذکر و فکر اور مطالعۂ کائنات میں صرف کرنے سے بھی سالک کو ملکۂ تخلیق حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ طریقت کے علوم کا مطالعہ بھی مقاصد تخلیق کے حصول میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

صوفی بیا کہ آئینہ صاف است جام را   تابنگری صفائے مۓ لعل فام را

(اے صوفی آ کہ جام کا شیشہ صاف ہے، تاکہ تو لعل کی رنگت جیسی شراب کی صفائی دیکھے)

رازِ درونِ پردہ زِرندانِ مست پرس   کیں حال نیست صوفئ عالی مقام را

(پردے کے اندر کے راز مست رندوں سے معلوم کر، اس لئے کہ کسی اونچے مقام کے صوفی کا یہ کام نہیں)

حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ دنیا میں مال و دولت کے عنقا کے پیچھے تمام زندگی گزار دیتے ہیں انہیں عمر بھر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ان کے لئے بہتر ہے کہ اس دنیا کے جال کو چھوڑ کر اللہ سے لو لگالیں۔

عنقا شکارِ کس نہ شود، دام باز چیں   کانجا ہمیشہ باد بدست است دام را

(عنقا کسی کا شکار نہیں بنتا، اب جال اٹھالے۔ اس لئے کہ یہاں جال کے ہاتھ میں ہمیشہ محرومی کی ہوا ہوتی ہے)

"فکر" ایک خالص تخلیقی عمل ہے

"فکر" ایک خالص تخلیقی عمل ہے جس کی شہودی قوت (مشاہدہ کرنے کی طاقت) براہ راست مادے پر اثر انداز ہوتی ہے اور ہر تہذیبی عمل اسی وقت نتیجہ خیز ہوتا ہے جب اس کے پیچھے افکار و خیالات کی توانائی موجود ہو۔ علامہ فرماتے ہیں۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خِشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اس شعر سے یہ مراد ہے کہ سنگ و خشت کی نئی ترتیب سے جہانِ تازہ کو پیدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ نئی ادراکی قوتیں (ادراک حاصل کرنے والی طاقتیں) جو زندگی کو نئی تخلیقی معنویت عطا کرتی ہیں جہان تازہ کو وجود بخشتی ہیں۔ ہم جو نئی دنیا کا خواب دیکھتے ہیں، اس کی بنیاد کسی نئے کشف (Vision) یا کسی نئی قوت پر ہو گی جو عمل اور فکر کے مروجہ پیمانوں کو بدل کر رکھ دے۔ اس کشفِ حیات یا قوتِ خیال کا سرچشمہ باہر سے نہیں بلکہ ہمارے اندر ہی موجزن ہوتا ہے، بشرطیکہ ہم اس بات پر یقین رکھیں کہ فکر و خیال کو مادے پر فوقیت حاصل ہے۔

صوفیانہ اور فلسفیانہ تعلیمات میں اس بات کا بار بار ذکر آتا ہے کہ خیال کو مادے پر، انسان کو کائنات پر، انفس کو آفاق پر اور بطون (باطن) کو ظہور (ظاہر) پر فوقیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال ؒ کے نزدیک یہ فوقیت لازم نہیں بلکہ مادے اور شعور کے درمیان تخلیقی نسبت کا ہونا لازمی امر ہے یعنی یہ ضروری نہیں کہ مادہ شعور کا ہی غلام رہے بلکہ اس کے برعکس یہ ممکن ہے کہ نفسِ انسانی میں تخلیقی توانائی کی کمی کے باعث ذہن اور شعور مادے کے غلام ہو جائیں (جس طرح آج کل مادی دنیا میں اس کا ظہور نظر آتا ہے)۔ علامہ اقبال ؒ کے نزدیک صرف تخلیقی تصورات ہی کسی شخص کی انفرادی یا قوم کی اجتماعی زندگی کی بقا کے ضامن بنتے ہیں۔ اسی لئے اسلام میں تخلیقی عمل کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس قسم کے تفکر کی ذمہ داری ایسے لوگوں پر ہی عائد ہوتی ہے جو شاعر، ادیب، مفکّر، مدرّس، سائنس دان، روحانی راہنما یا معلمِ اخلاق ہوں جن کی نظر زندگی کے ظاہر اور باطن دونوں پر ہوتی ہے۔ جب اس نوعیت کا تفکر ختم ہو جائے تو ایسے افراد بھی جامد تصورات، مردہ افکار، نیم پختہ خیالات اور نیم صداقتوں کے اسیر ہو جاتے ہیں اور پورا معاشرہ ارتقائی عمل سے محروم ہو کر اپنی خفتہ تخلیقی صلاحیتوں کا ایک فیصد حصہ ہی بروئے کار لائے بغیر محض سانس لینے کے عمل کو یا سطحی تشکیل کو زندگی سمجھ بیٹھتا ہے۔ ایسے جامد معاشرے کے لوگ اپنی جبلّتوں کی تسکین کو ہی اپنی معراج تصور کر لیتے ہیں اور محض اینٹوں کے ڈھیر لگا لینے کو تخلیقی عمل خیال کرتے ہوئے اس دنیا سے چل بستے ہیں۔

علامہ اقبال ؒ کا تصور یہ تھا کہ ہم اپنے اعماقِ جان (روح کی گہرائیوں) اور اپنے نفس کی گہرائیوں میں ڈوب کر حقائقِ حیات کا ادراک حاصل کریں تاکہ بہتر زندگی سے آشنا ہو کر انفرادی تکمیل کے ساتھ ساتھ اجتماعی تکمیل کے عمل میں بھی شریک ہو سکیں کیونکہ اجتماعی تحریک کے بغیر انفرادی تکمیل کا مفہوم مکمل نہیں ہوتا، لیکن افسوس کہ علامہ اقبال ؒ کا فکر اس قوم کے باطنی انجماد کو کھول نہ سکا۔ زندگی کے حقائق دیکھنے کے عمل میں جب تک خونِ جگر کا تصرف شامل نہ ہو اس وقت تک زندگی محجوب ہی رہتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم افکارِ تازہ کے حقیقی سرچشموں سے کوسوں دور ہیں اور یہ ذہنی فکر کی محرومی اور غلط نظری ہمیں تخلیقی کارناموں سے محروم کرنے کا باعث بن چکی ہے۔

افکارِ تازہ سے ہی تخلیق کی نمود ہوتی ہے

قرآن میں ایسی بے شمار آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اخلاقی صفات کو بیان فرمایا ہے اور ایسی آیات کا شمار کرنا بھی مشکل ہے جن میں انسانوں کو زمین و آسمان اور اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اشیاء میں غور کرنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن کی ۷۵۶ آیات ایسی ہیں جن میں انسان کی توجہ کو کائنات میں موجود حقیقتوں کی طرف مبذول کرنے کا اشارہ ملتا ہے اور ان میں غور نہ کرنے پر وعید سنائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کبھی پہاڑوں، پھلوں، پھولوں، دریاؤں، سمندروں، سورج، چاند اور تاروں پر نظر و فکر کرنے کا حکم دیا اور کبھی تخلیقِ کائنات کی حقیقتوں پر اہلِ علم کو دعوتِ فکر دی ہے۔ کہیں رات و دن، نباتات، حیوانات، پیدائشِ انسان، معدنیات، فلکیات، موسمیات، آسمانوں اور اس کے قطروں کو معلوم کرنے کے لئے سوچ و بچار کرنے کا ارشاد فرمایا تاکہ انسان اس تمام کائنات کو مسخر کر کے اللہ تعالیٰ کی نیابت کا کماحقہٗ اہل بن سکے۔ جن قوموں نے کائنات کو مسخر کرنے کے لئے تدابیر کی ہیں وہ قومیں آج ہواؤں، فضاؤں اور خلاؤں پر حکومت کر رہی ہیں جبکہ آج کے مسلمان دنیا بھر میں ان قوموں کے رحم و کرم پر اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ مسلم کی اسی غفلت شعاری اور کوتاہ نظری کو محسوس کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوتے ہیں کہ۔ ؎

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں | نفسِ سوختہ شام و سحر تازہ کریں

اصلاحی حکماء کا خیال ہے کہ خورشید کا سامانِ سفر تخلیق سے تازہ ہوتا ہے اور اس تخلیق کے لئے افکارِ تازہ کا ہونا ضروری ہے۔ کسی چیز کے معنوی خلاّق کا حاجب (محافظ یعنی خودی، جو خدائی کے راز دان ہونے کی حیثیت رکھتی ہے) ہونا ضروری ہے۔ آج تک مشرق میں خورشید کا سامان سفر (شام و سحر اور زماں کے) تازہ کرنے والے صاحبان، تخلیق کے نقیب رہے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

جہان تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود | کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کی عزم و ہمّت نے | اس آبجو سے کئے بحرِ بیکراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے | جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں | ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا
ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے | عجب نہیں کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ قرآنی آیاتِ بیّنات میں قرآن کا، تخلیقِ انسانی، کائنات کی رنگینیوں، اشیاء کے تغیر و تبدل غرضیکہ بے شمار گراں مایہ علوم و معارف کا سرچشمہ ہونا اشاروں اور کنایوں میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ قرآن میں انسان کا نفسِ واحد (ایسا جاندار نامیہ جو ہر اعتبار سے ایک تھا یعنی واحد الخلیہ) سے پیدا فرمایا جانا، زلزلۂ قیامت سے ارض و سماء کا ذرّات میں تبدیل ہو کر دھوئیں کی طرح ہوا میں اڑنا، زمین کا توازن قائم کرنا، نافرمانوں پر بارشوں، طوفانوں اور زلزلوں کا نازل ہونا،

ابتدائے آفرینش میں ارض و سماء کا ایک ہیولیٰ کی صورت میں ہونا، زمین کا سکڑنا، جذبۂ جنسیات کا سوسائٹی پر غلط طریقے سے اثرانداز ہونا، ایک اچھے سیاسی معاشی نظام قائم کرنے کے متعلق پوری ہدایات کا ذکر ہونا وغیرہ قرآن کے ایسے اعجاز ہیں جن کا علم حاصل کرنے کے عمل کو ایک مسلمان پر فرض عین قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کے تمام فرمودات پر غور کرنا ایک محنت طلب امر ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر ان تمام افکار پر غور کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو تو وہ تحقیقی اور تخلیقی صلاحیتوں کو کسی طور حاصل نہیں کر سکتے۔ علامہ فرماتے ہیں۔ ؎

ہر چند کہ ایجاد معانی ہے خداداد — کوشش سے کہاں مردِ ہنر مند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر — میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا — روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کو اپنے کلام میں ان تمام امور پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دلائی تاکہ وہ دنیا میں اپنا مقام پیدا کر سکیں۔ ؎

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز — کر سکتا ہے وہ ذرّہ مہ و مہر کو تاراج
ناوک ہے مسلماں! ہدف اس کا ثریا — ہے سرِّ سرا پردۂ جاں نکتۂ معراج
تو معنیٔ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا — ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

رہِ یک گام ہے ہمت کے لئے عرش بریں — کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

خدا نے ذوقِ تخلیق کو انسان کے بدن میں رکھا ہے

علامہ اقبالؒ جاوید نامہ میں خلافتِ آدم کے عنوان سے فرماتے ہیں کہ دونوں جہانوں میں عشق کے اسرار موجود ہیں اور بنی آدم بھی عشق کے اسرار میں سے ہے۔ اس کا تعلق کسی شے سے نہیں بلکہ ہر شے کا تعلق اس سے ہے کیونکہ وہ خدا کا نائب ہے۔ موت، قبر، حشر، نشر اس کے احوال ہیں، وہی امام ہے، وہی صلوٰۃ، حرم، سیاہی، اور لوح و قلم بھی وہی ہے۔ اس کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب۔ پوری کائنات اس میں سما سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ذوقِ تخلیق اس کے بدن میں رکھا ہے اور وہ جس طرح چاہے اس کائنات میں اسے اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔

اے زِ دینت عصرِ حاضر بردہ تاب — فاش گویم با تو اسرار حجاب
(اس زمانے کے دور نے تیرے دین کی آب و تاب کو ختم کر دیا ہے۔ میں تم سے یہ پردے کی بات کھلم کھلا کہہ رہا ہوں)

ذوقِ تخلیق آتشے اندر بدن — از فروغِ اُو فروغِ انجمن
(ذوقِ تخلیق ترے بدن میں آگ کی طرح موجود ہے۔ اسی کی روشنی سے تمام انجمن روشن ہے)

ہر کہ بردارد ازیں آتش نصیب سوز و سازِ خویش را گردد رقیب

(جو بھی اس آگ سے کوئی حصہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے سوز و ساز کو محفوظ کر لیتا ہے)

ہر زماں بر نقشِ خود بندد نظر تانگیرد لوحِ او نقشِ دگر

(وہ ہر لحہ اپنے نقش پر نگاہ رکھتا ہے۔ تاکہ اس کی لوح کوئی دوسرا نقش اختیار نہ کرلے)

مصطفیٰؐ اندر حرا خلوت گزید مدتے جز خویشتن کس را ندید

(جناب رسول پاکؐ نے غار حرا میں خلوت گزینی فرمائی اور مدت تک اپنے سوا کسی کو نہ دیکھا)

نقشِ مارا در دل او ریختند ملتے از خلوتش انگیختند

(آپ کے قلب میں ہمارا نقش ڈالا گیا۔ آپ کی اس خلوت میں خدا نے ملتِ اسلامیہ کو ابھارا)

گرچہ داری جانِ روشن چوں کلیم ہست افکارِ تو بے خلوت عقیم

(اگرچہ تمہاری روح کلیم اللہ کی طرح روشن ہی کیوں نہ ہو۔ خلوت کے بغیر تمہارے افکار بانجھ عورت کی طرح رہیں گے)

تخلیق کے لئے خلوت درکار ہے

علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں "محکماتِ عالم قرآنی" کے عنوان سے یہ راز افشا کیا ہے کہ خلوت اور کم آمیزی تخلیق کی ضروریات میں سے ہیں۔ علم کے لئے تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے مگر تخلیق کے لئے خلوت درکار ہے کیونکہ خلوت میں ہی تخلیق کے افکار خدا کی طرف سے دل میں ابھرتے ہیں۔ (عین اسی طرح رابطہ کے لئے بھی خلوت ایک ضروری امر ہے)۔

علم و ہم شوق از مقاماتِ حیات ہر دو می گیرد نصیب از واردات

(علم اور شوق دونوں زندگی کے مقامات میں سے ہیں۔ ہر دو کا تعلق مشاہدات اور تجربات سے ہے)

علم از تحقیق، لذت می برد عشق از تخلیق، لذت می برد

(علم تحقیق سے لذت پاتا ہے۔ اور عشق تخلیق سے لذت پاتا ہے)

صاحبِ تحقیق را جلوت عزیز صاحبِ تخلیق را خلوت عزیز

(صاحبِ تحقیق کو جلوت پسند ہے۔ اور صاحبِ تخلیق کو خلوت پسند ہے)

در نگر ہنگامۂ آفاق را زحمتِ جلوت مدہ خلاق را

(پس تو ہنگامۂ آفاق کو دیکھ۔ اور اس کے خلاق کو جلوت کی زحمت نہ دے)

ہماری تصنیف "سرمایۂ ملت" میں موضوعِ قرآن پر ایک انگریز سائنس دان کی داستان درج کی گئی ہے جس میں اس نے یہ ظاہر کیا ہے کہ میرے استاد نے مچھلی پر تحقیق کرنے کو کہا اور اس کا طریقہ یہ بیان کیا کہ تنہائی میں فقط مچھلی پر غور کرتے رہو۔ جب اس نے ایک عرصہ غور کیا تو نئے نئے حقائق کا انکشاف ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ تحقیق کا اصول یہ ہے کہ اس میں ایک استاد کے ساتھ تعلق رکھنا ضروری ہے۔

خودی تخلیق و تولیدِ مقاصد ہی کا نام ہے

علامہ اقبالؒ اسرار و رموز میں "خودی از تخلیق و تولیدِ مقاصد است" (یعنی خودی کی زندگی مقاصدِ تخلیق و تولید سے ہی ہے یا یہ کہ خودی کا دوسرا نام مقاصد کو پیدا کرنا ہے) کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ کسی کے لئے کوئی مخصوص مقصد کا ہونا ایسے ہی ہے جیسے کاروان کے لئے بانگ درا ہو۔ فرماتے ہیں کہ ہم تخلیق مقاصد کے لئے ہی زندہ ہیں اور ہماری زندگی کی ساری چمک اور تابناکی آرزوؤں کی مرہون منت ہے۔ اگر ہم یہ جدوجہد اور طلب چھوڑ دیں تو ہم پر مردنی چھا جائے گی اور ہماری خودی پر موت طاری ہو جائے گی لہٰذا تخلیق کا جذبہ بھی جاتا رہے گا۔ فرماتے ہیں۔

ما ز تخلیقِ مقاصدِ زندہ ایم　　　از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

(ہم مقاصدِ زندگی کی تخلیق سے زندہ ہیں۔ آرزو کی شعاع سے ہی ہم روشن ہیں)

زبورِ عجم حصہ دوم، نظم ۴۶ میں علامہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ مقاصدِ تخلیق سے خودی کو زندگی ملتی ہے مگر جب تک عشق نہ ہو تو خودی میں استحکام نہیں قائم ہو سکتا۔ علامہ اقبالؒ زندگی کی تکمیل اور تخلیق کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے محبت اور عشق کو سب سے اہم اور بنیادی مقام دیتے ہیں۔ محبت کی نگاہ سے تو پتھر بھی شق ہو جاتے ہیں۔ اپنے محبوبِ حقیقی کو تلاش کرنا ہو تو فریضۂ عشق کے بغیر اس سے ربط قائم ہی نہیں ہو سکتا۔

ز رسم و راہِ شریعت نہ کردہ اُم تحقیق　　　جُز اینکہ منکرِ عشق است کافر و زندیق

(میں نے شریعت کے احکام کی تحقیق اس کے سوا کچھ نہیں کی کہ منکرِ عشق ہی کافر و زندیق ہے)

بہ پیچ و تابِ خرد گرچہ لذتِ دگر است　　　یقینِ سادہ دلاں بہ زنکتہ ہائے دقیق

(اگرچہ عقل کی گتھیاں سلجھانے میں اور طرح کی لذت ہے۔ مگر سادہ دلوں کا ایمان دقیق نکات سے بھی بہتر ہے)

کلام و فلسفہ از لوحِ دل فرو شستم　　　ضمیرِ خویش کشادم ز نشترِ تحقیق

(میں نے علمِ کلام اور فلسفہ کو دل کی تختی سے دھو ڈالا ہے۔ اور اپنا ضمیر، نشترِ تحقیق سے کھول دیا ہے)

علامہ اقبال کا نظریہ اس بات پر قائم ہے کہ مردِ مومن کا زندہ دل ہونا ضروریاتِ اسلام میں سے ہے اور اگر اس کا دل عباداتِ الٰہی اور اطاعتِ حق کے باعث زندہ ہو تو وہ کئی زمانے اور کئی نئی نئی چیزوں کا خالق (پیدا کرنے والا) بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ غیروں کی تقلید میں اسلامی اقدار و روایات کو کھو دیتا ہے تو وہ تباہی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی قائد اپنی قوم کو اس گمراہ کن راہ پر لے نکلے تو پوری قوم تباہی میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ مسلمان اگر قائم بامراللہ ہو تو ہر قبا اس

کے جسم پر پوری آجاتی ہے۔ جہان، انسان سے قائم ہے اور انسان، جہان سے قائم نہیں۔ علامہ اقبال ؒ نے جاوید نامہ میں اس حقیقت پر مبنی ایک مثال پیش کی ہے اور "سعید حلیم پاشا" کے عنوان سے ایک نظم میں لکھا ہے کہ کمال پاشا جو ترکی کا حکمران تھا اس نے یورپ کی تقلید میں اسلام کی گرمی کا اثر زائل کر دیا اور اس کی قوت اور سلطنت یورپ کی تہذیب کے اثر سے پگھل گئی۔ اس کا یہ خیال غلط تھا کہ مسلمان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک ماڈرن دنیا کی پیروی نہ کریں اور یہی اس کی تباہی کا باعث بنا۔ ؎

لا جرم با عالمِ موجود ساخت مثل موم از سوزِ ایں عالم گداخت

(مصطفیٰ کمال پاشا نے تہذیبِ مغرب سے موافقت اختیار کر لی۔ اور اس تہذیبِ مغرب کے سوز سے موم کی طرح پگھل گیا)

ظرفگیہا در نہادِ کائنات نیست از تقلید تقویمِ حیات

(کائنات کی فطرت نیاپن چاہتی ہے۔ تقلید میں زندگی کو استحکام نہیں)

زندہ دل خلاقِ اعصار و دُہور جانش از تقلید گردد بے حضور

(دل زندہ ہو تو نئے زمانے پیدا کرتا ہے۔ اس کی روح تقلید سے مر جاتی ہے)

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست

(بندۂ مومن خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔ اس کے بدن پر ہر جہان، قبا کی طرح سج جاتا ہے)

علامہ اقبال ؒ کی شخصیت میں مخفی تخلیقی عناصر

۱۹۵۱ء میں قاہرہ کے مشہور تعلیمی مرکز جامعہ الازہر میں ایک مقالہ پڑھا گیا۔ جس میں علامہ اقبال ؒ کی شخصیت میں پائی جانے والی جامعیت، بلند نگاہی، بلند فکری، درد و سوز، کشش و جاذبیت، جیسے عناصر پر تفصیلی گفتگو کی گئی جو انہیں دولتِ یقین و ایمان کی بدولت نصیب ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ علامہ نے ہندوستان اور مغربی ممالک سے علومِ جدیدہ کا حصول، ماہر اساتذہ سے کیا، مگر انہوں نے ان افکار اور علوم میں منفرد شخصیت بننے کے بعد اس مقام پر قناعت نہ کی بلکہ انہوں نے ادبِ اسلامی، تاریخِ ادب اسلامی، علمی صدارت، فکری زعامت اور اسلامی ذہانت کے ساتھ خود کو ایک نہایت بلند مقام تک پہنچا دیا۔ اگر وہ اپنی شخصیت کو صرف درس و تدریس، تصنیف و تالیف میں محدود رکھتے تو وہ فلسفہ، ادب، معاشیات اور تاریخ میں ایک ماہر استاد یا پروفیسر کی جگہ پا لیتے یا ایک بہت معروف شاعر بن جاتے یا یہ کہ ان کی یہ قابلیت انہیں جج، وزیر یا گورنر جیسے اعلیٰ رتبے پر فائز کر سکتی تھی اور وہ کچھ عرصے کے بعد دوسرے حکماء یا وزراء کی طرح عزلت اور گمنامی کا شکار ہو جاتے۔ اس کے برعکس علامہ اقبال ؒ نے قوم کو ایک ایسا زندہ و جاوید پیغام دیا اور لوگوں کے دلوں کو تسخیر کیا اور یوں ان کا نام ہمیشہ

کے لئے لوگوں کے دلوں میں نقش جاوداں کی طرح چمکنے لگا۔

علامہ کی اس جداگانہ روش سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی بلندیوں کا سبب ان کا دنیاوی اداروں میں تعلیم حاصل کرنا نہ تھا بلکہ انہوں نے ایسے مکتب عشق میں نشوونما پائی جس کی کرامت نے انہیں ایک عظیم شاعر، ایک عظیم مفکر اور ایک عظیم مصلح کے مقام پر لا کھڑا کیا۔ یہ وہ ادارہ تھا جہاں سے صرف آئمہ فن، مجتہدین فکر، واضعین علوم، قائدین فکر و اصلاح اور مجدد دین و ملت پیدا ہوتے ہیں اور ان کی لکھی ہوئی چیزوں کو نصاب کے طور پر یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی تصانیف کی شروحات (شرحیں) لکھی جاتی ہیں، ان کے اجمال کی تفصیل، نظریات کی تائید اور تشریح و توضیح کی جاتی ہے۔ ان کے ایک ایک فقرے اور حرف حرف پر مبسوط کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ ان کا ادارہ ایسی درسگاہ ہوتا ہے جہاں تاریخ پڑھائی نہیں، بنائی جاتی ہے۔ جہاں افکار و نظریات کی تشریح و توضیح نہیں بلکہ توضیع و تخلیق ہوتی ہے اور آثار اور نشانات کی کھوج نہیں لگائی جاتی بلکہ ایسے آثار، نشانات چھوڑے جاتے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے مدرسے میں تعلیم حاصل کرنا تو ہر انسان کے لئے ممکن ہوتا ہے مگر استقامت و تندہی اور مشقت و مجاہدہ کے امتحانات میں کامیابی و کامرانی کی سند حاصل کرنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ ایسے مدرسے میں ضمیر و وجدان کا دبستان ہوتا ہے، جہاں روحانی اور الٰہیاتی تربیت ہوتی ہے۔ علامہؒ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ خارجی مدرسے کی نسبت داخلی مدرسے نے ان میں درد و سوز، تب و تاب اور ایک نئی قوت و توانائی بخشی اور ان کا آتشیں پیام، قلب و نظر کے لئے سوزِ جاوداں ثابت ہوا۔ زیرِ غور مقالے میں مقالہ نگار نے اس بات کا تجزیہ پیش کیا ہے کہ علامہ اقبالؒ کی شخصیت کو پانچ تخلیقی عناصر نے زندہ و جاوید بنا دیا۔ ان عناصر کا مختصر جائزہ نیچے بیان کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین کرام بھی استفادہ کر سکیں۔

۱۔ ایمان و یقین کی طاقت

کسی بھی شخصیت کے بننے سنورنے اور فراز کمال تک پہنچنے میں دولتِ یقین ایک بنیادی عنصر ہوتا ہے۔ یہی یقین اور ایمان علامہ کا مربّی اور مرشد تھا جو اُن کی طاقتِ پرواز، قوت کار اور حکمت و فراست کا منبع اور سرچشمہ تھا۔ یہ دولتِ یقین آپ کو خشک فلسفہ اور جامد ایمان سے حاصل نہ ہوئی تھی بلکہ آپ کے مزاج میں عقیدہ و ایمان اور عشق و محبت کا ایک حسین امتزاج تھا، جو آپ کے قلب و وجدان، عقل و خرد، فکر و عمل، ارادہ و تصرف اور آپ کی سیرت و کردار پر چھایا ہوا تھا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ تیس سال کی ریاضت شاقہ کے بعد مجھے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ ق۔ ۱۶) پر یقین کامل ہوا اور اگر ایسا یقین کامل مجھے پہلے ہی سے حاصل ہوتا تو اس قدر ریاضت اور مشقت کی ضرورت نہ ہوتی (ہماری

تصنیف "حُسنِ نماز" میں یقین کی اہمیت، عظمت اور کمالَ وتقریباً ساٹھ صفحات پر بیان کیا جاچکا ہے۔ تفصیل کے لئے اس سے رجوع فرمائیں) اس یقین میں قربِ الوہیت. رسالت کی صداقت اور بنی نوع انسان کی فلاح. و کامیابی کی سعادت کی ضمانت موجود ہے۔ یقین میں ہی امتِ مسلمہ کی عظمت. و سطوت اور ترقیوں کے بام. و عروج کا راز مضمر ہے اور ان کے ہوتے ہوئے جلوۂ دانش فرنگ بے. حیثیت اور بےوقعت نظر آتا ہے۔

علامہ اقبال ؒ نے ملتِ اسلامیہ کو مذکورۂ بالا بنیادوں اور ستونوں پر اپنے قصرِ حیات کو تعمیر کرنے کا مشورہ دیا۔ آپ کی شاعری میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کرام کے ساتھ محبت و عقیدت کے چشمے پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کے شعری وجدان میں انہیں محبوبان خدا کی محبت آشکارا ہوتی ہے۔ ایسے کلام کی مثالیں تنگیٔ قرطاس کے باعث یہاں شامل نہیں کی جاسکتیں. البتہ تاجدارِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ علامہ کی والہانہ محبت. و الفت اور کمالِ ادب. و احترام درج ذیل شعر سے واضح ہوتا ہے۔ علامہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں ملتجی ہیں۔ ؎

مکن رسوا حضورِ خواجہؐ مارا حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

(ہمیں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رسوا نہ کریں۔ میرا حساب ان کی نظروں سے اوجھل لیا جائے)

دینِ اسلام کے وہ اعمال جن میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت شامل نہ ہو قبولِ بارگاہِ الٰہی نہیں ہوتے اور بغیر عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ادا کی جانے والی عبادت محض ایک بےروح ڈھانچے کی حیثیت رکھتی ہے اور ایسی عبادت میں بسر ہونے والی زندگی موت کے مترادف رتبہ رکھتی ہے۔ محبت کے جذبات بےجان پتھروں کو بھی زندہ. و جاوید بنا دیتے ہیں۔ علامہ اقبال ؒ نے اپنے کلام میں خصوصیت کے ساتھ مسجدِ قرطبہ، قصرِ زہرا اور تاج محل کی نظموں کو لکھتے ہوئے ان عمارتوں کے صنّاعین کے جذباتِ عشق کو اجاگر کیا ہے اور کہا ہے کہ خونِ جگر، محبت اور یقین کے بغیر کوئی بھی ادب یا فن مردہ. و افسردہ و ناتمام رہتا ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام. خونِ جگر کے بغیر

موجودہ زمانہ کی مادہ پرستی، نفس پسندی، جنسی رغبت اور نفسانی خواہشات جیسے رذائل اخلاق، جدید عصری، مادی اور لادین تعلیم کا ثمرہ ہیں جن کی وجہ سے آج کا نوجوان عشقِ حقیقی کے سوزِ دروں کی حقیقت سے ناآشنا ہے اور تباہی. و ہلاکت کی طرف سفر کر رہا ہے۔

۲۔ مسلمانوں کی عظیم کتاب "قرآن مجید" سے تمسّک

علامہ اقبال ؒ نے قرآن کا عام لوگوں کے انداز فہم سے ہٹ کر مطالعہ کیا ہے۔ علامہ اقبال ؒ کے والد گرامی نے علامہ کو یہ تعلیم دی کہ تم قرآن اس طرح پڑھا کرو کہ جیسے یہ قرآن اسی

وقت تم پر نازل ہو رہا ہے" - چنانچہ آپ نے فرمایا

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب　　گرہ کشا ہے نہ رازیؔ. نہ صاحبِ کشاف

اگر قرآن مجید کا مطالعہ انتہائی غور و فکر، تدبر و تفکر اور عمیق نظری سے کیا جائے تو اس سے نئے نئے علوم و معارف کا انکشاف ہوتا ہے، عزم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور قلب و روح کو نئی روشنی اور توانائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ کتاب درد و سوز کی کیفیات کے ساتھ مطالعہ کرنے والے قاری کو علم لدنی کی ابدی سعادتوں سے بھی بہرہ ور کرتی ہے۔ قرآن کے عجائبات، معجزات اور کمالات کا مفصل ذکر ہماری تصنیف "سرمایۂ ملت" میں کر دیا گیا ہے، جس کے مطالعہ سے قرآن کی عظمت اور اس کے اندر موجود مخفی حکمتوں سے انسان کی زندگی میں تخلیقی عنصر کا پیدا ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ علامہ کی شخصیت سازی میں قرآن کے مطالعہ کا بہت بڑا حصہ تھا۔

۳۔ عرفانِ نفس (خودی کا شعور پیدا کرنا)

انسان کی سیرت و شخصیت کی حقیقی تعمیر خودی کو پہچاننے اور عرفان ذاتِ حاصل کرنے میں مضمر ہے۔ زندگی میں سوز و مستی اور جذب و شوق کا سلسلہ خودی کا ہی مرہونِ منت ہے۔ علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ خودی سے متعلق وافر وضاحت راقم الحروف کی کتاب "عقل و عشق اور فلسفۂ خودی" کے علاوہ "حضورِ قلب" میں اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ شامل کر دی گئی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک خودشناسی، خود آگہی اگر ہو تو انسان پر اسرارِ شہنشاہی کھل جاتے ہیں۔ آج تک کوئی بزرگ ایسا نہیں ہو گزرا جس نے بغیر عرفانِ نفس کے کچھ حاصل کیا ہو۔ آپ فرماتے ہیں کہ خودی کو سمجھنے والے فقیر، دارا و سکندر جیسے شہنشاہوں سے بھی بلند شان رکھتے ہیں۔

ایک حدیث شریف میں ہے جس نے اپنی ذات اور شخصیت کو اچھی طرح پہچانا اور اپنی وہبی صلاحیتوں کا اندازہ کیا تو اس نے گویا خدا کو پہچان لیا اور جس نے خدا کو پہچان لیا اس کے لئے بڑی سے بڑی مہم فتح کرنا ایک آسان کام بن جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی شاعری میں خودی کا عرفان، اسلام کی دعوت اور قرآن کا پیغام ہے جو انہوں نے شعری زبان میں برقی لہروں کی طرح لوگوں تک پہنچایا اور انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ جس نے اپنی خودی کو پہچانا اس کے لئے ایک نئی دنیا کا تخلیق کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

۴۔ شب خیزی اور نالۂ سحر گاہی

جب پورا عالم خواب غفلت میں مدہوش سو رہا ہو تو اہلِ جذب اور اہلِ درد ایسی تنہائیوں میں سجدہ ریز ہو کر اپنے رب کی بارگاہ سے شعور و آگہی کی نئی روشنی اور نئی فکری غذا حاصل

کرتے ہیں۔ شب خیزی میں ایسے اثرات موجود ہوتے ہیں جو انسان اور خدا کے درمیانی فاصلوں کو کم کر دیتے ہیں اور ایسا سوز و گداز پیدا کرتے ہیں کہ اس کی روشنی سے مؤمن کی نگاہ فکر و عمل روشن ہو جاتی ہے اور مہمات امور کا مداوا ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ جو لوگ رات کی تنہائیوں میں بارگاہِ رب العزت میں خشوع و خضوع کے ساتھ سجدہ ریزیاں کرتے ہیں ان کی بات بحضور ایزدی ضرور سنی جاتی ہے ایسے لوگوں کے چہرے دن کے وقت روشن اور چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ایمان کی روشنی اور چمک ایک سالک کے دل میں ایسے جذبات پیدا کرتی ہے جو بالآخر جذبۂ تخلیق کو جنم دیتی ہے۔ (شب خیزی کے اثرات اور برکات کا فصیح اور بلیغ مطالعہ راقم الحروف کی کتاب "روح نماز میں فرمائیں)۔

۵۔ کسی کردار ساز شخصیت سے رابطۂ کامل ہونا

علامہ اقبالؒ کی شخصیت کی تخلیق میں جس عنصر نے اہم کردار ادا کیا وہ ان کی اولیائے کرام سے وابستگی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ کو مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کے ساتھ اس قدر والہانہ عشق تھا کہ اس شدت عشق کے باعث آپ مولانا کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتے تھے۔ مولانا رومؒ کی مثنوی نے لوگوں کو فلسفیانہ موشگافیوں اور جامد و بے جان تخیلات سے ہٹا کر حیات سازی کے اسرار، ادبی بلندیوں اور معانی کی جدّت، حکیمانہ مثالوں اور روشن ادبی نکات کے ذریعے مسلمانوں کے بگڑے ہوئے رجحان کو خوب متاثر کیا اور ان کے قلب و نظر میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کیں۔ مولانا رومؒ کی "مثنوی" تصوف پر ایک نہایت اعلیٰ اور معیاری کتاب ہے۔

علامہ اقبالؒ نے مولانا رومؒ کے افکار و نظریات کو اپناتے ہوئے یورپ کے مادی، عقلی، بے روح اور ملحدانہ افکار و خیالات کو مادہ و روح کی کشمکش سے ہٹا کر قلبی اضطراب اور فکری ارتقاء بخشا اور عقل و خرد کی ساری گتھیوں کا حل صرف آتش رومیؒ کے سوز میں پنہاں قرار دیا۔ آپ نے فرمایا کہ میری نگاہ فکر رومیؒ کے فیض سے روشن ہے اور یہ انہی کا احسان ہے کہ میرے چھوٹے سے سبو میں فکر و نظر کا ایک بحر ذخار پوشیدہ ہے۔ ایک مرد کامل کے ساتھ صحبت کی اہمیت کو مولانا رومؒ نے بھی بہت ضروری امر قرار دیا ہے اور وہ خود اپنی مثال پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب تک انہوں نے شمس تبریزؒ کی غلامی کو اختیار نہ کیا اس وقت تک وہ پوری دنیا میں مولانا رومؒ کے نام سے متعارف نہ ہو سکے۔ راقم الحروف کی تقریباً تمام کتابوں میں اور بالخصوص "تشکیل بیعت اور تربیت" اور "اسلام اور روحانیت" میں شیخِ کامل کی ضرورت پر مفصل گفتگو شامل کی گئی ہے۔ تمام اولیائے کرام کے ملفوظات کے مطالعہ کے بعد اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ کسی شخص کی تعمیر

سیرت و کردار میں ایک مرشدِ کامل کے ہاتھ کا ہونا نہایت ضروری ہے
جامعۃ الازہر میں پڑھے گئے مذکورہ بالا مقالہ میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ اوپر بیان کئے گئے پانچ عناصر نے علامہ اقبال کی شخصیت کو تخلیق کیا اور انہی عناصر نے اقبال کو مضبوط عقیدہ، قوی ایمان، فکر سلیم اور بلند پیغام عطا کیا۔ ان تمام خوبیوں نے اقبال کو اقبال بنایا۔ اس مطالعے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان عناصر کی موجودگی میں ہر مسلمان اپنی ذات کے لئے جذبۂ تخلیق اور اپنی شخصیت کی تعمیر کا سبق حاصل کر سکتا ہے۔

جس کی تخلیقی قوتیں بڑھ جائیں وہ منبعٔ فیض بن جاتا ہے

تخلیق کی قوت کس کو اور کب حاصل ہوتی ہے؟ یہ بات سمجھنے کے لئے فلسفۂ خودی کی ابتدائی معلومات کا علم ہونا ضروری ہے۔ قرآن میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس کائنات کی بہترین "انا" کا حامل رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ جیسا انسان ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ آپ کی شخصیت خیر سے اس قدر مضبوط تھی کہ آپ کا ہمسر کائنات میں ممکن نہیں اور یہی وجہ تھی کہ آپ کا فیض بھی سب سے زیادہ تھا۔ انا کو بہتر شکل میں لانے کے لئے خودی کا مطالعہ کرنا ایک ضروری امر ہے لہٰذا مناسب ہو گا کہ اس معاملہ کو واضح کرنے سے پہلے خودی کے مبادیات کو قارئین کی نذر کیا جائے۔

خودی کیا ہے؟

اپنی ذات اور شخصیت کو سمجھنے کی صورت حال، معرفتِ نفس، احساسِ نفس اور یقینِ ذات کو علامہ اقبالؒ نے خودی سے تعبیر کیا ہے۔ جب خودی کا مفہوم اپنی ذات اور اپنی شخصیت ہے تو خدا تعالیٰ کی خودی کو "انائے مطلق" کہا جاتا ہے۔ موجودات اور ممکنات کی خودی بھی "انا" ہے اور خدا تعالیٰ کی "انائے مطلق" کے برعکس اسے "انائے مقیّد" کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے خودی کا تصوّر مولانا رومؒ کے مشورے سے پیش کیا جو مولانا نے انہیں خواب میں آکر پوری وضاحت سے پیش کیا۔ چونکہ اس مضمون کا بیان طوالت طلب ہے اس لئے راقم الحروف نے اس کا تذکرہ اپنی تصنیف "عقل و عشق اور فلسفۂ خودی" میں بیان کر دیا ہے (یہ کتاب انشاء اللہ العزیز کچھ عرصہ کے بعد شائع ہو جائے گی۔) فی الحال خودی کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے، کیونکہ ملکہ تخلیق کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔

خودی، عشق کے مترادف، حیات کا دوسرا نام ہے۔ ذوق تسخیر، خود آگاہی، عرفانِ نفس (Self Realization) ذوقِ استیلا (غلبہ حاصل کرنے کا ذوق)، ذوقِ طلب

ایمان کے مترادف ایک جذبہ، سرچشمۂ جدت و ندرت، (انوکھی بات نکالنا) اور یقین کی گہرائی کا پایا جانا خودی کا مقصود ہے۔ خودی سوزِ حیات کا سرچشمہ اور ذوقِ تخلیق کا ماخذ ہے۔ یہ سب معانی صفاتِ خودی سے وابستہ ہیں اور اثباتِ خودی کی صورتیں ہیں، جو ہر چیز کو ترقی کی اگلی منزلوں کی طرف لے جانے والی ثابت ہو رہی ہیں۔

علامہ اقبال ؒ نے اسرار خودی کی پہلی طباعت میں یہ لکھا تھا کہ خودی وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات متنیر (نور کے خواہشمند) ہوتے ہیں۔ یہ ایک پر اسرار شے ہے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ یہ خودی، انا یا عین، جو عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، تمام مشاہدات کی خالق ہے۔

علامہ اقبال ؒ کے مطابق خودی کا مفہوم احساسِ نفس اور تعینِ ذات ہے۔ چنانچہ نظریۂ خودی کے یہ معنی ہوئے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو پہچانے، اپنی استعداد کا اندازہ لگائے اور اپنی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کے بعد انہیں عزمِ مصمم کے ساتھ عمل میں لائے اور پھر اس عمل کے جاری رہنے کو ہی زندگی سمجھے۔ یہ بیدار قوتیں اپنا میدانِ عمل تلاش کرتی ہیں اور کسی مدعا کی تشکیل پر ابھارتی ہیں۔ یہی مدعا انسان کا مقصد بن جاتا ہے۔ خودی ہجرت الی الحق کا نتیجہ ہے جو باطل کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح مضبوط و مستحکم ہے۔ علامہ نے فرمایا ہے۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو قطرہ ہے لیکن مثالِ بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
بخود گم بہرِ تحقیقِ خودی شو "انا الحق" گوئے و صدیقِ خودی شو
(خودی کی تحقیق کے لئے اپنے اندر گم ہو جا، انا الحق کہہ اور خودی کا صدیق بن جا)

علامہ ؒ فرماتے ہیں کہ خودی ایک نور ہے جسے ہمارے جسم خاکی میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جو عشق سے تابناکی حاصل کرتا ہے۔ عشق کی وجہ سے خودی میں سوز پیدا ہوتا ہے، جس سے وہ کائنات کو منور کر سکتی ہے اور انسان کی مٹھی بھر خاک کو کیمیا بنا سکتی ہے۔ عشق میں عاشق (بندہ) اپنے محبوب (اللہ تعالیٰ) کی عادات کی تقلید کر سکتا ہے اور اپنے محبوب کی خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر کے اس کے قریب تر ہو جاتا ہے۔

مردِ مؤمن کو خودی کے درج بالا مقام پر پہنچنے کے لئے بہت محنت اور جدوجہد کی زندگی گذارنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں سوز و ساز، درد و داغ، محنت و مشقت، عسرت و شکست، الم و حزن کا اس قدر عمل دخل ہوتا ہے کہ ایک عام آدمی کو یہ زندگی تو بہت ڈراؤنی نظر آتی ہے لیکن اس سخت کوشی کے بغیر انا کی جنس خام رہتی ہے۔ جو شخص ان سختیوں کا کڑوا گھونٹ شروع میں ہی اپنے حلق میں اتار لیتا ہے، اس کے لئے یہ سختیاں

تکلیف. وہ نہیں رہتیں۔ علامہ نے ایسے شخص کے لئے فرمایا کہ ایسا مردِ مومن، قہر کی حالت میں بھی اللہ کے بندوں پر شفیق ہوتا ہے اور اس کی سرشت قہاری. و. غفاری. و. قدوسی. و جبروت کے عناصرِ اربعہ سے بنتی ہے۔ یہ مردِ مومن دوسرے لوگوں میں بھی اپنے جیسی صفات پیدا کرنے کی خدمت انجام دیتا ہے اور ان میں تخلیقِ خیر کی استعداد پیدا کرتا ہے بلکہ بشری انا کے علاوہ غیر ذی روح اشیاء میں بھی اس کی وجہ سے ایک نیا جمال اور وجود کی ایک نئی دولت پائی جاتی ہے۔

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد آشکارا عالم پندار کرد

(جب خودی نے اپنے آپ کو بیدار کیا۔ تو یہ عالم پندار (دنیا) ظاہر ہوا)

علامہ اقبالؒ نے اسرار خودی میں ایک نظم اس عنوان سے لکھی ہے کہ نظام کائنات کی بنیاد خودی پر ہے اور زندگی کے مختلف پیکروں کا تعین اور ان کا ارتقاء خودی کے استحکام پر منحصر ہے۔ اہل ذوق اسرارِ خودی کا مطالعہ فرمائیں۔ (علامہ کے تمام فارسی کلام کا اردو ترجمہ غلام علی اینڈ سنز نے شائع کر دیا ہے۔)

خودی کا سیدھا سادھا مفہوم

خودی کے مضمون کے مطالب و مقاصد اگرچہ بہت طویل و عریض ہیں اور اس پر بہت عمیق گفتگو کی جاتی ہے لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ اس کا سیدھا سادھا مفہوم خود داری اور خود اعتمادی ہے تو یہ غلط نہ ہو گا۔ اگر انسان احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہو اور اپنی حقیقت، صلاحیتوں اور کارہائے نمایاں انجام دینے کی اہلیت سے واقف ہو سکے تو اس کے اندر ترقی کرنے اور شاہراہ حیات پر آگے بڑھ کر ایک بے پناہ قوت پیدا کر لینے کے غیر محدود امکانات موجود ہوتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے آپ کو ہیچ یا نکما سمجھنا چھوڑ دیں اور دوسروں کے احسان مند اور دست نگر نہ بنیں بلکہ اپنے اوپر بھروسہ کرنا سیکھیں اور خود ہی اپنی قوتوں سے کام لینا شروع کر دیں۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ ایک جگہ یہ سبق دیتے ہیں کہ ۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا. و جم

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

اے مسلمان اپنے دل سے پوچھ ملا سے نہ پوچھ ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت داتا گنج بخشؒ، معین الدین چشتیؒ اور جنیدؒ و بایزیدؒ یہ سب اس لئے اعلیٰ قسم کے بزرگ بن گئے کہ ان میں ایسی صلاحیتیں موجود تھیں جو ہم میں مفقود ہیں، لہٰذا ہمارے لئے بزرگی کے راستے پر چلنا قطعاً ممکن نہیں۔ ایسا ہر گز نہیں بلکہ ایک ان. پڑھ شخص بھی کوشش کرے تو وہ بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کے بعد ایک نیا بایزیدؒ اور جنیدؒ بن سکتا ہے۔

وہ باذوق حضرات جو ذکر و فکر اور مراقبے کے سیکھنے کے لئے پورے اسباق حاصل

کرلیں، تھوڑے عرصے میں وہ بھی نہ صرف ذکر و فکر وغیرہ کی اہلیت پیدا کر سکتے ہیں بلکہ روحانیت کی بلند ترین منازل بھی طے کر سکتے ہیں مگر جس چیز کی ضرورت ہے وہ ذوق طلب، تمنا، جستجو اور پر امید لگن کا پایا جانا ہے۔ علامہ اقبال کا قول ہے کہ "انسان اپنی تکمیل کے لئے خارج کا محتاج نہیں۔ وہ خود اپنا مرکز اور محور ہے اور اس دنیائے رنگ و بو کی معنویت اس کے وجود سے وابستہ ہے" اور یہی اشارہ قرآن کی اس آیت کریمہ میں ملتا ہے جو ہماری تصنیف "حضور قلب" کے سرورق کے لئے چنی گئی۔ وَفِیْۤ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (تمہارے اندر وہ سب نشانیاں موجود ہیں تم غور کیوں نہیں کرتے۔ اَلذّٰرِیٰتِ ۔ ۲۱)۔

نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی ــــ! میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں

بزرگ لوگ جانتے ہیں کہ جسم اور روح پر انسانی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ کچھ لوگ جسم کی اصلاح کرتے رہے اور بہت کم ایسے ہیں جو روح کے معاملات پر زور دیتے رہے لیکن علامہ اقبال ؒ نے جسمانی، اخلاقی اور روحانی قسم کے مروّجہ اصطلاحوں کو اپنانے کی بجائے خودی کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے وہ پوری انسانی زندگی کا ارتقاء چاہتے ہیں اور وہ خودی کو ہی انسانی حیات کی "مجموعی اصل" قرار دیتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو حقیقت بھی یہی ہے کہ خودی میں انسان کی وہ تمام بدنی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں شامل ہیں، جن کو انسان بروئے کار لا کر اپنے آپ کو عبدیت کے مقامِ بلند پر فائز کر سکتا ہے گویا اللہ کے حضور عبد مقرب کا مقام پانے کے لئے خودی ایک لازمی عنصر ہے۔

علامہ فرماتے ہیں کہ ہر انسان میں، قدرت نے تمام صلاحیتیں جو اس کو ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہیں، ودیعت کر رکھی ہیں، جو ابتداء میں ناپختہ اور خام ہوتی ہیں۔ قدرت کا یہ منشا ہے کہ ہم اپنی ان قوتوں کا سراغ لگائیں اور انہیں بروئے کار لاتے ہوئے اپنی زندگی کو کامیابی سے ہمکنار کر دیں۔ یہ طاقتیں یا استعدادیں کروڑوں میں سے کسی دو آدمیوں کے اندر بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ انہی طاقتوں کی مجموعی ترکیب سے ہر شخص کی ذات، ایغو یا خودی تشکیل پاتی ہے۔ جو شخص اپنی ان قوتوں کو ترقی کے منازل پر فائز ہونے کے لئے استعمال میں نہیں لاتا تو اس کی خودی خوابیدہ اور خام رہ جاتی ہے اور جس نے ان کی نشوونما کی تو اس نے اپنی زندگی کا راز پالیا اور اس قوت اور شان و شوکت (نیابت) کا اہل بن گیا جو بنی آدم کا حق ہے۔

علامہ اقبال ؒ نے مسلمانوں کو انتہائی زوال کی حالت سے بیدار کیا اور قوم کو زندگی کی تمام مشکلات سے نجات حاصل کرنے کے مشورے اور راہنما اصولوں سے آگاہ کیا۔ آپ نے مسلمانوں کو بتایا کہ اگر وہ اپنی خودی کی اصلاح نہ کر سکے تو وہ مزید قعرِ مذلت میں پھنس جائیں گے۔ عوام میں اگر انفرادی خودی کے احوال درست ہو جائیں تو قومی سطح پر وہ قوم فلاح پا سکتی ہے۔

قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف
نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی   معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال   یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

مردِ خود نگہدار است درویش (درویش اپنی خودی پر نظر رکھنے والا ہوتا ہے)

علامہ اقبالؒ خودی کو اس قدر اہم تصور کرتے ہیں کہ آپ کے مطابق کوئی شخص اس وقت تک مرد درویش نہیں بن سکتا جب تک اپنی خودی کی اس طرح حفاظت نہ کرے جس طرح دریا اپنے گوہر کی حفاظت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہؒ نے درج ذیل اصطلاحات میں خودی ہی کو نگاہ میں رکھنے کو بہت اہم قرار دیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے خود گداز (خود کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں پگھلانے یا فنا کرنے والا) خود گدازی (آتش فراق میں جلنا) خود گر (اپنی ہستی کو بنانے والا یعنی اپنے اختیار کی بدولت اپنی خودی کو مستحکم کرنے والا اور اپنی انفرادیت کو باقی رکھنے کے جذبہ کا حامل) کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ اسی طرح علامہؒ نے ارمغان حجاز میں خود نگہدار کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔

زمانہ کارِ اُو را می بُرد پیش   کہ مردِ خود نگہدار است دُرویش
(زمانہ خود اس کے کام کو آگے بڑھاتا ہے، کیونکہ درویش اپنی خودی پر نظر رکھنے والا ہوتا ہے)

ہمیں فقر است و سلطانی کہ دل را   نگہ داری چو دریا گوہر خویش
(یہی فقر اور یہی سلطانی ہے کہ تو اپنے دل کو، اس طرح نگہ میں رکھے جیسے دریا اپنے گوہر کی حفاظت کرتا ہے)

مردِ درویش اپنے دل کو ذکر و اذکار اور دیگر روحانی عبادتوں میں مشغول رکھتا ہے تاکہ اس گوہر یگانہ کی حفاظت ہو سکے۔ جو دل ذکر سے مجلّیٰ ہو گیا اسے مزید آب و تاب دینے کے لئے کسی شیخ کامل کی روحانیت سے رابطہ قائم کرنا تصوف کی دنیا میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تصورِ شیخ کے عمل سے سالک اپنی روحانی طاقت کو شیخ کی روحانیت سے تقویت دیتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے رموزِ بےخودی (ص۹۵ اور ۹۹ میں) میں خودنمائی کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے مراد اپنی خودی کو ظاہر کرنے والی صفت ہے جیسے الماس کی چمک خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے۔ آپ کی مراد یہ ہے کہ جس کے دل کی زمین میں غیر اللہ کے خوف کا بیج جم گیا ہو وہ اپنی زندگی میں خودی نہیں پیدا کر سکتا۔

تخمِ او چوں در گلت خود را نشاند   زندگی از خودنمائی باز ماند
(جب غیر اللہ کے خوف کا بیج تیری مٹی (بدن) میں بیٹھ گیا، تو زندگی اپنی قوتوں کے اظہار سے باز رہتی ہے)

علامہ نے زبورِ عجم (۱۲۹) میں فرمایا ہے "خودی را پردہ می گوئی" کہ جو لوگ خودی کو ایک حجاب تصوّر کرتے ہیں اور اس پردے کو اٹھانے کے لئے اپنی شخصیت مٹا دینا چاہتے ہیں ان کا یہ تصوّر غلط ہے۔ شاید علامہؒ کا اشارہ حافظ شیرازی کے اس شعر کی طرف ہو جس میں انہوں نے فرمایا ہے۔

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　　تو خود حجابِ خودی حافظؔ از میاں برخیز

(عاشق اور معشوق کے درمیان کوئی آڑ نہیں ہوتی، اے حافظ تو خود اپنے لئے ایک پردہ ہے درمیان سے اٹھ جا)

غالباً حافظ رحمتہ اللہ علیہ نے یہاں خودی کے لفظ کو بطور پردۂ وجود یعنی خواہشات نفسانی کا پردہ اٹھانے کی بات کی ہے، البتہ عام لوگ خودی سے مراد تکبر لیتے ہیں مگر علامہ نے لفظ خودی کو اس کے برعکس معنوں میں استعمال کیا ہے۔

تخلیق اُسی وقت ہوتی ہے جب مقاصد پیشِ نظر ہوں

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ "خودی تخلیقی مقاصد کے لئے زندہ اور بیدار ہوتی ہے" اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ جب تک کسی انسان کے دل میں کسی بلند مقصد کی آرزو، لگن، طلب یا اس کے نصب العین کے لئے گرمی اور حرارت پیدا نہ ہو اس وقت تک انسان وہ مقصد حاصل نہیں کر سکتا اور اسے وہ عظمت اور رفعت حاصل نہیں ہو سکتی۔ زندگی کا کارواں سوزِ آرزو اور ذوقِ طلب کی بدولت آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اگر نصب العین اور منزل پانے کے لئے انسان کے دل میں کوئی تحرک نہ ہو تو حیات انسانی تساہل پسندی، غفلت شعاری، سرد مہری اور آرام کوشی کی نذر ہو کر کسی غیر معمولی کارنامے کو سرانجام دینے کی قدرت سے محروم ہو جاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کے مطابق جب انا یا خودی کے باعث بے اطمینانی اور بے چینی اس قدر بڑھ جائے کہ کمالِ مطلق کے علاوہ کوئی چیز اسے اچھی نہ لگتی ہو تو تخلیق کا دروازہ اس پر کھل جاتا ہے۔ اگر عشق پیدا ہو جائے تو یہ عشق ان کے لئے جذبۂ محرکہ کا کام دیتا ہے اور یہ عشق مٹی کو کیمیا کر دیتا ہے۔ مردے کو زندہ کر دیتا ہے اور سوتے کو جگا دیتا ہے۔ عشق کی وجہ سے ہر شئے نیا روپ دھار لیتی ہے۔ جب ایسے شخص کی ماہیتِ قلب بدل گئی تو اس کی انا انائے کبیر (حق تعالیٰ) کے قریب تر کر دی جاتی ہے اور ایسے مرد کو اقبالؒ مردِ مومن کا لقب دیتے ہیں۔ اس مرد مومن کی نظر میں ایسی تاثیر اور شوخی ہوتی ہے کہ وہ فقط اک نگاہ سے ویران بستیوں کو بادِ بہاری سے ہمکنار کرتا چلا جاتا ہے۔ اپنی نگاہِ حق بیں سے وہ جسے چاہے فیضیاب کر دے۔ صوفیہ اس تاثیر کو نظر، نگاہ یا توجہ کا نام دیتے ہیں۔ یہ لوگ کسی نہ کسی شکل میں خیر کی تخلیق کرتے ہیں۔ مردِ مومن کی نظر سے راکھ میں شفا کا اثر ہو جاتا ہے اور ادنیٰ اعلیٰ بن جاتا ہے اور بے معنی کو معنی کی دولت نصیب ہو جاتی ہے۔ اس میں انا کی تخلیقی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ ایسا بزرگ اپنی جماعت میں رہتا ہے اور اس کا جذبۂ عشق اسے ہر وقت عمل پر مجبور رکھتا ہے اور یہ بزرگ اپنے وقت کے دوسرے لوگوں سے ممتاز و منفرد ہوتا ہے۔ علامہ ایسے بزرگ کے لئے فرماتے

ہیں۔

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

وہ راز جو دوسروں کی آنکھوں سے چھپے رہتے ہیں مردِ مومن کی آنکھ انہیں فاش کر دیتی ہے۔ انسان کو اللہ نے اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے قرب کی وجہ سے اور "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ" کے باعث وہ اللہ کے تمام اخلاق اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت تخلیق کو زیادہ سے زیادہ اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ دنیا میں اللہ کی نیابت کا حق بھی یہی انا ادا کرتا ہے۔

تخلیق کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان آزاد ہو کیونکہ تخلیق فریضہ ہے آزاد کا۔ وہ درسگاہیں جن میں تقلید اور فکرِ معاش کا درس دیا جائے اور اس کے طالب علم اپنے ماحول سے مطمئن اور قانع ہوں یا مشین کی طرح احکام کی بجا آوری کریں اور ہر معاملہ میں راضی بہ رضائے آقا رہیں تو ایسے لوگ تخلیق کے قابل نہیں ہو سکتے۔ تخلیق کے لئے جراتِ رندانہ، جوش و جنون کی حریفانہ کشمکش، ذوقِ طلب حق گوئی و بیباکی، اخلاق و اخلاص، سوزِ جگر، کشادگیٔ دل، لذتِ کردار، دولتِ عزم و یقیں، عمل پیہم، جہدِ مسلسل، سخت کوشی و تندہی، ہمہ تن مصروفیت، توجہ الی مرشدِ کامل اور انتھک کوشش جیسے بنیادی عناصر کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ وہ انا جو انائے کبیر (اللہ تعالیٰ) کی نیابت کرے اور اس کا قرب حاصل کرے تو اس کی تخلیقی قوتیں اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ وہ اپنے ماحول کے لئے منبعِ فیض بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہترین انا کو قرآن نے رحمۃ للعالمین کا لقب دیا ہے۔

خودی کا عمل، تخلیق سے تعلق رکھتا ہے

اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات ہمارے علم میں آتی ہیں جن میں سے ایک صفت تخلیق بھی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے فلسفہ خودی کے مطابق اسلام ایک ایسا تخیل پیش کرتا ہے کہ خودی کے سبب کائنات میں عملِ تخلیق جاری رہتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ خدا سب سے بڑا خالق ہے اور مسلمان خدا کی اس تخلیقی صفت کو اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب خودی کی نفی کی بجائے خودی کا اثبات ہو تاکہ انسان بھی تخلیق کی خوبی حاصل کر لینے کے باعث عدیم المثال بن سکے۔ خودی ایک لازوال حقیقت ہے جو کائنات کے ہر ذرے میں ہے، مگر اس کا انتہائی کمال انسان میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کو خودی کا یہی جذبہ حرکت و تخلیق اور بقا کی صورت عطا کرتا ہے۔

تخلیق سے متعلق مضمون بہت طویل ہے۔ انشاء اللہ کسی دوسری جگہ اس پر سیر حاصل گفتگو کی جائے گی۔ اس وقت علامہ اقبال کے چند اشعار پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔ فرماتے ہیں۔

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات لذتِ تخلیق قانونِ حیات
(عمل میں زندگی کا مضمون پوشیدہ ہے، لذت تخلیق پا لینے میں ہی کامیاب زندگی کا دستور ہے)

خیز و خلّاقِ جہانِ تازہ شو شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
(اٹھ اور اک جہان تازہ پیدا کر آگ کے شعلوں میں بیٹھ اور خلیل اللہ علیہ السلام جیسی شہرت پیدا کر)

از گِلِ خود آدمے تعمیر کن آدمے را عالمے تعمیر کن
(اپنی مٹی سے نیا انسان تعمیر کر، اور پھر انسانیت کے لئے ایک نیا جہان تعمیر کر)

آرزو را در دلِ خود زِندہ دار تا نہ گردد مشتِ خاکِ تو مزار
(آرزو کو اپنے دل میں زندہ رکھ، تاکہ تری مٹھی بھر خاک مزار نہ بن جائے)

آرزو ہنگامہ آرائے خودی موجِ بیتابے زِدریائے خودی
(آرزو ہی سے خودی کے ہنگامے قائم ہیں، اور بیتاب موج خودی کے دریا سے اٹھتی ہے)

ما زتخلیق مقاصد زِندہ ایم از شعاعِ آرزو تابندہ ایم
(ہم مقاصد پیدا کرنے کی غرض سے ہی زندہ ہیں، اور آرزو کی کرن سے روشن ہیں)

چشمِ موسیٰؑ خواست دیدارِ وجود ایں ہمہ از لذتِ تحقیق بود

(موسیٰؑ کی آنکھ نے اللہ تعالیٰ کی ذات کا دیدار چاہا، یہ سب لذتِ تحقیق کا ہی کرشمہ تھا)

اسلام نے عملِ تخلیق کی تعلیم دی ہے

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ افلاطونی اور ویدانی افکار کے قائل ہو گئے جس میں خودی کی نفی اور خود فراموشی کی تعلیم تھی۔ ان افکار کو ماننے والے لوگ خود کو نما، ادنیٰ اور ناکارہ سمجھ کر سکون کی تلاش کرتے تھے لہٰذا ان کی تہذیب جامد (منجمد اور ساکن) اور غیر متحرک ہو کر غیر تخلیقی ہو جاتی تھی۔ ان کی اس تعلیم کے برعکس اسلام میں خودی کے سبب کائنات میں عمل تخلیق کا کام جاری رکھنے کی تعلیم دی۔ اسلام نے یہ سبق دیا کہ خدا سب سے بڑا خالق ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان اخلاق الٰہیہ کو اپنائے (تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ) چنانچہ مسلمان خدا کی اس تخلیقی صفت کو اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے اور ایسا کرنا اسی وقت ممکن ہے کہ جب خودی کی نفی کی بجائے خودی کا اثبات ہو تاکہ انسان بھی تخلیق کی خوبی کو حاصل کرنے کے بعد عدیم المثال بن سکے۔

علامہ اقبالؒ کے مطابق انسان کی زندگی کی اعلیٰ ترین شکل اس کی انفرادی خودی ہے (یعنی ہر شخص اپنی خودی کی حفاظت کرے) جس میں انسان خود ایک مکمل اور سالم مرکز بن جاتا ہے۔ خودی ایک لازوال حقیقت ہے جو کائنات کے ہر ذرے میں نمایاں ہے مگر اس کا انتہائی کمال انسان میں

ظاہر ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کو یہ خودی کا جذبہ حرکت میں لاتا ہے اور تخلیق کی صورت میں زندگی کو بقا عطا کرتا ہے۔ خودی کی بدولت انسان خدا کے انوار کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ وہ خود خدا کے اندر جذب نہیں ہوتا، کیونکہ ایسا ہو تو وہ اپنی ہستی اور شناخت کھو دیتا ہے۔ حیات ایک انجذابی حرکت ہے جس میں خدائی صفات بلکہ انسان کی راہ کی تمام رکاوٹیں بھی جذب ہو جاتی ہیں۔ اسرارِ خودی جب منکشف ہو جائیں تو پانی کا قطرہ گوہر تابدار بن جاتا ہے اور سبزہ زمین کے سینے کو چاک کر کے باہر نکل آتا ہے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ خودی ایک نور ہے جو انسان کے جسم خاکی میں ودیعت کیا گیا ہے. جس کے باعث وہ مٹھی بھر خاک کو کیمیا بنا دیتا ہے اور اپنے محبوب حقیقی (اللہ تعالیٰ) کو اپنے اندر جذب کر کے اس کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ تسخیرِ کائنات کا اہل ہو جاتا ہے اور زمین و آسمان و کرسی و عرش تو کیا خودی کی زد میں ساری خدائی (کائنات) آجاتی ہے۔ ۔

خودی کی زد میں ہے ساری خدائی　　　زمین و آسمان و کرسی و عرش

انسانی زندگی میں خودی کا دائرہ وسیع تر ہے

انسان کی زندگی کا دارو مدار خودی کی دانست، پرورش اور نگہبانی پر ہے۔ علامہ اقبال ؒ فرماتے ہیں کہ ہم جہاں بھی ہیں کسی وقت خودی کی دسترس سے باہر نہیں نکل سکتے۔

خودی کی اصطلاح کے علاوہ، علامہ اقبال ؒ نے، خودی کے موافق اور اس کے مترادف معنوں میں بہت سی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ ایسی اصطلاحات کی چند مثالیں نیچے پیش کی جا رہی ہیں:۔

خود فروشی: حصول نفع کے لئے اپنے ضمیر کے خلاف کام کرنا جیسے فرمایا "خود فروشے دل ز دیں بر کندہؑ" یعنی خود فروش نے اپنے دل کو دین سے بند کر لیا ہے۔

خود فریبی: اپنے آپ کو دھوکا دینے کا عمل، جیسے فرمایا "از خیال خود فریب و فکر خام" یعنی خود فریبی کے خیال اور خام فکر کے باعث اپنے آپ کو دھوکا دینے والا ہے۔ یہ انائے مقید کا تصور ہے۔

خود گری: اپنی انفرادیت کو باقی رکھنے کا جذبہ جیسے فرمایا "ہر کجا از ذوق و شوق خود گری" (یعنی ہر جگہ اپنی انفرادیت کو باقی رکھنے کے ذوق سے)۔

خود نگری: خود نگری والا اپنی معرفت حاصل کرنے والا ہوتا ہے اور خود نگری کے اس زینے سے خدا کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے، جیسے فرمایا "خود گرے. خود شکنے. خود نگرے پیدا شد" یعنی اپنی ہستی کو

بنانے والا، خودی کو توڑ کر بے خودی میں آنے والا، اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنے والا انسان پیدا ہو گیا ہے۔

خود آگاہ. خود آگاہ خدا کی معرفت رکھنے والا ہوتا ہے جیسے فرمایا "جہانے راد گرگوں کرد مرد خود آگاہے" (یعنی ایک صاحب معرفت نے پورے جہان کی تقدیر بدل ڈالی) خود آگاہ سے مراد مرد کامل بھی لیا جاتا ہے جیسے فرمایا نشستن باخود آگاہے دمے چند "یعنی کسی خود آگاہ مرد کامل کی صحبت میں چند لمحے بیٹھنا" ایک جگہ فرمایا "از خود آگاہی یداللہی کند" یعنی خود آگاہی والا خدا کا ہاتھ بن جائے گا اور پھر جہان پر حکومت کرے گا۔

خوب آفرین: اچھی چیز کی تخلیق کرنا اور خود افزا کے معنی اپنے آپ کو بڑھانے والا یا ترقی کے امکانات میں توضیع کرنے والا، خود آرائی کے معنی خود کو بنانا سنوارنا یا کبھی غرور اور ناز کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

خود بین: اپنی ہستی کو دیکھنے والا یعنی مغرور۔

خود پرست. خود پرست کے معنی خود اپنی پوجا کرنے والے یا خود کو ہر حال میں دوسروں سے زیادہ پسند کرنے والے شخص کے ہوتے ہیں جیسے فرمایا "بہ ہر رنگے کہ ہستم خود پرستم" یعنی میں جس حال میں بھی ہوں اپنی پوجا کرنے والا ہوں اور ایک جگہ اپنی ہستی اور اپنے نفس میں جلوۂ ہستی کا تجسس کرنے والا آیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرمایا "غلام ہمت آں خود پرستم" یعنی میں اس کا غلام ہوں جس نے انسانوں کے دلوں کو جلوۂ ذات باری تعالیٰ کا تجسس عطا کیا۔

خود پرور. جسے فقط اپنا پیٹ بھرنے سے مطلب ہو جیسے فرمایا "نفس تو مثلِ شتر خود پرور است" یعنی تیرا نفس خود پرور شتر (اونٹ) کی طرح ہے۔

خود حریمِ خویش. علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں "خود حریم خویش" کی اصطلاح بیان فرمائی ہے۔ اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ عشق کی بدولت عاشقِ کامل کا دل خود ایک کعبہ بن جاتا ہے یعنی ایسا شخص ابراہیم علیہ السلام کی طرح، شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کر کے دل کو کعبہ بنالیتا ہے اور اس کعبہ میں وہ خدا کے نام پر اپنے نفس امارہ کو ذبح کر دیتا ہے۔ (دیکھئے جاوید نامہ)

خود احتساب. اپنا محاسبہ خود کرنے والا یا نفس کی بازپرس کرنے والا جیسے علامہ نے فرمایا۔

از فریبِ او خود افزا زندگی خود حساب و ناشکیبا زندگی

(اس کے جادو سے زندگی کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ زندگی اپنا محاسبہ کرتی ہے اور آگے بڑھنے کے لئے

بیتاب ہوتی ہے)

خوددار یا خودداری: اسرار خودی (ص ۴۸، ۴۹ اور ۶۰) میں خوددار یا خودداری کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن سے مراد اپنی خودی کی حفاظت کرنے والا، اپنے وقار، اپنی شخصیت اور اپنی عزت و احترام کو ملحوظ رکھنے والا ایک غیرت مند شخص ہے، خوددار سے صحیح معنوں میں ایسا شخص مراد ہوتا ہے جو متانت، سنجیدگی اور بلند ہمتی سے پیش آئے اور کسی غیر اللہ کے سامنے نہ جھکے۔

مرد خوددارے کہ باشد پختہ کار بامزاجِ او بسازد روزگار

(وہ خوددار جوانمرد جو عمل میں پختہ ہو۔ زمانہ اس کے مزاج کے مطابق خود موافقت پیدا کر لیتا ہے)

خود را باز گیری: ارمغان حجاز میں "خود را باز گیری" اپنی خودی کی معرفت حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا ہے اور ایسے ہی پس چہ باید کرد میں خود را باز یاب بھی فرمایا ہے۔

اے زِخود پوشیدہ خود را باز یاب در مسلمانی حرام است ایں حجاب

(اے اپنے آپ سے پوشیدہ، خود کو دوبارہ پالے۔ مسلمانی میں ایسا پردہ حرام ہے)

خود را بخود بخشودن: جاوید نامہ (ص ۱۶۳) میں "خود را بخود بخشودن" یعنی اپنی شخصیت کو خودی کے اشاروں پر چھوڑ دینا اور صفحہ ۱۹ پر "خود را بخویش آراستن" (یعنی اپنی ذات کو خودی سے سجانا یا خودی کو ترقی دینا) جیسی اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں۔ زبور عجم (ص ۱۴۹) میں فرمایا کہ "خود را بہ بند خود در آرد" اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ حیات خود کو خودی کا پابند بنا دیتی ہے اور آئین و قوانین عشق کی قید میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ جاوید نامہ (ص ۲۱) میں ہے کہ عقل خود بھی اس عالم کے مطالعے میں گم ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے "خود را بدیں عالم زند" کے لفظ استعمال ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا اصطلاحات کے علاوہ درج ذیل اصطلاحات کا ذکر بھی علامہ کے کلام میں ملتا ہے جن کی وضاحت ان اصطلاحات میں استعمال کردہ الفاظ سے ہی ہو جاتی ہے۔

خود را تماشا کردہ اند: انہوں نے اپنی خودی کو دیکھا ہے۔

خویش باز: اپنی صفات کے جلوے دکھانے میں مشغول رہنے والا۔ اس کے معنی اپنی جان پر کھیل جانے والے کے بھی لئے جاتے ہیں۔

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد: تخلیق انسان کے لئے جب خدا نے اپنی خودی دکھانا چاہی۔

خویش را دریافتن: اپنی خودی کو پہچاننا۔
خویش ساز: اپنے آپ کو بنانے والا اور نئے جلوے تخلیق کرنے والا

خودنمائی۔ اپنی خودی دکھانا۔

خودی دادم: میں نے خودی کا پیغام دیا۔

خود را دید: یعنی اپنے نفس کی معرفت حاصل کرلی۔

خود شکن: خدا کے سامنے اپنی ہستی کو مٹا دینے والا۔

علامہ اقبال نے اس بات کی بھی وضاحت فرمائی ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے (جیسا کہ طریق رابطہ کا اصول ہے) تو اللہ تعالیٰ بھی انسان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اسے اپنے دائمی انعامات سے نوازتا ہے۔ یہی فیضان الٰہی ہے جو سینوں میں نور کی مانند نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کی تمام صفات سمع، بصر، نور، علم، حلم، قہر و غضب وغیرہ کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے جس سے اس کی شخصیت میں ایک بے مثال نکھار. کمال اور جمال پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اسرار الٰہی کا ایک سمندر اس پر کھلنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا ادراک (ایک محدود حد تک جو اس دنیا میں روا ہے) محسوس کرنے لگتا ہے۔ جب تک انسان عرفان خویش (خودبینی) جو خودی سے ہی ممکن ہے، حاصل نہ کرے اس وقت تک خدا کو سمجھنے کی کوشش فضول اور بیکار ہے۔

اگر خواہی خدا را فاش بِینی خودی را فاش تر دِیدن بیاموز
(اگر اللہ تعالیٰ کو بے پردہ دیکھنا چاہتے ہو تو اپنی خودی کو فاش تر دیکھنا سیکھو)

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

حقیقی عالم کون ہے؟

مولانا روم" فرماتے ہیں کہ مقاصد علم کو حاصل کرلینا ہی کافی نہیں بلکہ علم کی غایت یہ ہے کہ علم کے مطالب و مقاصد کو حاصل کرے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جو کچھ نہیں جانتا لیکن اپنی خودی کا عارف ہے وہ عالم ہے کیونکہ انسان خودی کا رازدان ہو کر خدا کا ترجمان ہو جاتا ہے یعنی عرفان نفس عرفان حق کا ذریعہ ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ ۔ علامہ اقبال" فرماتے ہیں کہ زندگی کا کمال خودی ہی کی حقیقی یافت پر منحصر ہے اور زندگی کا کمال اپنی خودی کو پہچاننا ہے۔

ے کمالِ زندگی دیدارِ ذات است
چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

(دین کیا ہے اپنے اسرار کو دریافت کرنا، اپنے دیدار کے بغیر زندگی موت ہے۔)

مولانا روم" فرماتے ہیں۔

اے بسا عالم ز دانش بےنصیب حافظِ علم است آنکس نہ حبیب
(اکثر علماء عقل و دانش سے محروم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ علم کے حافظ تو ہوتے ہیں مگر علم کے حصہ دار نہیں)

داند او خاصیتِ ہر جوہرے جوہر خود را نہ داند چوں خُرے
(عالم ہر چیز (جو قائم بالذات ہے) کی خاصیت تو جانتا ہے۔ لیکن وہ اپنے جوہر سے گدھے کی طرح نابلد ہے)

قیمتِ ہر کالہ می دانی کہ چیست قیمتِ خود را نہ دانی احمقی ست
(ہر جنس کی قیمت کتنی ہے؟ یہ تو تو جانتا ہے، اپنی قیمت خود نہیں جانتا! تیری حماقت یہی تو ہے)

علم آں باشد کہ جاں زندہ کند مرد را باقی و پائندہ کند
(علم تو وہ ہوتا ہے جو روح کو بالیدگی عطا کرے جو بندے کو ہمیشہ رہنے والا اور پائندہ کر دے)

علامہ فرماتے ہیں کہ عرفان خودی کے لئے ہمیں اس لازمی علم کی طرف رجوع کرنا چاہئے جو قرآن اور حدیث میں ہمیں ملتا ہے۔ اگر یہ علم معلوم نہ ہو تو اہلِ نظر سے پوچھو فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل ۴۳)

اندکے گم شو بہ قرآن و خبر باز اے ناداں بخویش اندر نگر
(تھوڑی دیر کے لئے قرآن اور حدیث میں محو ہو جا اس کے بعد اے نادان اپنے اندر نظر ڈال)

سرِّ دیں ما را خبر او را نظر او درونِ خانہ ما بیرونِ در
(دین کے رازوں کی ہمیں تو صرف خبر ہوتی ہے مگر ان کو مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ (معرفت کے) گھر کے اندر ہیں اور ہم ابھی دروازے سے باہر ہیں)

علامہ فرماتے ہیں کہ خودی کا عرفان تمام مرحلوں کی انتہا ہے۔ اگر کوئی اس علم کو سمجھ گیا تو گویا وہ علوم و فنون کا ماہر ہو گیا۔

جس روز دل کی رمز مُغَنّی سمجھ گیا سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

علامہ اقبال" فرماتے ہیں کہ عارف خودی کو وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جو لازوال ہو ایسے عارف کامل کو موت بھی فنا نہیں کر سکتی۔

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا　　　تیرے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

مولانا روم ؒ فرماتے ہیں کہ علم کسی عالم کے لئے عرفان اور علم نفسی کے بغیر بے فائدہ ہے۔ ایسا رسمی علوم کا ذخیرہ کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے؟ تجریدات کا گورکھ دھندہ انسان کے کسی کام میں آنے والی شے نہیں۔

فلسفی گشتی و آگہ نیستی　　　خود کجا و از کجا و کیستی
(تو فلسفی تو بن گیا ہے لیکن اس بات سے آگاہ نہیں، کہ تو خود کیا ہے، کہاں سے آیا اور کیا ہے)

از خود آگہ چو نہٖ ای اے بے شعور　　　پس نہ باید بر چنیں علمت غرور
(اے بے شعور جب تو خود سے آگاہ نہیں ہے، تو پھر تجھے اس قسم کے علم پر غرور نہیں کرنا چاہئے)

ایسے فقیہہ حکیم اور شاعر جو محض سخن باف ہوتے ہیں اور تخیلات و تصورات اور تعقلات کے چکر میں بات کہتے ہیں ان سے دور رہنا ہی بہتر ہے کیونکہ ان کے کلام میں لذّتِ نظر و یافت کا وجدان اور تاثیر کا فقدان ہوتا ہے۔

گزر از آنکہ ندید است و جز خبر ندہد　　　سخن دراز کند، لذّتِ نظر نہ دہد
(ایسے عالم سے گذر جسکو دید نہ ہو اور صرف کسی شے کی ہی خبر دے۔ ایسا شخص سخن دراز کرتا ہے اور اس میں لذت نظر نہیں ہوتی)

شنیدہ ام سخنِ شاعر و فقیہہ و حکیم　　　اگرچہ نخل بلند است، برگ و بر ندہد
(میں نے شاعر و فقیہہ اور فلسفی کا کلام سنا ہے۔ ایسے لوگوں کا ظاہری درخت، قد و قامت تو رکھتا ہے مگر برگ اور ثمر آور نہیں ہوتا)

ربط مقصود ہو تو اللہ کے جلوے ہر جگہ موجود ہیں

معیّتِ حق بہ خلق ایک مسلّم امر ہے۔ قرآن میں متعدد آیات میں انسان کی توجہ اس طرف دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تو تمہاری اپنی جانوں سے زیادہ نزدیک ہے۔ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ یعنی وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو (الحدید آیت ۴) ایک جگہ فرمایا فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ یعنی تم جدھر بھی رخ کرو وہیں ذات خداوندی موجود ہے۔ (البقرہ: ۱۱۵) سورہ ق آیت ۱۶ میں فرمایا نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ یعنی ہم تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ درج ذیل آیت میں حق تعالیٰ کی احاطت اور اس کا حضور و شہود نہایت صراحت کے ساتھ ثابت ہے۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ٥ حٰمٓ السجدہ ۵۳-۵۴)

ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی (قرآن) حق ہے۔ کیا آپ کے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ آپ کا رب ہر شے پر حاضر و موجود ہے۔ یاد رکھو کہ یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات و رؤیت کے بارے میں شک کرتے ہیں۔ بلاشک وہ ذات ہر شے کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ عام لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ محض عرش پر ہوتا ہے حالانکہ وہ تو ہر جگہ موجود ہے اور ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ حضور قلب میں حضرت بایزید بسطامیؒ کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ بایزید بسطامیؒ عبادت کے دوران جب عرش پر پہنچے تو دیکھا کہ عرش ہانپ رہا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ اے عرش بتا ہمارا محبوب کہاں ہے کیونکہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ عرش پر سوار ہے۔ عرش نے کہا کہ اے بایزید! تمہیں تو یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے بندوں کے پاس ہوتا ہے۔ عرش کی یہ بات سن کر آپ پر وجد طاری ہو گیا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں اس موضوع پر بہت کلام کیا ہے۔ اگر آپ کا ایسا کلام یہاں شامل کیا جائے تو اس کے لئے بیان بہت طویل ہو جائے گا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ! خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اس عالم کا عرفان حاصل کرنا ہو تو یہ جان لو کہ یہاں سوائے "اللہ ھُو" کے اور کچھ نہیں۔ کائنات کے پوشیدہ رازوں کو کھولنے اور اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرنے کے لئے خود کو فنا کرنا ضروری ہے جس طرح ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے۔ ؎

زمین و آسمان و چار سو نیست در ایں عالم بجز "اللہ ھُو" نیست

(زمین و آسماں اور چاروں اطراف کوئی چیز نہیں ہیں، اس عالم میں سوائے "اللہ ھُو" کے اور کچھ نہیں)

تو اے ناداں دلِ آگاہ دریاب بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب

(اے ناداں تو دل آگاہ حاصل کر اسلاف کی طرح اپنے اندر (اللہ کی طرف) راستہ تلاش کر)

چناں مومن کند پوشیدہ را فاش "زلَا موجود"، "اِلَّا اللہ" دریاب

(مومن پوشیدہ باتوں کو کس طرح فاش کرتا ہے۔ لاموجود (فنا) سے اِلَّا اللہ (بقا) کا عرفان حاصل کرتا ہے)

فَلَسْتَ تَظْهَرُ لَوْلَايَ لَمْ اَكُن لَوْلَاكَ　　　ظہور تو بمن است و وجود من از تو

(ترا ظہور مجھ سے ہے اور میرا وجود تجھ سے ہے۔ پس تو ظاہر نہ ہوتا اگر میں نہ ہوتا اور میں نہ ہوتا اگر تو نہ ہوتا)

مذکور بالا بیان سے معلوم ہوا کہ جو سالک رابطۂ شیخ، رابطۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا ربطِ الٰہی قائم کرنا چاہتا ہے تو اس راہ میں اُسے کامیابی اسی وقت میسر ہو سکتی ہے جب اس کو ملکۂ تخلیق حاصل ہو جائے۔ ملکۂ تخلیق کے حصول کے لئے سالک کو صحبتِ شیخ میں رہ کر مجاہداتِ شاقہ اختیار کرنا ہوں گے۔

اولیاء اللہ کی طرف سے مدد حقیقتاً. اللہ کی مدد ہے

کوئی شخص اس وقت تک مقامِ ولایت پر فائز نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہر ایک عمل محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے نہ ہو۔ رضائے الٰہی کے اس پیکر کی اپنے لئے اور اپنے وابستگان کے لئے مانگی گئی دعا اگر شرف قبولیت سے نوازی جائے تو یہ اس پر اللہ تعالیٰ کے خاص لطف و عنایت اور فضل و کرم کی علامت ہوتی ہے۔ اولیاء اللہ کی ارواح بھی اللہ کے حکم سے اپنے ارادتمندوں کی امداد کرتی ہیں۔ اس نوعیت کی امداد کرنے کی استطاعت صرف اولیاء اللہ کو ہی میسر ہوتی ہے اور وہ اس وقت تک دعا نہیں مانگتے جب تک خدا کا اذن نہ ہو۔ اولیاء کی اس امداد کو استمداد از غیر اللہ قرار دینا عقل سے بعید ہے۔ امداد از اولیا اللہ میں اللہ کے نام کی شرکت ہی غیر اللہ کی نفی کو ظاہر کرتی ہے، لہٰذا غیر اللہ کا نام اس سے اٹھ جاتا ہے۔ اولیا اللہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی کام کرنے کی قدرت عطا کی جاتی ہے، لہٰذا ایسے غیر معمولی قدرت والے امور کا وارد ہونا ان کی شان سے بعید نہیں۔ انسان کے سر پر خلافت الٰہی کا تاج رکھا گیا ہے اور اس کو خاص اختیارات سے نوازا گیا ہے۔ اولیاء اللہ کے ہاتھوں پر ایسے اعمال سرزد ہوتے ہیں جن پر فرشتے بھی وجد کرتے ہیں۔

اگر اولیا سے ربط ہو تو وہ زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی مدد کرتے ہیں

یہ مسئلہ متنازع فیہ ہے کہ اولیاء کرام اپنے عقیدتمندوں کی حاجات میں امداد کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں یا نہیں رکھتے؟ حالانکہ انسان کی تخلیق میں سب سے زیادہ فضیلت اسی بات میں ہے کہ وہ دوسروں کے لئے اپنے دل میں درد پیدا کرے اور ایک دوسرے کی مصیبت میں نہ صرف کام آئے بلکہ اپنے بھائیوں کے لئے ایثار بھی کرے۔ اسلام کا مذہب ہی بھائی چارے کا مذہب ہے اور سورہ الزخرف، آیت ۶۷ میں ہے کہ قیامت کے دن جگری دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن بن

جائیں گے سوائے متقی لوگوں کے کہ جن کی دوستی قیامت کے دن بھی سلامت رہے گی اور ان کو اللہ تعالیٰ نے اذن عطا کر دیا ہے کہ جس کی چاہیں مدد کریں۔ لہٰذا مرنے کے بعد مدد کرنے میں شرک کی کونسی بات ہے؟ مولانا روم ؒ فرماتے ہیں ۔

اولیا را ہست قدرتِ از اِلٰہ تیرِ جستہ باز گردانند زِراہ

(اولیاء اللہ کو اللہ کی طرف سے اس قدر قدرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو راہ سے موڑ سکتے ہیں)

ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا روم ؒ کا یہ فیصلہ قرآن کے عین مطابق ہے کیونکہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کا تخت سینکڑوں میل کی مسافت سے اپنے پاس طلب فرمایا اور آصف بن برخیاؒ نے اسے آنکھ کے جھپکنے سے پہلے ہی حاضر کر دیا، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس عمل کو اللہ کی طرف سے ایک عمل قرار دیا اور فرمایا هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۔ اس دلیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معترض حضرات کی یہ تکرار محض لفظی اور ظاہرداری پر مبنی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی اہم بات کو سمجھنا چاہے تو اس کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے ذہن کو آلائشی اندازوں سے ہٹالے اور امت کے اولیائے کرام کے فیصلوں کی طرف رجوع کرے تاکہ اسے اس رحمت سے حصہ ملے جو اولیاء کی جماعت پر نازل ہوتی ہے۔ ایک مسلمان ایسے پیچیدہ مسئلوں کو عقل سلیم اور قلب منیب کے ساتھ حل کرلیتا ہے۔ ایسی باتوں کے ماننے کے لئے وہ یہ کبھی نہیں کہتا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِکَۃُ (کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ اتارے گئے۔ الفرقان۔ ۲۱)۔ عوام کی مزید تسلی اور روحانی مسرت کے لئے، اس موضوع پر کہ اولیاء کبار زندگی میں اور انتقال کرنے کے بعد بھی مدد کر سکتے ہیں نیچے چند بصیرت افروز دلائل پیش کئے جارہے ہیں تاکہ قارئین اسے پڑھ کر اپنے دلوں میں وجدانی کیفیت محسوس کریں۔

(الف) استمدادِ اولیاء پر حضرت مجدّد علیہ الرحمۃ کا نظریہ

حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اس بات پر قوی ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولیائے کرام کو اس حد تک طاقت بخشی ہے کہ وہ جو چاہیں اور جس طرح چاہیں تصرف کر سکتے ہیں، چنانچہ مکتوبات شریف میں سے چند اقتباسات پیش کئے جارہے ہیں۔

۱۔ تقدیر مبرم کا بدلنا

مکتوب ۲۱۷ دفتر اول حصہ سوم میں آپ فرماتے ہیں کہ تقدیر دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک مبرم اور ایک غیر مبرم۔ قضائے مبرم وہ ہوتی ہے جسے اٹل کہا جاتا ہے اور وہ کسی حال میں تبدیل نہیں ہو سکتی، مگر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تقدیر مبرم کے بدلنے پر

بھی اختیار عطا کر دیا ہے کہ اگر چاہوں تو اس میں بھی تصرف کر سکتا ہوں چنانچہ مردوں کا زندہ کرنا اور بارہ برس کے بعد دریا میں ڈوبی ہوئی بارات کا دریا سے نکالنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کی اسی نوعیت کی مثالیں ہیں۔ حضرت مجددؒ نے بھی اپنا ایک واقعہ حضرت طاہر بندگی ؒ کے متعلق مکتوبات میں بیان فرمایا ہے۔ (تقدیر مبرم کے بدل دینے کی سند کے لئے مکتوب مذکور کو ملاحظہ فرمائیں)

۲۔ مخالف اور مہالک میں مدد کرنا

مکتوب نمبر ۵۸ دفتر دوم حصہ ہفتم میں آپ سے یہ سوال پوچھا گیا کہ حضرت علیؓ اور دیگر اولیاء سے کچھ ایسے نادر افعال منقول ہیں جو اس دنیا میں آنے سے پہلے ان سے صادر ہوئے اور اگر ایسا ہے تو پھر یہ تناسخ کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ آپ نے اس سوال کا جواب کافی طوالت سے بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اولیاء کے اس نوعیت کے تمام اعمال اللہ کی مشیت سے ہوئے اور یہ کرامات ان بزرگوں کی ذات کے مختلف مثالی اور لطیف اجسام میں آنے کے بعد وارد ہوئیں۔ ان کا کوئی دوسرا جسم نہیں تھا۔ تناسخ یہ ہے کہ روح اپنے جسم کے علاوہ کسی اور چیز سے تعلق رکھتی ہو اور جب روح خود ہی کوئی جسم اختیار کرے تو یہ تناسخ کیسے ہوا۔ جنوں کو اللہ نے یہ طاقت دے رکھی ہے کہ وہ مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں۔ (اسی طرح فرشتے بھی آدمی کی شکل میں آتے ہیں) اور اگر کاملین کو بھی اللہ تعالیٰ یہ طاقت دے دے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ جبرئیل علیہ السلام کا دحیہ کلبیؓ کی شکل میں آنا تو صحیح بخاری کی ایک حدیث میں وارد ہوا ہے۔

۳۔ روح کا کئی مقامات پر مدد کے لئے حاضر ہونا

مذکورہ بالا جواب کے تسلسل میں حضرت مجدد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ بعض اولیاء سے نقل ہے کہ وہ ایک وقت میں کئی ایک مقامات پر حاضر ہوتے ہیں اور ان سے مختلف اعمال وقوع میں آتے ہیں کیونکہ ان کے لطائف مختلف جسم اور مختلف اشکال اختیار کر سکتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شخص اگرچہ وہ ہندوستان میں ہوتا ہے مگر لوگ اس کو حج میں موجود پاتے ہیں اور ان سے معاملات کا وارد ہونا بھی بیان کرتے ہیں۔ کسی نے اس شخص کو روم میں دیکھا اور کسی نے اس کو بغداد میں دیکھا۔ یہ سب اس عزیز کے لطائف کی شکلیں ہیں جو مختلف اشکال میں ظاہر ہوتی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ کبھی اس بندے کو ان واقعات کی خبر بھی نہیں ہوتی اور وہ کہتا ہے کہ میں تو گھر سے باہر بھی نہیں نکلا اور نہ ہی میں نے کبھی حرم کعبہ کو دیکھا ہے اور نہ ہی روم اور بغداد کو پہچانتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگ مختلف شکلوں میں دیکھتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں اور پیروں کی مثالی صورتوں سے مرید اپنی مشکلات حل کرواتے ہیں۔

مذکور بالا سوال کے جواب میں حضرت مجددؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اسی طرح حاجتمند لوگ اولیاء اللہ سے زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی مخالف اور مہالک میں امداد طلب کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اولیائے کرام کی صورتیں حاضر ہو جاتی ہیں اور ان کے مصائب کو دور کر دیتی ہیں۔ ان اولیاء اللہ کو کبھی اس کی اطلاع ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔

۴۔ خرقۂ قیومیت عطا ہونے پر اولیائے کبار کی روحوں کا حاضر ہونا

تذکرۂ مشائخ نقشبندیہ میں علامہ نور بخش توکلیؒ صفحہ ۲۰۴ پر لکھتے ہیں کہ شاہ کمال کیتھلی کے پوتے شاہ سکندر کیتھلی نے حضرت اویس قرنیؒ کا خرقہ جو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی معرفت سے ان تک پہنچا تھا، حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں بمطابق وصیت پہنچایا تو آپ وہ خرقہ پہن کر حرم سرا میں تشریف لے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ مع اپنے تمام خلفاء کے وہاں پہنچے۔ اس کے بعد مشائخ نقشبندیہ، کبرویہ اور چشتیہ بھی وہاں حاضر ہو گئے اور سب نے دعویٰ کیا کہ حضرت مجددؒ ان کے سلسلے کے پروردہ ہیں اور بالآخر مشائخ کبرویہؒ اور چشتیہؒ نے ان گروہوں میں صلح کرادی اور ہر ایک نے آپ کو اپنی نسبت سے سرفراز فرمایا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام اولیائے کرام کی روحیں خاص خاص موقعوں پر یکجا بھی ہوتی ہیں اور انفرادی طور پر بھی تشریف لاتی ہیں۔ روحوں اور ملائکہ کے نازل ہونے کا ذکر سورۂ القدر میں بھی آیا ہے۔ تربیتِ عشاق میں ہے کہ حضرت میر سید علی ہمدانی کشمیریؒ نے بیک وقت چالیس آدمیوں کے گھر جا کر کھانا تناول فرمایا اور ہر جگہ بیٹھ کر ایک مختلف غزل لکھی۔

۵۔ کاملین کو اللہ تعالیٰ تمام اشیاء پر قیوم بنا دیتا ہے اور وہ مریدوں کی مدد بھی کرتے ہیں

مکتوب نمبر ۴۷ (ص ۱۱۸۸) دفتر دوم حصہ ہفتم میں حضرت مجددؒ اولیاء اللہ کے کملات اور تصرفات کے متعلق لکھتے ہیں کہ کامل انسان کا معاملہ اللہ تعالیٰ اس حد تک پہنچا دیتے ہیں کہ بحکم خلافت اس کو تمام اشیاء کا قیوم بنا دیتے ہیں اور پوری مخلوق کو وجود و بقا کے تمام کملاتِ ظاہری و باطنی اور متعلقہ فیوض و برکات اسی کے واسطے سے پہنچاتے ہیں۔ فرشتے اور جن اسی سے منسلک ہیں اور انسان و جن اسی کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔

درج بالا دفتر (ص ۱۲۱۱) میں حضرت مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ مرید رشید اور مستعد طالب ہر وقت طریق سلوک میں پیر کی کرامات اور خوارق کا احساس کرتا ہے اور غیبی معاملہ میں ہر

وقت اس کی مدد چاہتا ہے............ مرید پیر کی کرامات کا احساس کیوں نہ کرے کہ پیر نے اس کے مردہ دل کو زندہ کر دیا ہے۔

۶۔ ارواح وہ کام کرتی ہیں جو جسموں سے وقوع میں آتے ہیں

مکتوب نمبر ۲۸۲ دفتر اول حصہ پنجم صفحہ ۷۵۳ پر فرماتے ہیں کہ ایک دن ہمارے ذکر کی مجلس میں حضرت الیاس علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام روحانیوں کی صورت میں حاضر ہوئے اور روحانی ملاقات میں انہوں نے فرمایا کہ ہم عالم ارواح میں سے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہماری ارواح کو ایسی قدرت کاملہ عطا کر رکھی ہے کہ اجسام کی شکل میں متمثل ہو کر وہ کام کریں جو جسموں سے وقوع میں آتے ہیں یعنی جسمانی حرکات۔ و۔ سکنات۔ جسدی طاعات۔ و۔ عبادات ہماری ارواح سے صادر ہوتی ہیں (آپ کا یہ کلام طویل ہے)

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مجمع البحرین (جہاں دو سمندر ملتے ہیں) پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تلی ہوئی مچھلی کا زندہ ہونے کا ذکر تو قرآن کریم میں بھی آ چکا ہے۔ (دیکھئے الکھف آیت ۶۰) لہٰذا ان بزرگوں کی کرامات پر شک کرنا بالکل فضول اور بے جا بات ہے۔ ان کے پاس رکھی جانے والی مچھلی کا یہ حال ہو تو پھر کونسی بات ہے جس پر تعجب اور انکار کی گنجائش ہے۔

۷۔ روحوں کا پیدائش سے پہلے مدد کرنا

مکتوب نمبر ۲۸ دفتر دوم حصہ اول میں حضرت مجدد علیہ الرحمتہ حضرت محمد صادق کشمیری ؒ کو لکھتے ہیں کہ رشحات میں بابا آبریز ؒ کے متعلق یہ ذکر آیا ہے کہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ جب حق سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں حضرت آدم ؑ کی مٹی گوندھی جا رہی تھی تو میں اس میں پانی ڈال رہا تھا۔ حضرت مجدد علیہ الرحمتہ نے فرمایا کہ یہ بات درست ہو سکتی ہے کیونکہ جب ملائکہ کو اس کام میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی تو اس بزرگ کی روح کو بھی اجازت دی جا سکتی ہے اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی جسمانی پیدائش کے بعد بابا آبریز کو اس کی خبر دی گئی ہو۔ (کچھ بزرگ ایسے بھی ہیں جن کے کانوں میں ابھی تک " "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" " کے الفاظ سنائی دیتے ہیں۔)

حضرت مجدد الف ثانی ؒ فرماتے ہیں کہ یہ جائز ہے کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ ارواح مجردہ کو ایسی قدرت عطا کرے کہ ان سے افعال اجسام صادر ہوں۔ بعض اکابرین نے اپنے ان افعال شاقہ سے آگاہ کیا ہے جو ان سے ان کے وجود عنصری میں آنے سے زمانہ ہائے دراز پہلے صادر ہوئے۔ حضرت مجدد الف ثانی ؒ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ پہلی امتوں کے اولیاء، حضرت علی ؓ کے وجود عنصری میں تشریف لانے سے پہلے، ان کی روحانیت سے تربیت پا کر ولایت کے مقام پر فائز

ہوتے رہے۔ مکتوب نمبر ۱۲۳، دفتر سوم، حصہ دوم صفحہ ۱۶۲۵ پر لکھتے ہیں کہ جو راستے اللہ تک پہنچانے والے ہیں وہ دو ہیں جن میں سے ایک راستہ قرب ولایت سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے پیشوا حضرت علیؓ ہیں اور حضرت فاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ اس مقام میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت علیؓ اپنی جسدی پیدائش سے پہلے اس مقام کے ملجا و ماویٰ تھے جیسا کہ آپ جسدی پیدائش کے بعد ہیں اور جس کو بھی فیض و ہدایت پہنچی اسی راہ سے پہنچی اور وہ ان کے ہی ذریعے سے پہنچی کیونکہ وہ اس راہ کے آخری نقطہ کے نزدیک ہیں اور اس مقام کا مرکز ان سے تعلق رکھتا ہے (اس کے بعد آپ نے اور بھی کلام کیا ہے جو انشاء اللہ ہماری کسی دوسری کتاب میں آئے گا)۔ (اللہ تک پہنچنے کے پہلے راستے کی تفصیل اور دوسرے راستے کے متعلق معلومات درج بالا مکتوب سے ہی مطالعہ فرمائیں کیونکہ یہ بیان کافی طویل ہے اور اگر یہ معاملہ سمجھ میں نہ آئے تو کسی بزرگ عالم سے دریافت فرمائیں)۔

۸۔ شیخ کا کرتہ بطور تبرک پاس رکھنے سے نتائج بر آمد ہوتے ہیں

حضرت مجدد الف ثانیؒ مکتوب نمبر ۱۹۰ دفتر اول حصہ سوم (ص ۴۲۸) میں ذکر کا طریقہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر بوقت ذکر الٰہی (چشم تصور میں) بے تکلف پیر کی صورت ظاہر ہو تو اسے بھی دل میں بٹھا کر ذکر کرے۔ تم جانتے ہو کہ پیر کیسی ہستی ہے۔ پیر وہ ذات ہے کہ جس سے تم جنابِ قدس خداوندی جل شانہ تک پہنچنے کے راستے میں استفادہ کرتے ہو اور اس راہ میں طرح طرح کی مدد اور اعانت حاصل کرتے ہو۔ خالی کلاہ، چادر اور شجرہ جو مروج ہو چکا ہے، پیری مریدی کی حقیقت سے خارج ہے اور عادات اور رسوم میں داخل ہے۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ شیخ کامل مکمل کا کرتہ بطور تبرک اپنے پاس رکھے اور اس کے ساتھ اعتقاد اور اخلاص کے ساتھ زندگی گزارے۔ شیخ کے کرتے کو پاس رکھنے سے ثمرات اور نتائج کا قوی احتمال ہے۔ (یاد رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنا چوغہ مبارک حضرت اویس قرنیؓ کے لئے ارسال کیا تھا جو اب تک سلسلہ نقشبندیہ کے پیر خان صاحب مرحوم کے آستانہ عالیہ موہڑہ شریف میں محفوظ ہے۔)

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مذکورہ بالا بیان سے تین باتوں کا علم ہوتا ہے۔ اولاً یہ کہ آپ تصورِ شیخ کے قائل ہیں، لیکن کچھ حضرات کو اس میں بھی شرک کی بو آتی ہے اور دوسرے یہ کہ آپ پیر و مرشد سے مدد اور اعانت کے قائل اور معتقد ہیں اور تیسرے یہ کہ آپ اولیائے کرام کے تبرکات کو پاس رکھنے کے قائل ہیں اور اس اعتقاد کو شرک یا بدعت قرار نہیں دیتے۔ تبرکات کا مختصر ذکر نیچے کیا جا رہا ہے۔

۹۔ سیرِ انفسی اور آفاقی میں آگاہی کا حاصل ہونا

مکتوبات میں متعدد بار حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے انفس و آفاق کی سیر کا ذکر کیا ہے اور عالم ملکوت اور اس سے اوپر کے عوالم کے مشاہدات کی تفصیل درج کی ہے۔ حضرت بہاؤالدین نقشبند ؒ نے فرمایا ہے کہ ہم نے مسلسل چالیس سال سے آئینہ داری کی ہے اور ہمارے آئینے نے کبھی غلطی نہیں کی۔ حضرت داتا گنج بخش ؒ اور دیگر مشائخ کا قول ہے کہ اولیائے کرام کے سامنے تمام کائنات ایسے ہوتی ہے جیسے کوئی اپنی ہتھیلی پر تل دیکھ لیتا ہے اور قطب مدار تمام دنیا کی سیر ایک رات میں کر لیتا ہے اور جس کو چاہے دکھا بھی سکتا ہے۔

۱۰۔ تصوّرِ شیخ سے روگردانی تباہی کا سبب ہے

حضرت مجدّد الف ثانی مکتوب نمبر ۳۰، دفتر دوم، حصہ اول میں تصور شیخ کے شغل کو نہ صرف جائز بلکہ طالبان حق کے لئے نہایت ضروری قرار دیتے ہیں۔ (اس کی تفصیل اسی کتاب میں "مشائخ کے اقوال اور احوال" کے عنوان سے بیان کر دی گئی ہے۔) آپ اس بیان کے بعد لکھتے ہیں کہ سالک کو چاہئے کہ اپنے مرشد کے رابطے کو سعادت کا ذریعہ جانے، نہ کہ اس بدنصیب گروہ میں شامل ہو جو اپنے آپ کو تصوّر شیخ سے بے نیاز جانتا ہے اور اپنے قبلہ توجہ کو اپنے شیخ سے پھیر لیتا ہے اور اپنے معاملے کو خراب اور تباہ کر لیتا ہے۔ آپ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مرید کا رابطہ قائم ہو تو اولیائے کرام حیات میں اور وصال کے بعد بھی مدد فرماتے ہیں اور ان سے روگرانی کرنے والے کے روحانی احوال تباہ ہو جاتے ہیں۔

(ب) حضرت داتا گنج بخش ؒ کا طریقہ و عقیدہ

حضرت داتا گنج بخش ؒ علی ہجویری ؒ نے بھی اللہ رب العزت کے مقرب اولیائے عظام کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنی مشکلات میں استمداد اور ان کی ارواح مقدسہ سے فیوضات و برکات کا حاصل کرنا جائز قرار دیا ہے، بلکہ آپ نے تو اپنی کتاب کشف المحجوب میں ایسے لاتعداد واقعات درج کئے ہیں جن سے حضرت بایزید بسطامی ؒ، شیخ ابو سعید ؒ، حضرت ابو العباس مہدی ؒ سیاری جیسے بلند پایہ اولیائے کرام کے علاوہ دیگر متعدد صلحائے عظام کے مزاروں پر آپ کا اور دوسرے اولیائے کرام کا مجاورت کرنا ثابت ہوتا ہے۔ آپ ان مقربین خدا کے مزارات مقدسہ پر اس وقت تک مجاورت کرتے جب تک ان کا روحانی واقعہ حل نہ ہو جاتا۔ آپ نے خصوصی طور پر حضرت ابو العباس مہدی ؒ کے متعلق فرمایا ہے کہ "مرو کے شہر میں ان کا یہ اثر ہے کہ لوگ اپنی حاجت روائی کے لئے ان کی قبر پر جاتے

ہیں اور بامراد واپس آتے ہیں۔ آپ حصولِ مقاصد کے لئے اہل اللہ کی قبر پر جانا مجرب فرماتے ہیں۔ لہٰذا حضرت علی ہجویری۔" اور دیگر بزرگان دین کے عمل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ اس دنیائے فانی سے انتقال کر جانے والے اولیائے کرام بقائے دائمی حاصل کر لیتے ہیں اور ان کی ارواح سے استمداد و استعانت عین حق ہے جس کا انکار آفتاب ضوفشاں کا کھلا انکار ہے اور بزرگوں کے ایسے تصرفات سے انکار کو عقل سلیم ہر گز تسلیم نہیں کرتی۔

(ج) اولیائے کرام کا مزاروں پر چلّہ کشی کرنا

حضرت معین الدین چشتی اجمیری۔" اور بابا فریدالدین گنج شکر" کے علاوہ سینکڑوں ایسے بزرگ ہو گزرے ہیں جنہوں نے کامل اولیائے کرام کے مزاروں پر چلہ کشی کی اور ان سے فیوضات حاصل کئے۔ مذکور بالا دونوں عظیم بزرگوں کا حضرت داتا گنج بخش" کے مزار پر چلہ کش ہونے کے حجرے ابھی تک موجود ہیں اور تاریخ اس پر شاہد ہے۔

(د) حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جسد مبارک کے ساتھ زندہ ہیں اور اب بھی امور دنیا پر ان کی کچہری لگتی ہے

مدارجِ نبوت، حصہ اول، صفحہ ۲۵۸ پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی" لکھتے ہیں کہ صحیح روایات کے مطابق اس بات پر تمام امت کا اجماع ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یقیناً موت کا ذائقہ چکھا اور اس دنیا سے رحلت فرما گئے لیکن بعدازاں حق تعالیٰ نے آپ کو زندہ فرما دیا (یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کو عالم بالا میں لے جایا گیا تو ان کی شایان شان کوئی جگہ نظر نہ آئی اور آخر یہی فیصلہ کیا گیا کہ آپ کی روح مبارک کو ان کے جسد اقدس میں ہی لوٹا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا) حضرت عبدالحق" محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں خدا کے نزدیک اس سے زیادہ مکرم ہوں کہ وہ قبر میں مجھے چالیس دن سے زیادہ رکھے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے، لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حیات جسمانی اور بدنی کے ساتھ زندہ ہیں جو آپ رکھتے تھے۔ یہ حیات شہداء کی حیات سے زیادہ کامل ہے، کیونکہ شہداء کی حیات روحانی اور اخروی ہے اور یہ روح کے لئے ثابت ہے اور حق تعالیٰ قادر ہے کہ ان کی روحوں کے لئے اجسام مثالیہ اس عالم میں پیدا فرمائے یا ان ہی اجسام میں رکھے جو ان کے لئے ظروف کا حکم رکھتے ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ مسلمانوں کی روحیں سبز پرندوں کے جوف میں ہیں جو عرش کے نیچے قندیلوں کے نیچے آسائش پاتے ہیں یا جنت میں رہتی ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام کی ارواح مقدسہ ان کے انہیں ابدان طیبہ میں لوٹا دی جاتی ہیں جو وہ دنیا میں رکھتے تھے۔ ان کے اجسام و ابدان نہ بوسیدہ ہوتے

ہیں اور نہ خاک بنتے ہیں اور حق تعالیٰ قادر ہے کہ ارواح کو بغیر بدنوں کے محفوظ رکھے، لیکن ان کے لئے بدنوں میں وجود رکھنے پر نقل وارد ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبر میں نماز پڑھنا جیتے بدن کا تقاضا رکھتا ہے۔ وہ صفات جو انبیاء علیہم السلام کے بارے میں شب معراج میں منقول ہیں وہ صفات اجسام کی ہیں، ان سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حیات حقیقی ہو جو وہ دنیا میں رکھتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ برزخ میں ان کے کھانے پینے کے احکام کچھ اور ہوں۔ ممکن ہے کہ وہاں خوراک روحانی ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا تھا هُوَ يُطْعِمُنِىْ وَيَسْقِيْنِي (کہ اللہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے)۔

جہاں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امور دنیا میں فیصلے صادر فرمانے کا تعلق ہے، اس کے متعلق زیادہ تفصیل اس جگہ شامل کرنا ممکن نہیں البتہ حضرت عبدالعزیز دباغ کی لکھوائی گئی کتاب "خزینۂ معارف" میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ شائقین حضرات اس سے رجوع فرمائیں۔ اس کے علاوہ سیرت اور تصوف کی بہت سی کتابوں میں بھی اس حقیقت کا ذکر کیا گیا ہے بلکہ جو لوگ روحانی دنیا میں قدم رکھتے ہیں وہ خود ایسی مجلسوں کا ملاحظہ کر چکے ہیں۔

(ح) استمداد از رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد از وصال (چند اولیائے کرام کے اقوال)

بعد از وصال، حضور علیہ السلام کا چشمۂ فیض اسی طرح جاری ہے جس طرح حیاتِ ظاہری میں تھا۔ اس سلسلے میں لاکھوں روایات موجود ہیں لیکن چند مشہور روایات کے نمونے اس جگہ پیش کئے جائیں گے۔ عبدالعزیز دباغؒ اور دیگر اولیائے کرام نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کچہری اب بھی لگتی ہے جس میں دنیا کے اہم امور کے متعلق فیصلے کئے جاتے ہیں اور دنیا کے غوث اور قطب ان کے فیصلوں پر عمل در آمد کرواتے ہیں۔ (ابریز)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ایسے لاتعداد واقعات مستند کتابوں میں ملتے ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حالتِ بیداری میں دیکھنا وارد ہوا ہے اور آپ کا کچھ لوگوں کی مدد فرمانا بغیر کسی شک وشبہ کے ثابت ہو چکا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد ستر سے زیادہ شمار کی جا چکی ہے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف بحالتِ بیداری حاصل کیا ہے۔ جناب عبدالمجید صدیقی نے ایک مکمل کتاب "زیارت النبی بحالتِ بیداری" بھی تحریر فرما کر لوگوں کے شکوک کو دور کیا ہے۔ جب حضور علیہ السلام کے ساتھ امتی کا تعلق مضبوط ہو جائے اور امتی ہمہ وقت یاد حبیب میں مستغرق رہے تو بارگاہ نبوی سے بھی جواب آتا ہے اور انوار محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی باران بھی ان پر رم جھم برسنے لگتی ہے۔ اس موضوع پر درج ذیل سطور میں شامل کیے گئے اولیائے کرام کے بیانات قابل توجہ ہیں:-

۱۔ امام عبدالوہّاب قطب شعرانی ؒ

فرماتے ہیں کہ سالک ادب اور تدبر معانی کے ساتھ اس قدر درود شریف پڑھے کہ رذائل سے پاک ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے کا مقام حاصل کر لے۔ شیخ نور الدین شونی، شیخ احمد زواوی، شیخ محمد بن داؤد منزلاوی رَحْمَۃُ اللہِ عَلَیْھِمْ اَجْمَعِیْنَ اور مشائخ یمن کا یہی طریقہ ہے۔ شیخ احمد زواوی ؒ فرماتے ہیں کہ جب حالت بیداری میں مجھے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب نہ ہوئی تو ایک سال تک میں نے شب و روز میں پچاس ہزار مرتبہ دورد شریف کا ورد اپنے وظائف میں شامل کیا تو کامیاب ہوا۔

۲۔ سیدی علی خواص ؒ

حضرت علی خواص ؒ کا قول ہے کہ بندہ اس وقت تک عارف کامل نہیں ہوتا یہاں تک کہ جس وقت چاہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہ کر لے اور فرماتے ہیں کہ سلف میں جن مشائخ کی نسبت ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ وہ عالم بیداری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بالمشافہ ملاقات کرتے تھے، ان کی تعداد کافی ہے، مثلاً شیخ ابوالحسن شاذلی، شیخ ابو مدین، عبدالرحیم قناوی، موسیٰ ازولی، حضرت ابو العباس مرسی، ابو مسعود، ابراہیم متبولی رَحِمَھُمُ اللہُ عَلَیْھِمْ اَجْمَعِیْنَ

۳۔ شیخ جلال الدین سیوطی ؒ

حضرت جلال الدین سیوطی ؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر بار سے زیادہ حالت بیداری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے۔ ابراہیم متبولی ؒ کی ملاقاتوں کا تو کچھ شمار ہی نہیں کیونکہ وہ اپنے تمام احوال میں مشرف بہ زیارت ہوتے تھے۔ فرماتے تھے کہ سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میرا کوئی شیخ نہیں۔ لوامع الانوار القدسیہ میں یہ سب کچھ درج ہے۔ حضرت ابو العباس مرسی ؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے ایک ساعت کے لئے پوشیدہ رہیں تو میں اس لمحے کے لئے اپنے آپ کو مومنوں میں شمار نہیں کرتا (لَوْحَجَبَ عَنِّیْ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طُرْفَۃَ عَیْنٍ مَا عَدَدْتُ مِن جُمْلَۃِ الْمُسْلِمِیْنَ)

۴۔ حضرت شرف الدّین بُوصیری ؒ

حسان وقت حضرت شرف الدّین بُوصیری ؒ نے یوں تو بے شمار قصائد لکھے مگر محبت و عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مستغرق ہو کر لکھے گئے "قصیدہ بردہ شریف" نے بارگاہ

نبوت میں وہ مقبولیت حاصل کی جس پر عشاق رشک کرتے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک دن اچانک آپ کو فالج کا عارضہ لاحق ہوا اور اسی رات انہوں نے ایک اور قصیدہ لکھا۔ آپ نے خواب میں یہ قصیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سنایا تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ قصیدہ سن کر مسرت میں اس طرح جھوم رہے تھے جیسے پھلدار درخت کی شاخیں ہوا میں جھومتی ہیں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر مبارک (بردہ شریف) کو ان پر ڈالا تو حضرت بوصیری ؒ کا فالج بالکل درست ہو گیا۔ صبح کو جب آپ اٹھے تو بازار کی طرف گئے اور بازار میں آپ کو ایک درویش ملا جس نے وہ قصیدہ آپ سے طلب کیا اور خواب کا پورا واقعہ بھی سنایا۔ حضرت بوصیری ؒ نے جب پوچھا کہ آپ کونسا قصیدہ طلب کرنا چاہتے ہیں تو اس درویش نے اس قصیدے کا پہلا شعر بھی پڑھ کر سنایا حالانکہ آپ نے اس قصیدے کو گزشتہ رات میں لکھا تھا اور ابھی تک یہ قصیدہ کسی کے علم میں نہیں لایا گیا تھا۔ یہ واقعہ اس قدر مستند ہے کہ کسی کو اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس قصیدہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امداد بعد از وصال میں شامل کیا جاتا ہے۔ اب بھی اس قصیدہ شریف سے مختلف بیماریوں کی شفایابی کے لئے برکات حاصل کی جاتی ہیں۔

۵۔ حضرت خواجہ علامہ علاؤالدین صدیقی غزنوی مدظلہ

حضرت خواجہ علامہ علاؤالدین صدیقی غزنوی مدظلہ (جن سے راقم الحروف کو بیعت کا شرف حاصل ہے) کا ایک واقعہ شرف الدین بوصیری ؒ کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے زمانہ حاضر کی ایک روشن مثال ہے۔ ہمارے خواجہ صاحب کو ۱۹۹۳ء میں دل کا شدید حملہ ہوا اور بہت دیر تک اسلام آباد کے آرمی کارڈیک سنٹر میں زیر علاج رہے۔ آخر کار آپ کو "بائی پاس" کے لئے انگلستان جانا پڑا اور وہاں کافی طویل معائنہ کے بعد بائی پاس آپریشن کرنے کا فیصلہ ہوا۔ انگلستان کے ماہرین قلب نے آپ کے اپریشن کی تاریخ کا تعین کر دیا اور آپ کے لئے ایک کمرہ بھی مخصوص کر لیا گیا۔ اچانک آپ کے دل میں عمرہ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اور آپ اس غرض سے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ وہاں شدید تکلیف کے باعث دو دن کے لئے پھر ہسپتال میں داخل رہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ آپ کے ساتھی ان کو "وہیل چیئر" پر طواف کے لئے لے جایا کرتے تھے۔ ایک رات آپ کو خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدینے شریف آجاؤ! وہاں آپ کا علاج کیا جائے گا، چنانچہ خواب میں ہی آپ مدینہ شریف حاضر ہو گئے اور روضۂ اقدس کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں بیٹھ گئے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک جگہ اپنے مزارِ مبارک میں ہی مسند آرا پایا۔ فرماتے ہیں کہ اس وقت روضۂ مبارک کی دیواریں موجود نہ تھیں۔ آپ کا جسم مبارک اس قدر ضوفشاں تھا کہ آپ کی صورت نظر نہ آ رہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی طرف نظر شفقت فرمائی۔ اس کے بعد جب آپ بیدار ہوئے تو بالکل تندرست تھے اور بغیر کرسی کے طواف کے لئے پاپیادہ چلے گئے۔

جب واپس انگلستان پہنچے تو ڈاکٹروں نے معائنہ کیا اور کہا کہ اپریشن کی ضرورت نہیں ہے اور ماشاء اللہ اب آپ عارضہ قلب سے بالکل خلاصی پا چکے ہیں۔ یہ واقعہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ آپ کے لاکھوں متعلقین نے اس بات کا مشاہدہ کیا ہے۔ درج بالا تفصیل کا علم راقم الحروف کو ان کی زبان سے ہوا۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحؒ کی تربیت

حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحؒ، سیدالاولیا والعارفین، نے براہ راست بارگاہ نبوی میں ہی طریقت و معرفت کی تربیت پائی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے ایک عظیم الشان اجتماع میں فرمایا قَدَمِیْ ھٰذِہٖ عَلٰی رَقَبَۃِ کُلِّ وَلِیِّ اللّٰہِ (میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے اور میری گردن پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک ہے)

"مشاہدۂ حق" میں کپتان واحد بخش سیال فرماتے ہیں کہ تاریخ شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحؒ کی تربیت خود فرمائی تھی لیکن آگے سلسلہ چلانے کے لئے آپ نے فرمایا کہ آپ کو ایک ظاہری شیخ کی بھی ضرورت ہے اور جا کر فلاں شیخ سے بیعت کر لو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی اپنی امت کے لوگوں کے حالات اپنی آنکھوں سے معلوم کر کے ان کی اعانت فرماتے ہیں اور اسی فیض نبوّت سے باقی اہل مزار بھی حاجتمندوں اور سائلین کی مدد کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کو نائب نبی ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ اہل مزار سے روحانی فیض حاصل کرنے کا نام اویسی نسبت ہے۔ حضور علیہ السلام کے ورثاء اور خلفاء نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح باطنی توجہ سے اپنے مریدین کا تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن کرتے ہیں اور باطنی توجہ سے ہی مریدین کے قلوب، انوار الٰہی سے منور کرتے ہیں۔

۷۔ احادیث مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت استمداد

احادیث مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم میں وارد ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج پر تشریف لے جا رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر مبارک میں نماز پڑھتے دیکھا اور اس پر حضرت عبدالحق محدث دہلوی رحؒ فرماتے ہیں کہ آپ کا نماز پڑھنا جیتے بدن کا تقاضا کرتا ہے۔ روایات میں وارد ہے کہ معراج کی واپسی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کی صحت کے متعلق دریافت کیا کہ جس میں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باعمل علماء کا بنی اسرائیل کے انبیاء کے ہم نشین ہونے کا ذکر ہے، تو اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام غزالی رحؒ کی روح کو طلب فرمایا اور آپ سے گفتگو کرنے کو کہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے امام غزالی رحؒ سے ان کا نام دریافت فرمایا تو امام صاحب نے اپنے نام کے علاوہ

اپنے بہت سے آباء. واجداد کے نام بھی بیان کر دیئے چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے تو صرف تمہارا نام پوچھا تھا لیکن تم نے اپنے کلام کو خواہ مخواہ اس قدر طول دے دیا۔ امام صاحب نے فرمایا "یا حضرت آپ سے بھی تو اللہ نے یہی پوچھا تھا کہ آپ کے دائیں ہاتھ میں کیا ہے، تو آپ نے اس کا جواب اس قدر طویل کیوں دیا تھا کہ یہ میرا عصا ہے اس پر میں ٹیک لگاتا ہوں، اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں اور اس سے میرے اور بھی بہت سے کام نکلتے ہیں وغیرہ (آپ نے اپنے جواب کو جس خاص مقصد کے لئے طویل فرمایا تھا وہ یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ گفتگو کا دورانیہ طویل ہو جائے کیونکہ ہر عاشق اپنے محبوب سے گفتگو کو طویل کرنا چاہتا ہے۔) اس جواب پر موسیٰ علیہ السلام کے چہرے پر جلال طاری ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی روح کو اس جگہ سے غائب فرما دیا تاکہ موسیٰ علیہ السلام سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ کہتے ہیں کہ امام غزالی ؒ پر موسیٰ ؑ کی اس پُر جلال نگاہ کا ہی اثر تھا کہ حضرت امام غزالی لنگڑے تھے۔ (یہ روایت معراج کے واقعات میں ملتی ہے۔ علامہ سید احمد سعید کاظمی ؒ کے مقالات کاظمی ص ۱۸۷، جلد اول، بحوالہ شمائم امدادیہ و محاضرات امام راغب میں اس واقعہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔)

روح کی کرشمہ سازیاں

احادیث میں منقول ہے کہ روح جب چاہے جہاں چاہے پہنچ سکتی ہے۔ بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ جب روح چاہے تو یہ اعلیٰ علّیین سے اپنی قبر تک (جو پچاس ہزار سال کی مسافت ہے) ایک لمحہ میں پہنچ سکتی ہے۔ پہلے زمانے کے لوگ اس قدر تیز رفتار کے حاصل ہونے کے امکان میں تذبذب کا شکار تھے لیکن اب آئن سٹائن نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر ہم روشنی کی رفتار سے زیادہ رفتار حاصل کر کے زمین کے گرد چکر لگانے کے لئے چلیں تو ہم اس کے احاط میں شامل ۲۵۰۰۰ میل کی مسافت کو طے کر کے اپنی جگہ سے چلنے سے پہلے ہی واپس آ سکتے ہیں (یہ اس لئے ممکن ہے کہ اس صورت میں وقت یعنی "T" منفی کی حیثیت "T" - (منفی "T") ہو جائے گی اور ریاضی کے فارمولے سے یہ "T" - کا حاصل کرنا ممکن ہے۔ یاد رہے کہ روح کی رفتار روشنی کی رفتار سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اس بات سے روح کے کمالات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بہت سی مستند روایات میں سے ایک روایت زبان زد خاص. و عام ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ شریف کے خطبہ میں اپنے جرنیل ساریہ ؓ کو آواز دی (يَا سَارِيَةُ الْجَبَلَ) ، یعنی "اے ساریہ پہاڑی کی طرف دیکھو" اس سے آپ کی مراد یہ تھی کہ دشمن کی فوج حملے کے لئے پہاڑ کے پیچھے آ رہی ہے اور حضرت ساریہ ؓ نے یہ آواز سنی اور پیچھے دیکھا تو دشمن کا قلع قمع کیا۔ لوگوں نے اس آواز کی تصدیق کی اور یہ واقعہ بزرگوں کی امداد کی مستند اور جیتی جاگتی مثال ہے۔

یہ قول بھی بہت مشہور ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ نے فرمایا تھا کہ میرا یہ قدم تمام ولیوں کی گردنوں پر ہے لیکن ایک شخص نے آپ کی اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو آپ نے اس کی ولایت بھی سلب کر لی اور فرمایا کہ اگر تمہاری گردن پر میرا قدم نہیں تو جاؤ تمہاری گردن پر سور کا قدم ہو گا۔ چنانچہ وہ شخص ایک یہودیہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا اور اس کو بیاہنے کے لئے یہودی مذہب قبول کرنے کو بھی تیار ہو گیا۔ شرائط کے مطابق کئی سالوں تک وہ شخص اس یہودی کے سؤروں کو چرانے کے لئے جنگل میں لے جاتا اور نومولود بچوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے آتا رہا۔ اس طرح حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا وہ قول (کہ تیری گردن پر سؤر کا قدم ہو گا) درست ثابت ہوا۔ آخر وہ دن بھی آگیا کہ جس دن اس نے یہودی مذہب کو قبول کرنا تھا تو حضرت نے فرمایا "لو آج وہ بدبخت دین سے بھی خارج ہونے لگا ہے" (راقم الحروف کا خیال ہے کہ جو لوگ بزرگوں سے انحراف کرتے ہیں وہ یا تو بے نمازی اور بد عقیدہ ہو جاتے ہیں یا فیوض الٰہی سے دور اور یکسر محروم ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ شدت سے انکار کرنے والے تو اسلام سے بھی منحرف ہو جاتے ہیں یا پھر سزا کے طور پر ان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔) چنانچہ لوگوں کے اصرار پر جب آپ نے دوران وضو ہی ایک چلو پانی کا چھینٹا اس کی طرف پھینکا تو اسی وقت اس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہاں سے بھاگا۔ حضرت داتا گنج بخش ؒ نے بھی ایسا ہی ایک اور واقعہ کشف المحجوب میں نقل فرمایا ہے۔ آپ نے اسی کتاب میں حضرت جنید بغدادی ؒ کے ایک مرید کا واقعہ بھی نقل فرمایا ہے کہ وہ خود کو اپنے شیخ سے بڑا سمجھنے لگا تو حضرت نے اسے ولایت سے معزول فرما دیا اور اس کا رنگ بھی سیاہ ہو گیا۔ جب اس نے توبہ کی تو اسے معاف فرما دیا اور وہ اپنی سابقہ حالت پر آگیا۔

مفتی غلام سرور ؒ نے خزینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ رات کو جب شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ ایک خاص وقت پر اطراف میں توجہ فرماتے تو روئے زمین پر تمام جنات تھر تھر کانپنے لگتے تھے کہ کہیں وہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ حضرت نجم الدین کبریٰ ؒ کا یہ واقعہ بہت سی مستند کتابوں میں آیا ہے کہ ان کا ایک مرید نزع کی حالت میں تھا اور شیطان اس کا ایمان ضائع کرنے کے درپے تھا۔ وہ آپ سے خدا کے موجود ہونے کے دلائل طلب کر رہا تھا اور وہ جو بھی دلیل پیش کرتا شیطان اس کو رد کر دیتا۔ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ ؒ نے سینکڑوں میل سے مرید پر توجہ فرمائی اور اسے فرمایا! "تو شیطان سے یہ کیوں نہیں کہہ دیتا کہ میں خدا کو بغیر دلیل کے مانتا ہوں" اس بات پر ابلیس دم دبا کر بھاگ گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زلیخا نے گھیر رکھا تھا تو انہوں نے اللہ کی برہان دیکھی کہ ان کے والد سینکڑوں میلوں سے انگلی کے اشارے سے فرما رہے تھے "خبردار! یاد رکھو تم انبیاء کی اولاد میں سے ہو" یہ دیکھ کر یوسف علیہ السلام اس کمرے سے فوراً باہر نکل آئے (جس کا ذکر سورہ یوسف آیت ۲۴ میں ہے، فرمایا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (یعنی آپ اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے تو شاید زلیخا کا ارادہ کر لیتے) یہ تمام واقعات انبیاء اور اولیائے کرام کو عطا کردہ ان تصرفات کا ثبوت ہیں جن سے بعض

حضرات تعصبانہ طور پر انکار کرتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ خدا کو بڑا ظاہر کرنے کی غرض سے خدا کے بندوں کو نیچے کیوں گھسیٹنا چاہتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا کے بندوں کی شان کو بیان کیا جائے تو اس سے خدا کی شان بہت زیادہ بلند ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ سوچنا چاہئے کہ اولیاء کی شان ایسی بلند ہے تو خدا کی شان کتنی بلند ہوگی!

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات میں ہے کہ ایک دن حضرت معین الدین چشتیؒ نے دیکھا کہ قبرستان میں فرشتے حضرت عثمان ہارونیؒ کے ایک مرید کو عذاب قبر میں مبتلا کر رہے ہیں۔ اتنے میں حضرت عثمان ہارونیؒ کی روح وہاں پہنچ گئی اور فرشتوں کو عذاب دینے سے منع فرمایا۔ فرشتوں نے کہا کہ اس کو اس لئے عذاب دیا جا رہا ہے کہ اس کے اعمال آپ کے ارشاد کے مطابق نہ تھے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ ٹھیک ہے لیکن اس شخص نے اپنا ہاتھ اس فقیر کے ہاتھ میں دیا ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک ندا آئی کہ اس شخص کو ہم نے اس کے پیر کے طفیل بخش دیا۔ حضرت ابو القاسم قشیریؒ اور ابو السعید ابو الخیرؒ کا بھی ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ آپ سلطان طغرل کے ایک وزیر کی قبر پر اس نیت سے کھڑے تھے کہ منکر نکیر کے سوالات کے دوران انہیں مواخذہ نہ کیا جائے، چنانچہ منکر نکیر جب حاضر ہوئے تو حضرت ابو السعیدؒ کو دیکھتے ہی قبر سے واپس چلے گئے (یہ واقعہ ایک مستند کتاب مقامات صوفیہ میں بہت تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے)۔ بعض صحابہ کبار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات کو اپنی قبروں میں دفن کیا ہے جس سے ان کی امداد کا قبر میں ملنا ثابت ہوتا ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے بہت سے تبرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ قبر میں دفن کرنے کی وصیت کی، جس کا ذکر بہت سی سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اولیاء کے تبرکات بھی امداد کرتے ہیں۔

بزرگوں کے روحانی تصرفات

احادیث میں ہے کہ اگر کوئی جنگل میں راستہ بھول جائے تو اس کو چاہئے کہ پکارے "اَعِیْنُوْنِیْ یَا عِبَادَ اللّٰہِ" (اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو۔) مستند روایات میں ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام اور الیاس علیہ السلام اس بات پر مامور ہیں کہ بھولے بھٹکے راہیوں کو راستہ بتائیں۔ شیخ مجد الدین صحیح اسناد سے نقل کرتے ہیں کہ ابو المظفر محمد بن عبداللہ خیام سمرقندیؒ نے فرمایا کہ ایک دن مغارہ کعب میں وہ راستہ بھول گئے تو حضرت خضر علیہ السلام اور الیاس علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم دونوں پر اپنی رحمت نازل فرمائے! کیا تم دونوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں! میں نے کہا کہ پھر مجھے وہ باتیں سنائیں جو آپ نے ان سے سنی ہیں تاکہ میں آپ کی سند سے ان باتوں کو بیان کر سکوں۔ اس پر انہوں نے درود شریف کی فضیلت سے متعلق جو بیان کیا اس کو انشاء اللہ کسی کتاب میں درود کے فضائل کے باب میں شامل کیا جائے گا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کچھ لوگوں کی مدد فرمائی جس کا ذکر سورۂ کہف کی آیت ۶۰ سے ۸۲

میں ملتا ہے۔ اگر اس مدد کا ذکر قرآن میں نہ ہوتا تو لوگ شاید سرے سے ہی اولیاء کی مدد کے اس نظام کا بھی انکار کر دیتے۔

"تذکرہ اولیائے نقشبند" از علامہ نور بخش توکلی" میں (اور دیگر تذکروں میں بھی) ہے کہ حضرت بہاؤالدین نقشبند" پہلے پہل جلاد تھے۔ ایک موقع پر وہ ایک شخص کو قتل کرنے پر تین بار ناکام ہوئے تو آپ نے اس شخص سے پوچھا کہ تم کیا کلمہ پڑھ رہے تھے کہ تلوار تم پر اثر نہیں کر رہی تھی؟ اس نے جواب دیا کہ میں اپنے پیر کا نام لے رہا تھا۔ پوچھا کون ہے تمہارا پیر؟ اس نے کہا سید امیر کلال"! آپ نے تلوار کو وہیں پھینکا اور یہ کہہ کر ان سے بیعت کے لئے چلے گئے کہ جو تلوار کی زد سے بچا سکتا ہے تو وہ یقیناً جہنم کی آگ سے بھی بچا سکتا ہے۔ اس کے بعد ان کا نام سلسلہ نقشبندیہ کے اکابرین میں لیا جانے لگا اور آپ معروف صاحب تصرف بزرگ ہو گزرے ہیں۔ بالکل اسی نوعیت کا ایک واقعہ حضرت ابو یوسف درّانی" اور قازان (جو تاتاری خاندان کے رکن تھے) سے متعلق ہے جس کی تفصیل ہماری کتاب "اسلام اور روحانیت" میں ذکر کے باب میں انشاء اللہ بیان کی جائے گی۔ قازان کا جلاد حضرت ابو یوسف درّانی" کو قتل کرنے سے قاصر رہا اور تین بار اس کی تلوار ٹوٹی۔ اس درویش کے کمالات اور کرامات دیکھ کر قازان نے اسلام قبول کیا اور پھر قازان نے حکم دیا کہ جو دین اسلام قبول نہ کرے اسے قتل کر دیا جائے۔ آپ کا مقبرہ روس میں ماسکو سے مشرق کی جانب واقع ہے۔ روسی ترکستان میں آج مسلمان بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں، وہ انہی بزرگوں کے تصرفات کے باعث ہے۔

مولانا روم" نے مثنوی میں لکھا ہے کہ حضرت بایزید بسطامی" کا جب خرقان کے علاقے سے گزر ہوا تو وہ ایک جگہ پر بیٹھ گئے اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ یہاں ایک شخص ابوالحسن نامی آج سے تین سو سال بعد پیدا ہو گا اور آپ کی شکل و صورت اور احوال کا مکمل تذکرہ فرمایا۔ جب ابوالحسن خرقانی پیدا ہوئے تو بعینہٖ ان صفات کے حامل تھے جس طرح حضرت بایزید بسطامی" نے فرمایا تھا۔ ایک دن حضرت ابوالحسن خرقانی حضرت بایزید بسطامی" کے مزار کی حاضری کے لئے گئے تو تمام قبریں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور آپ کی قبر کی شناخت نہ ہونے کی وجہ سے واپس آنے لگے تو حضرت بایزید بسطامی" نے ان کو (بذریعہ القا) فرمایا کہ ادھر آؤ! میں اس طرف ہوں۔ چنانچہ آپ ان کی قبر شریف تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ (حضرات القدس) بہت سے مدفون بزرگوں کے واقعات ہر کسی کے مطالعے میں آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مزار مردہ نہیں بلکہ زندہ ہیں اور مرنے کے بعد بھی تصرّف کرتے ہیں۔

راقم الحروف کے محکمہ میں ایک چیف ایڈمن آفیسر تھے (جو اہل حدیث مسلک کے پابند تھے) ایک موقع پر انہوں نے راقم الحروف سے تقریباً ۱۹۳۰ء کی یہ بات بیان کی کہ ہندوستان کے زمانے میں انہوں نے پرتاپ نامی اخبار میں ایک ہندو کی داستان کا مطالعہ کیا، جس کے دو بیٹے "فارن افیئرز" میں (فرسٹ سیکرٹری قسم کے) بڑے عہدوں پر فائز تھے اور رشید روڈ لاہور میں وہ ہیضے کی وبا

میں مبتلا ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے علاج کرنے سے جواب دے دیا۔ ان کے باپ نے دیکھا کہ رات کو ۲ بجے کے بعد کوئی شخص بچوں کے کمرے میں آیا اور جب ان کا باپ ان کے پاس گیا تو وہ شخص اس ہندو سے کہنے لگا کہ تم فکر نہ کرو! تمہارے بچے صبح تک انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ جب اس نے پوچھا کہ آپ کون ہیں تو کہا ہم تمہارے ہمسائے ہیں۔ مزید پوچھنے پر فرمایا کہ مجھے گنج بخش کہتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی دونوں بیٹے روبصحت ہو گئے اور اس شخص نے حضرت گنج بخش ؒ کے مزار پر ان دنوں میں اپنے خرچ پر بجلی لگوائی جبکہ لاہور میں بجلی عام گھروں میں نہ لگی تھی۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد واہگہ بارڈر پر متعین ایک میجر نے حضرت داتا گنج بخش ؒ کی مسجد میں اپنا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا کہ ہمارے توپ خانے کا گولہ ختم ہو گیا تو ہم پریشانی کی حالت میں مبتلا ہو گئے اتنے میں ایک سفید ریش بزرگ ظاہر ہوئے اور ہماری پریشانی کی وجہ دریافت کرنے لگے۔ جب ہم نے حقیقت حال کا نقشہ بیان کیا تو فرمایا "دیکھو ان جھاڑیوں میں کتنا گولہ پڑا ہے"۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں وہ جگہ بھی بتلائی جدھر سے انڈیا کا گولہ آ رہا تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا تو آپ نے بتایا کہ مجھے گنج بخش ؒ کہتے ہیں۔ اس میجر نے کہا کہ اس واقعہ سے پہلے میں ایسی باتوں کا منکر تھا مگر یہ منظر دیکھنے کے بعد مجھے اولیاء اللہ کی امدادی قوت کا اندازہ ہوا۔ یہ بات عام لوگوں نے جمعرات کے دن مسجد میں منعقد ہونے والی مجلس میں سنی اور راقم الحروف کو ہمارے دفتر کے ایک ملازم مولوی علی محمد نے خود اس میجر کی زبان سے سن کر بیان کی۔

استمداد پر کچھ مزید روایات

اولیائے کرام کی سیرت کی کتابوں میں ایسے لاکھوں واقعات مطالعہ میں آتے ہیں اور ان کے عینی شاہد آج بھی موجود ہیں جو اولیاء اللہ کی کرامات کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں۔ اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں بھی موجود ہیں بلکہ آج کل تو انگریز لوگ بھی اس بات پر ریسرچ کر رہے ہیں اور وفات شدہ ارواح کے متعلق معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ایک فوت شدہ ڈاکٹر کی روح نے حاضر ہو کر کچھ خطرناک بیماریوں کا آپریشن کیا اور کچھ دوسرے لوگوں نے کئی لوگوں کے بہت سے کاموں میں مدد کی (اس کا کچھ بیان غلام جیلانی برق کی کتاب "من کی دنیا" اور ان کی دیگر کتب میں موجود ہے۔ جس میں انہوں نے حیرت انگیز کارناموں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ عبدالمجید صدیقی نے مذکورہ بالا کتاب "زیارت نبی بحالت بیداری" کے بعد "سیرت النبی بعد از وصال" میں بھی ایسی نوعیت کے بہت سے واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے والی امداد کے واقعات کا علم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ "جامع کرامات اولیاء" از علامہ یوسف نبہانی ؒ کا اردو ترجمہ بھی بازار میں دستیاب ہے جس میں استمداد از اولیا پر سینکڑوں روایات پیش کی گئیں ہیں۔ علامہ نور بخش توکلی ؒ نے بھی "رسول عربی" کے علاوہ اولیائے نقشبند اور تصوف کے موضوع پر اپنی

کتابوں میں اس قسم کی امداد کے متعدد تذکرے قلمبند کیے ہیں۔ لہٰذا اس موضوع پر اب اس سے زیادہ لکھنا طوالت کا سبب ہو گا، مگر اس قدر حوالہ جات کے ملنے کے باوجود ہمیں یقین ہے کہ وہ منکرین جو مخالفت برائے مخالفت کے عقیدے پر اندھا دھند قائم ہیں، قیامت تک اپنے عقیدے سے تائب نہیں ہو سکیں گے۔ ہم ان کو ان کی حالت پر چھوڑتے ہیں، البتہ اس تحریر سے یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ ایسے منکرین اولیاء اس کتاب کے پڑھنے والوں کو گمراہ نہیں کر سکیں گے۔

کشف، الہام اور کشفُ القُبُور

کشف کی تعریف: کشف پردہ اٹھانے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح صوفیا میں امور غیبی اور حقیقی معانی سے حجابات کا اٹھنا اور حقیقت ورائے حجاب پر وجوداً اور شہوداً اطلاع پانا کشف ہے۔ جو چیز مبہم اور پوشیدہ ہو اور اسے بندے پر اس طرح ظاہر کر دیا جائے جیسے عینی مشاہدہ ہو کشف کہلاتا ہے۔ کشف کی مندرجہ ذیل دو بنیادی قسمیں ہیں:-

(i) **کشف صوری۔** اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ جو معاملات خواب میں آئیں وہ بیداری میں پیش آنے لگیں۔ اس میں انسان کے حواس خمسہ کو عالم مثال کی چیزوں کا ادراک ہونے لگتا ہے۔ یہ ادراک کبھی بطور مشاہدہ ہوتا ہے یعنی اہل کشف انوار روحانی اور روحوں کی صورتوں کو متجسم دیکھے یا بطور سماع کے دیکھتے ہیں (جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی تھی)۔ کبھی وہ کشف نفحات الٰہی اور شمائم ربانی کو سونگھنے سے ہوتا ہے، جس طرح حضرت بایزید بسطامیؒ کو خرقان سے گزرتے وقت ابوالحسن خرقانیؒ کی ولادت کا علم ۳۰۰ سال پہلے ہی ہو گیا تھا یا حضرت یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کے کرتے کی خوشبو دور سے ہی آنے لگی تھی۔ کبھی وہ کشف بطور ملامست ہوتا ہے جس میں دونوں انوار یا دو اجسام کا آپس میں ملنا ہو، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اللہ تعالیٰ کو بہت اچھی اور خوبصورت شکل میں دیکھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب سے پوچھا کہ فرشتے کس معاملے میں گفتگو کر رہے ہیں ...... الخ بالکل ایسے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکوت سماوات اور ارض کو دکھایا گیا۔ کبھی یہ کشف بطریق ذائقہ بھی ہوتا ہے کہ انسان مختلف کھانوں میں سیری محسوس کرتا ہے۔ یہ کشف اللہ تعالیٰ کی تجلیات اسماء (علیم، بصیر، سمیع وغیرہ) سے ہوتا ہے۔ کشف صوری میں لوح محفوظ اور کتاب محو واثبات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

(ii) **کشف کونی۔** اس میں مغیبات دنیاوی (غیب کی چیزوں) پر اطلاع ہوتی ہے۔ اس کو غیر مسلم جوگی وغیرہ محنت اور ریاضت سے بطور استدراج حاصل کر لیتے ہیں جبکہ اللہ والوں کو بلا تکلف یعنی بغیر چلوں کے یہ کشف حاصل ہو جاتا ہے۔ بعض بزرگ دنیاوی امور تو کیا اخروی امور کی طرف بھی توجہ نہیں دیتے۔

مکاشفات پہلے خیال میں مقید ہوتے ہیں اور پھر وہ عالم مثال مطلق، لوح محفوظ،

عقل اول، اور علم الٰہی میں منتقل ہوتے ہیں۔ کشف میں کل امور سالک پر ظاہر نہیں ہوتے البتہ بعض امور پر انہیں خاص طور سے اطلاع ہو سکتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سینکڑوں میل کے فاصلے پر کھڑے ہو کر یَاسَارِیَۃُ اَلْجَبَلُ! (اے ساریہ پہاڑ کی طرف دیکھو) کہنا کشف کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ نے ایک شخص کو وضو کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ میں اس کے وضو کے پانی سے جو اس کی کہنیوں سے گر رہا ہے شراب کے گناہ کا اثر دیکھ رہا ہوں۔

الہام۔ راقم الحروف کی کتاب نشان منزل میں "فقہ اسلامیہ میں الہام کا مقام" کے عنوان سے اچھی خاصی تفصیل دے دی گئی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں یہاں اتنا جان لینا کافی ہے کہ ہر وہ چیز جو بطریق استدلال (دلائل سے) حاصل نہ کی گئی ہو بلکہ سالک پر حق تعالیٰ کی جانب سے یقین کامل کے ساتھ وارد ہوئی ہو القا ہے یا الہام ہے یا وحی ہے۔ درج بالا کتاب کے مضمون کو یہاں دہرانا مناسب نہیں لہٰذا اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

کَشْفُ الْقُبُوْر۔ اہل قبور کے بعض احوال اور کوائف کا محسوس کرنا یا ان سے سوال و جواب کرنا کشف القبور کہلاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے کفار کو ان کے دفن ہونے والی جگہ پر کھڑے ہو کر (ان کے نام لے کر) پوچھا کہ کیا تم نے اللہ کے وعدے کو سچا پالیا ہے جو تمہاری زندگی میں (بذریعہ قرآن) تم سے کیا گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس سوال پر کہ کیا یہ کفار مرنے کے بعد سنتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اپنی قبر میں تم سے زیادہ سنتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ اہل قبر تو لوگوں کے پاؤں کی آہٹ کو بھی سنتے ہیں (اور جب سنتے ہیں تو جواب بھی دیتے ہیں)۔ کشف القبور کی مزید تفصیل نیچے دی جا رہی ہے۔

حضرت داتا گنج بخش نے کشف المحجوب میں اپنا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ میں کئی روز تک مسلسل حضرت ابو سعید کے مزار پر حاضری دیتا رہا اور اس بات کا روزانہ مشاہدہ کرتا رہا کہ ایک سفید کبوتر آپ کے مزار پر آتا اور قبر کے غلاف میں غائب ہو جاتا۔ جب میں غلاف میں تلاش کرتا تو کوئی چیز نظر نہ آتی اور اس کبوتر کا سراغ نہ ملتا۔ آخر ایک دن آپ نے صاحب قبر سے دریافت کیا کہ یہ کبوتر کہاں غائب ہو جاتا ہے، تو صاحب قبر نے بتایا کہ بیٹا یہ کبوتر نہیں! بلکہ یہ میرے دل کی صفائی ہے جو میں دنیا میں رکھتا تھا اور اب روزانہ یہ کبوتر کی شکل میں مجھے ملنے کے لئے آتی ہے۔ چونکہ اس کا مادی وجود نہیں اس لئے آپ کو یہ غلاف میں نظر نہیں آتا۔

سائیں توکل شاہ صاحب نے اس بات کا خود مشاہدہ کیا کہ جب ان کے شیخ کی فاتحہ خوانی کے بعد لوگوں کو کھانا کھلایا گیا تو وہ کھانے کی رکابیاں نورانی شکل اختیار کر کے آسمان پر چڑھ گئیں اور تھوڑی دیر بعد وہی نورانی رکابیاں اس بزرگ کی قبر میں چلی گئیں جس کے لئے ختم دلایا گیا تھا اور وہ ان میں سے کھانا کھانے لگے۔ جس طرح بدن کی غذا یہ دنیاوی خوراک ہے اسی طرح روح کی غذا نور ہے اور روح اس کو کھا کر تقویت حاصل کرتی ہے۔ مرنے کے بعد بدن کو خوراک کی ضرورت نہیں

رہتی مگر روح کو غذا کی ضرورت رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگوں کے ایصال ثواب کو بزرگوں نے جائز قرار دیا ہے اور انہوں نے اس بات کا ملاحظہ فرمایا کہ ختم میں دی جانے والی چیز جس کو بھیجی جائے اسے مل جاتی ہے بشرطیکہ (ایڈریس ٹھیک ہو یعنی) پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو اس کا ایصال ثواب کیا جائے اور ان کی معرفت جس کو ایصال کرنا مطلوب ہو بعد میں اس کے نام کا ذکر کرے۔ (مکتوبات ربانی)

کشفُ القبُور کے بے شمار واقعات مطالعہ میں آئے ہیں لیکن ان سب کا بیان کرنا اس تحریر کے احاطہ سے باہر ہے لہٰذا اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

کَشفُ القبُور کا مختصر تعارف

حضرت عبیداللہ احرار قُدِّسَ سِرُّہٗ فرماتے ہیں کہ کشفُ القبُور یہ ہے کہ صاحب قبر کی روح کسی مناسب صورت میں ظاہر ہو جائے اور کشف کرنے والا اس صورت کو دیدۂ بصیرت سے دیکھے۔ چونکہ شیاطین کو بھی مختلف شکلوں اور صورتوں کے اختیار کرنے کی قوت حاصل ہے لہٰذا خواجگان نقشبندؒ نے اس کشف کا اعتبار نہیں کیا یعنی یہ ضروری نہیں کہ کشف ہمیشہ صحیح ہو۔ ان کے نزدیک اصحاب قبور کی زیارت کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی بزرگ کی قبر پر جاتے ہیں تو اپنے آپ کو تمام کیفیتوں اور نسبتوں سے خالی کرتے ہیں پھر (صاحب قبر کی) نسبت کے ظہور کے منتظر ہو کر بیٹھتے ہیں۔ پس جو نسبت پیدا ہوتی ہے اسی سے صاحب قبر کا حال معلوم کرتے ہیں۔ جو نئی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ اس کو اسی کا اثر جانتے ہیں۔ نمودار ہونے والی اس جدید کیفیت میں صاحب کشف کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

شیخ ابن عربیؒ اس تجلی کو (جو کشف میں ظاہر ہو) تجلی مقابلہ کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس کے ظہور کا سبب عرفا کے باطن کی جلا اور صفائی کو قرار دیتے ہیں جو نورانی باطن سے پیدا ہوتی ہے اور ان کا آئینہ حقیقت جو نقوش کونیہ (دنیاوی الائشوں) سے پاک اور صاف ہوتا ہے. اس میں سوائے تجلی ذاتیہ کے اور کچھ باقی نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں جو چیز اس آئینے میں آئے گی وہ اس کی ذاتی نہیں بلکہ اس شخص کے تقابل کی وجہ سے ہوگی (جس طرح سامنے آئینے میں کوئی شے اپنی صورت میں نظر آتی ہے)۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فیوض الحرمین میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کو حج کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت مبصرہ ہوئی (سر کی آنکھوں سے) فرماتے ہیں کہ میں نے روح مبارکہ ومقدسہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہراً وعیاناً دیکھا اور یہ بات درست ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں حاضر ہوتے اور لوگوں کی اعانت فرماتے ہیں۔ شاہ صاحب قبلہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی اصلی صورت کریمہ میں بار بار دیکھا ہے اور یہ حدیث شریف صحیح ہے کہ انبیاء کرام کو موت نہیں آتی اور وہ اپنی قبروں میں نمازیں پڑھتے ہیں اور حج کیا کرتے ہیں۔ فرماتے

ہیں کہ جب بھی میں نے آپ پر سلام بھیجا تو آپ مجھ سے خوش ہوئے اور اہل قبور سلام کا جواب بھی دیتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے "الفوز الکبیر" میں فرمایا ہے کہ میں نے قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پرفتوح سے پڑھا ہے اور میں آپ کا اویسی ہوں۔ فیوض الحرمین میں اس بات کا ذکر ہے کہ شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عالم بیداری میں بالمشافہ اور خواب کی حالت میں بھی احادیث سنی ہیں۔ کچھ احادیث کی آپ نے اصلاح فرمائی اور اس مجموعے کا نام "در ثمین" رکھا ہے۔ اس قدر معلومات حاصل ہو جانے کے بعد ایسی باتوں پر یقین نہ کرنے والا سوائے شقی القلب کے اور کون ہو سکتا ہے۔ ایسے لوگ ان بزرگوں کے فیضان سے بھی محروم رہتے ہیں اور بقول عزالدین عبدالسلامؒ ان لوگوں کے چہروں پر راندۂ درگاہ ہونے کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔

معلوم ہونا چاہئے کہ اس دنیا سے جب روح آزاد ہو جائے تو دوسرے جہاں میں پہنچ جاتی ہے اور اس کے لئے زمان اور مکاں کی قیود اور حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ جہاں چاہے، جب چاہے، پہنچ جاتی ہے۔ ان ارواح میں اہل ایمان اور کافر کی تمیز بظاہر کم ہوتی ہے لیکن اہل ایمان کے بلند درجہ اکابرین کی ارواح اور عام روح میں یہ فرق ہوتا ہے کہ ان کے درجات بلند ہوتے ہیں اور ان کو وہاں بھی تصرف حاصل ہوتا ہے، اگرچہ یہ تمام قوتیں انہیں دنیا میں بھی حاصل ہوتی ہیں، ان کی قبروں سے فیض اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ جب کوئی ان کی زیارت کے لئے جائے تو بخاری شریف کی ایک حدیث کے مطابق وہ وہاں لحہ بھر میں حاضر ہو جاتی ہیں۔

مزارات سے فیض

مسلمانوں میں یہ مسئلہ ایک متنازع فیہ امر بن چکا ہے کہ کیا اہل مزار فیض دینے پر قدرت رکھتے ہیں یا ان کی قبروں پر حاضری کا عمل غیر شرعی اور شرک پر مبنی ہے؟ افسوس کی بات ہے کہ اسلام میں منافقین اور دشمنان اسلام نے ہر مسئلہ میں اختلاف کا فتنہ کھڑا کر کے امت مسلمہ کو آپس میں دست و گریبان کر دیا ہے اور کچھ خوگر فتنہ و فساد لوگ ہر بات پر دشمنان اسلام کی مدد کرتے ہیں اور فتویٰ بازی شروع کر دیتے ہیں۔

راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ اگر کوئی سچے دل سے کسی مسئلے کی نوعیت کو معلوم کرنا چاہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ پہلے اپنی آنکھوں سے تعصب کی پٹی اتارے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے ہدایت اور راہنمائی کی دعا کرے تو یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو سیدھے راستے کی ہدایت عطا نہ فرمائے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ کچھ لوگ اپنے آباواجداد سے یا کسی دوسرے شخص سے بہت زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں اور کسی ایک عقیدے سے منسلک ہو جاتے ہیں تو اس کے ساتھ اس طرح چمٹ

جاتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس عقیدے سے ہلا نہیں سکتی۔ اس عقیدے پر وہ اس طرح ڈٹ جاتے ہیں کہ شاید اگر جبرائیل علیہ السلام بھی انہیں دم کر دیں تو وہ اپنے مسلک سے ایک انچ بھی انحراف نہیں کر سکتے۔ اس ضد اور ہٹ دھرمی کی کیفیت کو ہی تعصب کہا جاتا ہے اور تعصب کا حشر سوائے گمراہی اور محرومی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

قبروں پر حاضری دینے کے موضوع پر بحث کرنا اس تحریر کا مقصد نہیں، کیونکہ یہ بحث بہت طوالت طلب ہے اور ایسی بحثوں میں اتفاق رائے کا ہونا شاید و باید ہی ہوتا ہے۔ یہ تحریر ان لوگوں کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھی جا رہی ہے جو لوگ مزاروں پر حاضری کو جائز قرار دیتے ہیں۔ البتہ اس تحریر میں عقلمند لوگوں کے لئے کچھ اشارے بھی موجود ہیں۔ متزلزل عقائد والوں کی بے یقینی کی کیفیت کو دور کرنے کے لئے چند ایک تسلی بخش نکات بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی ارادت کو درست اور مزید مضبوط بنیادوں پر استوار فرمائے۔ آمین

حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضؓ اور ائمہ کا معمول اور ارشادات

احادیث نبوی میں قبروں کی زیارت کا ذکر اکثر ملتا ہے۔ قبروں کی زیارت کے دیگر فوائد میں سے ایک یہ بھی بیان ہوا ہے کہ زائر کو قبروں کی زیارت سے اپنی موت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ کرام کا عمل اس بات کا نمونہ پیش کرتا ہے کہ آپ قبروں کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضؓ نے ایک رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر میں نہ پایا تو آپ کو قبرستان میں موجود پایا۔ (ان احادیث کا حوالہ مطلوب ہو تو کتب احادیث سے رجوع فرمائیں) ۔ ان سب باتوں کے علاوہ آٹھ یا نو مستند احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ملتا ہے "جس نے میری قبر کی زیارت کی تو گویا اس نے میری زیارت کی"۔ ایک حدیث میں اس طرح بھی فرمایا کہ جو شخص مدینہ شریف پہنچا اور اس نے میری قبر کی زیارت نہ کی تو اس نے مجھ پر ظلم کیا۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس نے میری قبر کی زیارت کی تو اس پر میری شفاعت واجب ہو گئی۔ احادیث میں اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال شہدائے بدر کی قبروں کی زیارت کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ جذب القلوب (تاریخ مدینہ) مصنفہ حضرت عبدالحق محدث دہلوی رحؒ میں یہ روایت درج کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے بعد جب حضرت بلال رضؓ ملک شام میں سکونت پذیر تھے تو ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کہ اے بلال! یہ کیا ظلم ہے کہ ایک طویل عرصہ ہو گیا ہے اور تم ہماری زیارت کو نہیں آئے۔ روایت میں ہے کہ حضرت بلال رضؓ نے صبح اٹھتے ہی مدینہ شریف کے لئے رخت سفر باندھا

اور جب وہاں پہنچے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں چند صحابہ کبار اور حضراتِ حسنین کریمینؓ بھی قبر اقدس پر موجود تھے۔ اس زیارت کے وقت حضرت بلالؓ کو اذان دینے کے لئے کہا گیا تو جب ان کی فرمائش پر آپ نے اذان شروع کی تو مدینہ شریف میں ایک قیامت بپا ہو گئی اور حضرت بلالؓ وفور غلبہ سے اذان مکمل نہ کر سکے۔ (اس زیارت کی تفصیل بہت طویل ہے لہٰذا تاریخ مدینہ کا صفحہ ۲۳۰ اور ۲۳۱ ملاحظہ فرمائیں)۔ حضرت عبدالحق دھلویؒ نے جَذْبُ الْقُلُوْبِ اِلیٰ دِیَارِ الْمَحْبُوْبِ یعنی تاریخ مدینہ میں زیارت روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام خوبصورت واقعات کا ذکر فرمایا ہے اور اس کتاب کا پندرھواں باب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور کی زیارت کے مستحب یا واجب ہونے کے متعلق تحریر فرمایا ہے جس کے مطالعہ سے اہل ذوق کے دلوں میں محبت کے باعث رقت طاری ہو جاتی ہے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا کتاب میں حضرت عبدالحق محدث دھلویؒ نے ایک بہت خوبصورت واقعہ درج کیا ہے اور وہ یہ کہ مروان بن الحکم گورنر مدینہ شریف نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنا روئے نیاز قبر نبوی پر رکھے ہوئے تھا۔ مروان نے اس کی گردن پکڑ کر کہا کہ تو جانتا ہے کہ جس فعل کا تو مرتکب ہو رہا ہے یہ کیسا ہے؟ اس پر اس شخص نے کہا خبردار! مجھے چھوڑ دو، میں نے اپنا چہرہ پتھر (کے بت) پر نہیں رکھا ہے بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تربت پر رکھا ہے اور کہنے لگا کہ میں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے کہ دین پر اس وقت رونا چاہئے جس وقت ولایت (یعنی حکومت) کسی نااہل شخص کو پہنچے۔ حضرت عبدالحق محدث دہلوی کا اس واقعہ پر اپنا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔ اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں "خدا اس کہنے والے سے راضی ہو"۔

جذب القلوب (تاریخ مدینہ) میں حضرت عبدالحق محدث دھلویؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت (بحوالہ حافظ ابو عبداللہ کی مصباح الظلام) میں ایک اعرابی کا قصہ لکھا ہے کہ جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی مٹی اپنے سر پر ڈال کر قرآن کی آیت وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ۔ (النساء ٦٤) کا حوالہ دے کر اپنے گناہ بخشوانے کے لئے زاری کرنے لگا تو قبر سے آواز آئی "قَدْ غُفِرَ لَكَ" (یعنی تجھے معاف کر دیا گیا ہے) اس واقعہ کے علاوہ اس کتاب میں اور دیگر سیرت کی کتابوں میں بہت سے لوگوں کے واقعات درج کئے گئے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ آپ کے مرقد مبارک پر جا کر کچھ عرض کرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عرضداشتوں کو منظور فرمایا کرتے ہیں۔ ایسے واقعات چونکہ بہت زیادہ ہیں اس لئے انہیں یہاں درج کرنا ممکن نہیں۔

اولیائے سلف اور اولیاء حال کے مثالی معمول

حضرت مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ کا ایک بصیرت افروز واقعہ کئی کتابوں میں ملتا ہے کہ آپ تقریباً ہر سال حج کے لئے جایا کرتے اور مدینہ شریف میں طویل قیام فرمانے کے بعد جب واپسی کا ارادہ فرماتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد مبارک پر اجازت طلب کرنے کے ارادے سے جاتے اور حسب ذیل الفاظ میں عرضداشت پیش کیا کرتے تھے۔

آقائی و مولائی! بہ سفر می روم. چہ می فرمائی؟
(میرے آقا و مولیٰ! میں سفر پر روانہ ہو رہا ہوں! آپ کا کیا حکم ہے؟)

آپ کی اس عرضداشت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر بار یہ جواب فرمایا کرتے:۔

بہ سفر رفتنت مبارکباد، بہ سلامت روی و باز آئی
(سفر پر جانا مبارک ہو! سلامتی سے جاؤ اور پھر واپس آؤ!)

مولانا جامیؒ فرماتے ہیں کہ جب وہ اپنی عمر کے آخری حج پر گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باز آئی (یعنی پھر آؤ) کے الفاظ شامل نہیں کئے تو آپ سمجھ گئے کہ اگلے سال حج سے پہلے آپ کا وصال ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ واقعہ عقیدتمندوں کے لئے انتہائی ایمان افروز اور وجد آفریں ہے لیکن بدنصیب لوگ جو بزرگوں کی ایسی نعمتوں سے محروم ہیں ہر واقعہ کو غلط، غیر مستند اور من گھڑت کہہ کر ان بزرگوں کے فیوض سے محروم ہو جاتے ہیں۔ (دیکھئے ص ۴۵۰، اسلامی تربیتی نصاب جلد اول از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری)

اگر دور قدیم کی باتوں کو ایک طرف کر دیا جائے تو بھی ہم آج کل کے زمانے پر زیر بحث بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہئے کہ اولیائے کرام کا وجود ہماری ملت کے بالائی طبقے میں شمار کیا جاتا ہے اور ان کا مقام صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے بعد آتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہم تبع تابعین کے بعد کسی کی بات کو مانتے ہی نہیں تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ نعوذ باللہ، اسلام، تبع تابعین کے بعد کہیں بھی صحیح حالت میں نہ رہ سکا۔ اور ان کے بعد کسی شخص کی بات معقول نہیں۔ ایسے منکرین اب سورۂ فاتحہ میں سے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا معنوی حکم باقی کیوں مانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مقربین اور اصحاب یمین جن کا ذکر سورہ واقعہ میں اس طرح آتا ہے قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ یعنی ایسے مقربین آخری زمانے میں بھی آتے رہیں گے اگرچہ ان کی تعداد قلیل ہی کیوں نہ ہو۔ ان مقربین کے عمل کو ناقابل تقلید سمجھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ چنانچہ اب بھی قطب، غوث، مجدد، اور مجدد الف سنہ اس دنیا میں آرہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے فیصلوں کو ماننے کا حکم قرآن بھی دیتا ہے۔ قرآن نے کہا

کہ فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ یعنی اہل ذکر سے پوچھو۔ (سورہ الانبیاء آیت ۷) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن اور حدیث کو خوب سمجھا اور اس کے مطابق عمل کیا۔ جو لوگ ان کے عمل اور فیصلوں کو درست تسلیم نہیں کرتے ایسے لوگوں کی عقل کے بارے میں آپ خود قیاس آرائی کر سکتے ہیں۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ مذکورہ بالا مقربین اور مجددین نے مزارات اولیاء کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا ہے؟ لیکن اس سے پہلے کہ ان کے متعلق گفتگو کی جائے اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ یہ لوگ معمولی شان کے حامل نہیں، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ پاک وہند میں اسلام انہیں لوگوں کے دم قدم سے پھیلا اور ہم ان لوگوں کی کاوشوں سے ہی مشرف باسلام ہوئے ہیں اور اب ان کے اعمال کو ہی غیر اسلامی یا غیر شرعی تصور کرنا سراسر خطا ہے۔ نشان منزل میں حضرت علی ہجویری ؒ کی خدمات پر مبنی راقم الحروف نے فارسی زبان میں ایک منقبت لکھی ہے اس کا مطالعہ کرنے سے ان کی علو مرتبت شان کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ ان کا فلاں عمل بدعت ہے تو ایسا کہنے والا اپنا ٹھکانہ خود سوچ لے۔ یہ لمحہ فکریہ ہے کہ اگر ہم اتنے بڑے بڑے اولیاء کو بدعتی کہنے لگیں تو کیا آج اس دنیا میں کوئی ایک شخص بھی مسلمان کہلایا جا سکے گا؟

مزارات کی زیارت کرنا
اولیاء کا معمول تھا

اولیائے کرام کی تصانیف اور سوانح حیات کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ مزارات کی زیارت کرنا ان کی زندگی کا معمول تھا۔ حضرت داتا گنج بخش ؒ کی کشف المحجوب کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ آپ بے شمار مزارات پر مسلسل اور طویل عرصہ کے لئے حاضری دیا کرتے تھے اور آپ نے ان مزارات سے حاصل ہونے والے فیوض کا بھی کئی مقامات پر تذکرہ فرمایا ہے۔ آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا مفصل حوالہ دینا اس تحریر کے احاطہ سے باہر ہے۔ جن صاحبان کو دلچسپی ہو تو وہ براہ راست مذکورہ بالا کتاب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اور قابل ذکر مثال یہ ہے کہ حضرت معین الدین چشتی ؒ اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکر ؒ نے بھی حضرت داتا گنج بخش ؒ کے مزار پر چلوں کا اہتمام کیا اور وہ حجرہ جس میں حضرت معین الدین چشتی ؒ نے چلہ مکمل فرمایا تھا. اب بھی حضرت داتا گنج بخش ؒ کے مزار کے قریب محفوظ ہے اور اس کے کچھ فاصلے پر "ٹبہ بابا فرید" کے نام سے ایک حجرہ آج بھی (ایس ایس پی آفس لاہور کے قریب) موجود ہے۔ حضرت معین الدین چشتی ؒ نے اس چلہ کے مکمل ہونے کے بعد ہی یہ مشہور و معروف شعر لکھا تھا۔ ۔ ۔

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را رہنما

مزارات پر حاضری کیوں دی جاتی ہے، بزرگوں کے مزارات پر کیا فیوضات ملتے ہیں؟ یہ ایک ایسی طویل گفتگو ہے جس پر بہت سی کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور اس جگہ اس موضوع پر گفتگو کرنا اس کتاب کے مقاصد سے باہر ہے، البتہ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ کچھ مشائخ کبار نے بزرگوں کے مزارات پر جانے سے منہ مانگی مرادیں حاصل ہونے کا ذکر کیا ہے۔ کشف المحجوب میں حضرت ابوالعباس مہدی سیاری" (جن کا مزار "مرو" میں ہے) کے احوال کے بیان میں حضرت علی ہجویری" لکھتے ہیں کہ لوگ مرو میں اس بزرگ کے مزار پر اپنی حاجت روائی کے لئے جاتے ہیں اور بامراد واپس آتے ہیں اور حل مقاصد کے لئے آپ کی قبر پر جانا مجرب ہے۔ راقم الحروف کے درج ذیل دو اشعار ان ہی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کشاں کشاں چلے آتے ہیں کیوں یہ دیوانے؟
یہ جائے جود و سخا ہے، فقط مزار نہیں
نہ باندھو سفرِ مدینہ، یہ کون کہتا ہے؟
وہ کون ہے جسے روضے سے کوئی پیار نہیں؟

اَہْلُ السُّنَّتِ وَالْجَمَاعَتْ کا عقیدہ ہے کہ قرآن کی رو سے اولیائے کرام صرف نقل مکانی کرتے ہیں اور اپنی قبروں میں اسی طرح زندہ ہیں جس طرح وہ دنیا میں تھے لیکن عام انسان ان کی اس حیات کو سمجھ نہیں سکتے۔ وہ مرنے کے بعد حیات جاوداں حاصل کر لیتے ہیں اور ان کی وہ زندگی اس دنیا کی زندگی سے کئی گنا زیادہ افضل ہے اور وہاں ان کو اس دنیا سے زیادہ تصرف حاصل ہوتا ہے۔ راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے کہ اولیائے کرام کو اپنی قبروں میں اللہ کی طرف سے اس قدر اختیارات حاصل ہیں کہ جب بذریعہ کشفُ القبور ان سے رابطہ کیا گیا تو یہ دیکھا گیا کہ بعض امور میں تو وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ فلاں کام ہو جائے گا اور اتنے عرصہ میں ہو جائے گا اور بعض کے لئے دعا کر دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ اس موضوع پر لکھنا مناسب نہیں۔

کہاں حضور کی لذت، کہاں حجاب دلیل؟

مذکورہ بالا بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم یہ بات قارئین کی سوجھ بوجھ پر چھوڑے دیتے ہیں کہ وہ اس بات کا خود مطالعہ کریں کہ وہ کون کون سے علماء ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ انسان جب مرجاتا ہے تو مرنے کے بعد وہ کچھ نہیں کر سکتا جبکہ قرآن تو اولیاء و شہداء کرام کے مرنے کو تسلیم ہی نہیں کرتا، بلکہ ان کے زندہ ہونے کی ضمانت دیتا اور حمایت میں یہ کہتا ہے "تم ان کی حیات کو سمجھ نہیں سکتے۔ وہ زندہ ہیں اور اللہ کے ہاں انہیں رزق دیا جاتا ہے" (دیکھئے سورۂ البقرہ آیت ۱۵۴ اور سورۂ آل عمران آیت ۱۶۹)۔ دوسری طرف اس بات کا بھی مطالعہ کریں کہ بزرگوں کے فیوض اور عطاؤں کو تسلیم کرنے

والے اور ان کے مزارات پر جانے والی کون کون سی ہستیاں ہیں۔ ایسے لوگ جو اہل مزارات سے فیوض ملنے کے قائل ہیں ان میں تمام اولیائے کرام شامل ہیں جن میں حضرات و مشائخ نقشبندیہ قُدِّسَ سِرُّهُمْ ہیں (حضرت بایزید بسطامی، ابوالحسن خرقانی، ابو یوسف ہمدانی، عبدالخالق غجدوانی، عبیداللہ احرار، خواجہ امکنگی، خواجہ باقی باللہ، مجدد الف ثانی اور دیگر سلاسل قادریہ سہروردیہ، چشتیہ کے مشائخ عظام (علی ہجویری، شیخ عبدالقادر جیلانی، جنید بغدادی، شہاب الدین سہروردی، معین الدین چشتی، فریدالدین گنج شکر، نظام الدین اولیا، شاہ ولی اللہ وَغَيْرُهُمْ رَحِمَهُمُ اللهُ عَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ شامل ہیں۔ ان اولیائے کرام کے اجتہادی فیصلے اور ذاتی اعمال یقیناً ان نام نہاد علماء کے مقابلے میں جو اہل مزارات کے فیوض حاصل کرنے کے منکر ہیں، اتنا ہی فرق رکھتے ہیں جتنا زمین اور عرش میں فرق ہوتا ہے۔

مولانا روم ؒ کی مثنوی کا مطالعہ کیا جائے تو زیرِ غور مسئلہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ صوفی شاعروں نے اپنے کلام میں موضوع بحث پر جو کچھ کہا ہے، وہ اہل دانش کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔ اس کتاب میں بھی راقم الحروف نے مختلف مقامات پر اولیائے کرام کی علو مرتبت شان کو واضح کیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ جس کا سینہ کھول دے وہی ان رموز پر آگہی حاصل کر سکتا ہے۔ حقیقتاً اہل نظر بزرگ ہی بینا ہیں، باقی سب اندھے ہیں۔ علامہ اقبال ؒ نے فرمایا ہے کہ ۔

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغ اصیل

اہل نظر اولیائے کرام تو وہ کچھ دیکھ لیتے ہیں جو اہل قال کی سمجھ میں تو کیا خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ پیر مہر علی شاہ صاحب ؒ نے اپنے دور میں دعویٰ نبوت کرنے والے مرزا غلام احمد قادیانی کو چیلنج کیا تھا کہ تم جلسہ عام میں آؤ اور میز پر رکھے ہوئے قلم کو حکم دو کہ وہ لکھے کہ مرزا نبی ہے" ورنہ میں قلم کو حکم دوں گا اور وہ یہ لکھے گا کہ "مرزا جھوٹا نبی ہے۔ مرزا قادیانی نے چیلنج کو قبول کیا لیکن میدان میں آنے کی جرات نہ کر سکا۔ ایسے ہی خیالات کے حامل ایک عالم نے (غالباً ۱۹۶۰ء کے بعد) لاہور کے ایک اخبار میں یہ بیان دیا تھا کہ کشف المحجوب کے مصنف داتا گنج بخش ؒ موجودہ دربار میں دفن نہیں ہیں بلکہ پرانے قلعہ کے مغرب میں دفن ہیں اور میں بتا سکتا ہوں کہ ان کا سر اور پاؤں کس جگہ ہے۔ (اور کتنی جگہ گھیرے ہوئے ہیں) جب انہیں کہا گیا کہ آپ داتا دربار میں آئیں اور ہم آپ کو اور آپ کے ساتھ آنے والے سب لوگوں کو دکھائیں گے کہ داتا صاحب اپنے اسی مزار میں دفن ہیں تو اس چیلنج پر وہ عالم دین اپنا بیان بدلنے لگے اور تاویلات پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ جو لوگ اہل نظر ہیں وہ ہرگز بے تکی باتوں کو قبول نہیں کرتے کیونکہ جس کو دید ہو جائے وہ شنید پر کب اعتبار کرے گا۔ غلط باتیں وہی کرتا ہے جس کو دید کی طاقت نہ ہو۔ مولانا روم ؒ فرماتے ہیں کہ اگر اندھے کو کہیں کہ

ذرا دیکھنا کہ یہ منظر کتنا حسین ہے، تو وہ اندھا کیسے دیکھ سکتا ہے۔

گر بگوئم کور چشمے را بہ بیں، کے بہ بیند کور چشمے بے یقیں

کشف میں نفس کی تطہیر اور قوت ارادی کا دخل ہوتا ہے

صفائے قلب اور کشف کے شغل کے لئے خواہشات اور نفس کی دیگر کدورتوں کا دور ہونا نہایت ضروری ہے۔ خود کو حرام خواہشات سے روکے رہنے اور معمولی مجاہدات سے طریقت کے اوائل مراتب تو ہاتھ آسکتے ہیں لیکن طریقت کے اعلیٰ مراتب کو حاصل کرنے کی غرض سے سخت مجاہدات اپنانا اور بہت سی حلال چیزوں اور مباحات کا بھی ترک کرنا ضروری ہوتا ہے۔ گو ایک صوفی ہر اعتبار سے عام انسانوں کی طرح ہوتا ہے مگر اس کے قلب کی حالت عام انسانوں سے مختلف نہ ہو تو اس وقت تک وہ عوام سے امتیاز حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کی شادی اور غم کے پیمانے مختلف ہوں گے اور اس کے سود و زیاں کے معیار دوسرے لوگوں سے مختلف ہوں گے۔

صوفیہ کا قول ہے کہ طریقت کی منازل یقین سے ہی طے ہوتی ہیں اور حصول یقین کے لئے خواہشات نفسانیہ پر غالب آنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر تطہیر قلب نہیں ہو سکتی اور قلب کی پاکیزگی کے بغیر نور عرفان جو مراقبہ اور رابطہ کے لئے ضروری ہے تجلی نہیں کر سکتا۔ عام انسان خواہشات کی دنیا سے مغلوب ہوتے ہیں لیکن صوفی اس پر غالب ہوتا ہے اور یہ غلبہ اسے اپنی قوت ارادی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ جو اپنے دل کو حقیقی محبت کے انوار سے بھر لے گا اسے اندازہ ہو جائے گا کہ اس کا ٹھکانہ اور مسکن دنیا سے ماوراء کہیں اور ہوتا ہے اور اس کے دل کو عام زندگی سے مختلف ایک نئی زندگی مل جاتی ہے۔ اس میں ایسی طاقت پیدا ہو جائے تو سالک مراقبہ اور طریق رابطہ جیسے امور میں پختگی پیدا کر سکتا ہے۔

ابن قیم الجوزی نے کہا ہے کہ قلب میں دو طاقتیں ہوتی ہیں۔ ایک علم و تمیز کی قوت. دوسری ارادہ اور محبت کی قوت۔ جو قوت علم و تمیز کا صحیح استعمال کرے وہ حق کا ادراک (عرفان) حاصل کر سکتی ہے اور جو قوت محبت اور ارادہ سے حق کی طلب کرے، باطل اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کے دل میں لوگوں کی دنیاوی حیثیت بکری کی مینگنیوں سے زیادہ نہیں رہتی۔ اس حالت میں اس کی توجہ الی اللہ میں کوئی کسر نہیں رہتی اور رابطہ کامل میسر ہو جاتا ہے۔

نفسانی خواہشات پر قابو پانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس دنیا میں حق باطل کے ساتھ ملا جلا ہوا نظر آتا ہے۔ حق اور باطل کے دونوں مظاہر باہم ہوں تو کئی مرتبہ یہ دونوں واضح بھی نہیں ہوتے اور کبھی حق باطل کی طرح اور کبھی باطل حق کی طرح نظر آتا ہے۔ جب باطل حق کا لبادہ پہن کر

سامنے آجائے تو اس سے بڑے بڑے صوفی بھی دھوکے میں آجاتے ہیں (اسلام کے بہت سے فرقوں کا رائج ہونا اسی دھوکے کی نشان دہی کرتا ہے)۔ عام آدمی تو باطل سے اس لئے بھی مرعوب ہو جاتے ہیں کہ باطل میں زینت اور کشش کا پہلو بظاہر زیادہ ہوتا ہے. اس لئے یہ کشش (نفس کا میلان) انسان کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ زیادہ لوگ باطل کی طرف اس لئے بھی جھک جاتے ہیں کہ ایسے لوگ دین سے دور رہتے ہیں اور زیادہ عافیت اور عیش و عشرت میں زندگی گزارنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اہل علم تو یہی فریاد کرتے ہیں کہ

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلاشدی ما را خراب کردی و خود مبتلا شدی

(اے چمک کو پسند کرنے والی میری طبع تو میرے لئے ایک مصیبت ہے۔ تو نے (نفس میں الجھاکر) مجھے خرابات میں مبتلا کر دیا)

حضرت مجدّد الف ثانی ؒ فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے دوست اور دشمن کو آزمائش یا امتحان کے لئے ملا دیا ہے اور دونوں کو ہی اپنی رحمت میں شامل کر لیا ہے جیسا کہ قرآن کی اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے جس میں فرمان باری تعالیٰ ہے۔ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (میری رحمت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔ سورۂ الاعراف ۱۵۶) قرآن سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ دشمن کو دوست سے جدا کر دیں گے جیسے کہ فرمایا وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (آج کے دن اے مجرمو تم جدا ہو جاؤ۔ سورۂ یٰسین۔ ۵۹) اگرچہ دنیا میں دوست اور دشمن ملے جلے نظر آتے تھے۔

راقم الحروف کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے مریدوں کو دین اور دنیا میں خوب محنت اور مشقت سے کام لینے کی ہدایت کرتا ہے اور جب تک سالک کے دنیاوی کاموں کی الجھنیں کم نہ ہو جائیں اس وقت تک اسے طریقت میں پیش رفتی کا حکم نہیں دیتا۔ یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ جب تک سالک کو اکل حلال کی فکر سے فراغت حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک تنگ دستی کا خوف سالک کو تصوف سے بددل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ یکسوئی حاصل ہونے کے بعد ہی سالک کو اپنے شیخ سے ربط کامل حاصل ہو سکے گا اور وہ طریقت کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکے گا. لہٰذا ایسی صورت حال میں اس کا روحانی رابطہ مادی رشتوں پر غالب آکر رہے گا۔ ہم نے بڑے بڑے صوفیاء کو اس نہج پر قائم اور استوار دیکھا ہے کہ جب ان کو طریقت میں مکمل رغبت حاصل ہو جائے تو پھر ان کو دنیاوی مشکلات کا مردانگی سے مقابلہ کرنے کی استطاعت حاصل ہو جاتی ہے۔

علم ظاہری میں مہارت کے بغیر کشف اور صوفیا سے استفادہ ممکن نہیں

احوال، شریعت کے تابع ہوتے ہیں مگر شریعت احوال کے تابع نہیں۔ کیونکہ شریعت قطعی ہے اور وحی الٰہی سے ثابت ہے جب کہ احوال ظنی ہیں جو کشف اور الہام سے ثابت ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے کشف پر اعتماد کر کے شریعت کے انکار اور مخالفت کی جرات کرتے ہیں حالانکہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پاتے تو ان کے لئے بھی سوائے اس روشن شریعت کی پیروی کے اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ اسی لئے حضرت خواجہ باقی باللہ ؒ فرماتے ہیں کہ ہماری نسبت تمام نسبتوں سے بلند ہے کیونکہ ہمارا طریقہ سنت کی اتباع اور عزیمت (زیادہ بہتر صورت) کے لحاظ سے دوسرے طریقوں سے زیادہ قوی اور بلند ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے فرمایا ہے (حضرات القدس۔ ص ۱۱۳) کہ مجھے بذریعہ کشف معلوم ہوا ہے کہ حضرت مہدی موعود ؒ نسبت نقشبندیہ پر ہوں گے۔ صوفیا کا قول ہے کہ جب تک کوئی شخص علم ظاہری میں پوری مہارت نہ رکھتا ہو اس وقت تک وہ صوفیا کی باتوں کے اسرار سے مستفید نہیں ہو سکتا۔

حضرات القدس میں ہے کہ ایک درویش نے حضرت مجدد الف ثانی ؒ سے اپنے ایک خواب میں دریافت کیا کہ کیا صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحبت سے ہی بڑے سے بڑے اولیاء سے افضل ہو جاتے تھے؟ کیا ان میں یہ تبدیلی پہلی صحبت میں ہی ممکن ہو جاتی تھی؟ جب وہ درویش حاضر خدمت ہوا تو پہلی صحبت میں ہی اس کے احوال تبدیل ہو گئے اور وہ آپ کے کمالات کا معترف ہو گیا اور صحابہ کرام کا ایک ہی صحبت میں جلیل القدر درجات پر فائز ہونے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

کسی مرحلے پر استغفار کے بغیر فقیر کو چارہ نہیں

قرآن اور احادیث سے ثابت ہے کہ مسلمان کو استغفار کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی لاتعداد نعمتوں سے سرفراز کیا جاتا ہے اور اسے تمام مصائب سے نجات ملتی ہے۔ کسی کو خواہ کوئی مشکل درپیش ہو اس کی ہر مشکل کا حل کثرت استغفار میں ہے۔ شیطان کے لئے استغفار سے زیادہ سختی کسی چیز میں نہیں کیونکہ استغفار اس کی کمر توڑ دیتی ہے۔ انسان کے درجات کی بلندی میں استغفار کا مقام بہت اہم ہے۔

روحانیت کے ہر مقام میں فقیر کا استغفار الگ نوعیت کا ہوتا ہے۔ شروع شروع

میں وہ اپنے گزشتہ گناہوں سے استغفار کرتا ہے۔ جب آگے ترقی کرتا ہے تو اللہ کی یاد میں کمی ہونے پر استغفار کرتا ہے اور اس سے آگے جب ترقی کرے تو اپنے قصور ہمت و عزم پر استغفار کرتا ہے۔ جب مقام مشاہدہ پر پہنچتا ہے تو کہتا ہے کہ الٰہی میرے اندر اتنی استعداد نہ تھی کہ میں اپنی کوشش اور ہمت سے ترا دیدار اور تری ذات کا وصل حاصل کرتا۔ گویا اس کو کسی وقت اور کسی مقام پر استغفار سے چارہ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اولیائے کرام کا فرمان ہے کہ آپ کے دن اور رات میں ستر درجات بلند ہوتے تھے اور آپ ہربار اپنے پہلے درجے کو دیکھ کر استغفار فرماتے تھے۔ (ہماری تصانیف "سرمایۂ ملّت" اور "حُسنِ نماز" میں استغفار پر مشتمل خاصا طویل مضمون دے دیا گیا ہے)

زیارتِ قبور کا مقصد کیا ہونا چاہئے؟

مزارات پر سالکوں کے مراقب ہونے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ صاحب قبر سے انوار حاصل کئے جائیں۔ یوں تو اولیائے کرام سے کسی جگہ پر بھی بیٹھ کر فیض لیا جا سکتا ہے مگر ان کے مزارات پر جانا اس لئے بہتر تصور کیا جاتا ہے کہ ان کے قرب و نواح میں انوار کی کثرت کے باعث فیض لینا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ مزارات پر دنیاوی حاجات کے لئے جاتے ہیں، لیکن بہتری اسی میں ہے کہ حاضری کا مقصد صاحب مزار کا قرب اور فیض حاصل کرنا ہو۔ اگر زیارت مزارات کا یہ مقصد ہو تو صاحب قبر بہت خوشی محسوس کرتے ہیں اور مراقب کی طرف جلد متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اولیائے کرام چونکہ اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ سے وابستہ تھے اور لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے لہٰذا مرنے کے بعد بھی ان کی روح پر فتوح سے فیوضات ملتے رہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ میں قبر میں بھی تمہارے لئے دعا کرتا رہوں گا۔

حضرت بدرالدین سرہندیؒ فرماتے ہیں کہ قبور اولیاء کی زیارت سے مقصود یہ ہونا چاہئے کہ ان کے توسط سے توجہ سبحانہ تعالیٰ قائم ہو جائے اور ان کی روح کو کمال توجہ کا وسیلہ بنایا جائے۔ سالک کو چاہئے کہ صاحب قبر کی صفت کو پہنچانے اور اس کی صفت میں داخل ہونے کی کوشش کرے یعنی جس روحانی انداز میں وہ زندگی بسر کرتے تھے خود بھی اسی انداز کو اپنانے کی کوشش کرے۔ فرماتے ہیں کہ بمقابلہ نفی اثبات کے اسم ذات کا مراقبہ کرنا مقام جذبہ کے لئے اعلیٰ اور اقرب ہے کیونکہ اس (مراقبہ) کے ذریعے ہم مقام نورانیت اور ملک و ملکوت کے تصرف میں پہنچ سکتے ہیں۔ دوام مراقبہ سے طالبوں کے بطون منور ہو جاتے ہیں اور ان پر بخشش کی نظر ہونے کے علاوہ خطرات سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ مراقبہ کی قوت سے جمعیت قلب پر دوام اور قلوب میں قبولیت پیدا ہوتی ہے۔ اس حالت کو جمع اور قبول کہتے ہیں۔

حضرات القدس میں ہے کہ حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ بارہ سال کی عمر سے ہی عشاء کی نماز خرقان میں پڑھ کر بسطام میں حضرت بایزید بسطامیؒ کی قبر پر جا کر کھڑے ہو جاتے اور آپ کی

روح پر فتوح سے برکات اور افاضات کے منتظر ہو کر مراقب رہتے اور کہتے کہ خدایا جو تو نے بایزیدؒ کو دیا ہے ابوالحسن کو بھی عطا فرما۔ آپ ایسے وقت پر واپس آتے کہ خرقان میں آکر صبح کی نماز عشاء کے وضو سے با جماعت ادا فرماتے۔ مزاروں پر مراقب رہ کر فیض حاصل کرنا بزرگوں کا طریقہ رہا ہے۔

کشفُ القُبور کا طریقہ

بعض اولیائے کرام کے نزدیک یہ امر مستحسن ہے کہ پہلے چند نوافل ادا کیے جائیں اور اس کے بعد صاحب مزار کی روح کو ایصال ثواب کیا جائے اور پھر فاتحہ خوانی (سورۂ کافرون، اخلاص تین بار، اَلْفَلَقْ اور الناس ایک ایک بار پڑھ کر سورۂ فاتحہ اور پھر سورۂ البقرہ کی شروع کی آیات لفظ مُفْلِحُوْن تک ایک بار پڑھے اور مروجہ ختم شریف کی دیگر چند آیات پڑھ کر چند بار درود شریف پڑھا جائے۔ جو کچھ پڑھا جائے اس کا ثواب اہل قبر کی نذر کیا جائے اور پھر اہل قبر کے چہرے کے سامنے بیٹھ جائے اور آنکھیں بند کر کے یہ تصور کرے کہ میں ان کے سامنے بیٹھا ہوں اور وہ مجھے فیضان دے رہے ہیں۔ اس اثنا میں "اللہ ھُو" کا ذکر کرے اور جب "ھُو" کی ضرب دل پر لگائے تو اسی ضرب کو اہلِ قبر کی طرف لے جائے اور پھر واپس اپنے دل میں لے آئے۔ اس طرح ذکر کا سلسلہ کچھ دیر چلتا رہے۔ گویا اپنے دل سے صاحب قبر کی طرف اور وہاں سے پھر اپنے دل کی طرف لفظ "ھُو" کو کھینچے۔ بار بار ایسا کرنے سے اہلِ قبور اولیاء فیض دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر کسی سالک کا ظرف بلند ہو تو فیض بھی بہت زیادہ ملتا ہے۔ اس طرح پندرہ منٹ سے آدھ گھنٹہ بیٹھنے کے بعد یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کس نوعیت کا فیض مل رہا ہے۔ اس دوران کبھی اہل قبر سے گفتگو بھی ہو جاتی ہے اور کبھی اس کی شکل بھی نظر آنے لگتی ہے کچھ بزرگوں کو ایسے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک دربار لگا ہوا ہے، جس میں بہت سے بزرگوں کی مجلس ہو رہی ہے۔ کشف القبور کے لئے عموماً کچھ مدت درکار ہوتی ہے۔ ایک دم ایسا کشف ہو جانا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

راقم الحروف نے اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ جو کچھ اہل قبور سے بذریعہ کشف معلوم ہوتا ہے، وہ حقیقت میں ویسے بھی درست ثابت ہوتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم نے اہل قبور کا حال اور کیفیت دیکھی، بعینہٖ وہی کیفیت ہمارے کم سن بچے نے بھی دیکھ کر ہم سے بیان کی۔ اس سلسلہ میں حضرت مجدّد علیہ الرحمۃ کی نزہۃ المجالس کی ایک روایت یاد آتی ہے کہ آپ ایک دن ایک قبرستان سے گزر رہے تھے کہ آپ نے ایک بچے کو قبر کے سامنے روتے ہوئے دیکھا۔ آپ کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اس قبر میں اس کا باپ دفن ہے اور اس پر عذاب ہو رہا ہے۔ حضرت مجدّد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک حدیث کے مطالعہ کے دوران اس بات کا علم ہوا کہ اگر ایک ہزار بار سورۂ اخلاص پڑھ کر کسی میت کے لئے ایصال ثواب کیا جائے تو اس کے لئے عذاب قبر روک دیا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے جب سورۂ اخلاص کے ثواب کا ایصال کیا تو وہ بچہ خاموش ہو گیا اور اس نے بتایا کہ اب اس

کے باپ کو عذاب نہیں ہو رہا۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں اس بچے نے اس حدیث کی تصدیق کر دی اور اس حدیث نے بھی اس بچے کے عمل کی تصدیق کر دی۔ عذاب قبر کو روکنے اور احوال قبر کی خبر دینے والی بہت سی احادیث اور روایات ان تمام باتوں کی تصدیق کرتی ہیں جو کَشْفُ الْقُبُوْر سے معلوم ہوتی ہیں۔

ربط سے معرفت الٰہی ملتی ہے

اَلْمَعْرِفَۃُ وَالْعِرْفَانُ کے معنی ہیں کہ کسی چیز کی علامات اور آثار پر غور و فکر کر کے اس کا ادراک کر لینا۔ امام راغبؒ نے لکھا ہے اس سے مراد کسی چیز کی بو کو پالینا ہے صوفیہ کے نزدیک عارف کا لفظ اس کے لئے بولا جاتا ہے جسے عالم ملکوت اور ذاتِ الٰہی یا کسی چیز کے ساتھ حسن معاملہ کے متعلق خصوصی معرفت حاصل ہو۔ طریق رابطہ میں بھی سالک جب کسی ہستی یا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر مراقب ہوتا ہے تو اپنے ظرف کے مطابق اس کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی مکمل معرفت کا حاصل ہونا کسی انسان کے لئے ممکن نہیں، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معرفتِ الٰہی کے متعلق فرمایا وَمَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ "یعنی اے اللہ ہم تجھے اس طرح نہیں پہچان سکے جس طرح تجھے پہچان لینے کا حق ہے۔ انسان چونکہ اللہ تعالیٰ کا مکمل علم حاصل کرنے کے قابل نہیں کہا اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "فُلَانٌ يَعْرِفُ اللّٰہَ" (یعنی فلاں اللہ کی معرفت رکھتا ہے) اور یوں نہیں جاتا کہ "فُلَانٌ يَعْلَمُ اللّٰہَ" (یعنی فلاں اللہ کا علم رکھتا ہے)۔ انہیں معنوں میں صحابہ کرام فرمایا کرتے تھے "اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ" (یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں) اور ہم یوں نہیں کہہ سکتے کہ "اَللّٰہُ يَعْرِفُ" یعنی اللہ تعالیٰ اس کی معرفت رکھتا ہے۔

طریق رابطہ میں سالک ربط قائم کرنے کے دوران مربوط کی بو پالیتا ہے اور اولیائے کاملین اس بو کے پالینے کے بعد اللہ تعالیٰ (یا مربوط) کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ (جیسے اس کتاب کے قرب کے باب میں یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ) جب شکاری صحرا میں ہرن کے قدموں کے نشان پالینے کے بعد چند قدم ان نشانات پر چلتا ہے تو پھر ہرن کے نافے کی خوشبو اس شکاری کی راہنمائی کرنے لگتی ہے۔ وہ شکاری جس کی قوت شامہ (سونگھنے کی قوت) تیز ہوتی ہے، تھوڑی دیر میں ہی ہرن کا پتا لگا لیتا ہے۔ ایسے ہی اولیائے کاملین تھوڑی دیر میں ہی طریق رابطہ کے ذریعے، معرفت الٰہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اپنے مربوط (جس کے ساتھ رابطہ کیا جائے) کی معرفت حاصل کرنا طریق رابطہ کا ایک ضروری امر ہے، اس لئے مناسب ہو گا کہ معرفت الٰہی کے متعلق اس جگہ چند بزرگوں کے احوال اور اقوال بیان کر دیئے جائیں تاکہ قارئین کو معرفت الٰہی کی اہمیت کا علم ہو سکے۔ معرفت الٰہی کے متعلق باضابطہ بیان انشاء اللہ ہماری تصنیف "اسلام اور روحانیت" میں زیادہ تفصیل کے ساتھ شامل کیا

جائے گا۔

معرفت الٰہی کے متعلق ایک بہت مشہور حدیث میں یوں فرمایا گیا ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ" یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ حضرت داتا گنج بخش" نے کشف المحجوب میں فرمایا ہے جس نے اپنے آپ کو بندہ سمجھا اس نے اللہ تعالیٰ کو رب سمجھا۔ جس نے اپنے نفس کی فنا کو سمجھ لیا اس نے ذات الٰہیہ کو باقی جانا اور جس نے اپنی ذات کو ذلت کے ساتھ جان لیا، اس نے اپنے رب کو عزت کے ساتھ پہچانا۔ علامہ اقبال" کا خیال ہے کہ اگر تم اپنے آپ کو تلاش کرو گے تو تم خدا کو پالو گے اور اگر تم اپنے رب کو تلاش کرو گے تو بالآخر تم خود کے سوا اور کچھ نہ پاسکو گے۔ اس موضوع پر علامہ اقبال" کا کچھ کلام راقم الحروف کی تصنیف "حضور قلب" اور "سرمایۂ ملت" میں بیان ہو چکا ہے اور انشاء اللہ آپ کا مزید کلام "اسلام اور روحانیت" میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

معرفت الٰہی کیا ہے؟

قرآن مجید کی "سورۃ الذاریٰت ، آیت ۵۶" میں جنوں اور انسانوں کی تخلیق کا مقصد لِیَعْبُدُوْنَ یعنی عبادت کرنا فرمایا گیا ہے اور مفسرین کرام نے لِیَعْبُدُوْنَ کے معنی "لِیَعْرِفُوْنَ" کئے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ جنوں اور انسانوں کو اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ سورہ المائدہ کی آیت ۸۳ میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کی آیات جب نازل ہوتی ہیں تو صحابہ کرام نے پہچان لیا کہ یہ کلام حق ہے یعنی معرفت وہ چیز ہے کہ جس کے ذریعے حق اور ناحق کا علم ہو جاتا ہے اور عارف کو بھی حق اور ناحق میں تمیز ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:۔

وَمَا قَدَرُوْا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ (الانعام . ۹۱) اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ کی جیسا حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا۔

اس آیت مقدسہ میں معرفت الٰہی کو بیان کرنا ہی مقصود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ دین کا دارومدار معرفت باللہ، یقین اور ایسی عقل پر ہوتا ہے جو برائیوں سے روکے۔ اس حدیث میں عقل سے مراد یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی سے روکنا اور اللہ کی اطاعت کی خواہش کرنا ہے۔ علمائے کرام "علم" کو بھی معرفت کا ذریعہ کہتے ہیں لہٰذا ہر علم معرفت بھی ہے، چنانچہ سائنس دان جب کسی نئی چیز کو دریافت کرتے ہیں تو ان کو خدا کی معرفت ہی حاصل ہوتی ہے اور کئی سائنس دانوں کو بالآخر یہ کہنا پڑا کہ اے اللہ ہم تیری کائنات کے متعلق جتنا زیادہ علم حاصل کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم تیری قدرت کے خزانوں کے بارے میں اتنا ہی کم جانتے ہیں جتنا کہ ایک بچہ سمندر کے کنارے سمندر کے پتھروں سے کھیلتا ہے۔ صوفیہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی توجہ سے اس کو عارف کر دیتا ہے جو

اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کو پہچانے، اپنے معاملات میں سچا ہو اور آفات نفس سے پاک ہو کر اللہ کے دروازے پر طویل عرصہ کے لئے کھڑا رہا ہو، تب جا کر اللہ تعالیٰ تقدیروں کے ردّ و بدل کا راز اسے بتاتا ہے۔ حضرت شبلیؒ سے جب معرفت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا اس کی ابتداء ذکر سے ہوتی ہے مگر اس کی انتہا کوئی نہیں ہے۔

یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں جب بندہ معرفت حاصل کرنے کی راہ میں ہوتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ اپنے اختیار سے دور رہ یہاں تک کہ تجھے عرفان مل جائے اور جب عارف ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ اب تو کوئی چاہے اختیار کر، یا نہ کر تیری مرضی ہے کیونکہ تیرا اختیار ہمارے (یعنی اللہ کے) اختیار کے ساتھ ہو گا اور تیرا ترک ہمارے اختیار سے ترک ہو گا۔ کہتے ہیں کہ عارف نیکوں کے ساتھ بھی معرفت کا ذکر نہیں کرتا چہ جائے کہ دنیاداروں سے کرے اور اگر عارف رب کی اجازت کے بغیر مخلوق کی طرف متوجہ ہوا تو سمجھو کہ رسوا ہو گیا۔

حضرت محمد بن احمد بن حمدونؒ فرماتے ہیں کہ کمالِ معرفت کا مقام اس وقت آتا ہے جب بندے کے لئے متفرقات ایک ہو جائیں، احوال و مقامات یکساں ہو جائیں اور احساس تمیز مٹ جائے، یعنی بندے کا وقت ایک جیسا ہو (ہر حالت میں اللہ سے لو لگائے رکھے) اور ماسوائے اللہ سے منقطع رہے۔

ابو الحسن نوریؒ کو پوچھا گیا کہ آپ نے اللہ کو کس ذریعے سے پہچانا ہے تو فرمایا کہ اللہ ہی کے ذریعے سے۔ فرمایا عقل تو عاجز ہے لہٰذا کسی عاجز چیز کو نہیں پہچان سکتی ہے۔ جب اللہ نے عقل کو پیدا فرمایا اور پوچھا کہ میں کون ہوں تو عقل خاموش رہی، پھر جب اس کو سرمۂ وحدانیت لگایا گیا تو پکار اٹھی "تو اللہ ہے" یعنی عقل نے بھی اللہ کو اللہ کے ذریعے ہی پہچانا۔

معرفت، آتش شوق اور وجد ہے جب کہ ایمان نور اور عطاو بخشش ہے۔ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے اور عارف اللہ کی آنکھ سے۔ مومن صاحب قلب ہوتا ہے اور عارف قلب نہیں رکھتا۔ مومن خدا کے ذکر سے مطمئن ہو جاتا ہے اور عارف کو سوائے محبوب ازلی کے قرار نہیں ملتا، گویا ایک ذکر حبیب میں محو ہے تو دوسرا رخ یار کے مشاہدے سے شاد کام ہے۔

سیرِ زاہد ہر مہے تا پیش گاہ
سیرِ عارف ہر دمے تا تختِ شاہ

(زاہد ہر مہینے قصر شاہی کے سامنے پہنچتا ہے اور عارف ہر دم بارگاہ الٰہی تک پہنچ جاتا ہے)

منقول ہے کہ جب ابراہیم بن ادھمؒ نے بلخ کی بادشاہت مردانہ وار چھوڑی اور معرفتِ الٰہی کے راستے میں قدم رکھا تو امام ابو حنیفہؒ جو دنیا بھر کے مقتدا تھے، کی خدمت میں حاضری دی۔ امام صاحبؒ نے آپ کا استقبال کیا حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے فرمایا "اے امامؒ میرے حق میں کیا ارشاد ہے کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟" امام صاحبؒ نے جواب دیا "تمہیں علم حاصل کرنا

چاہئے"۔ حضرت ابراہیم بن ادھم نے جواب دیا کہ ایک حدیث میں ہے کہ

تَرْكُ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ عِبَادَةٍ وَحُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ	دنیا کو ترک کرنا ہر عبادت کی بنیاد ہے اور دنیا کی محبت ہر گناہ کی اصل ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے فرمایا "ہم نے تو اس حدیث پر عمل کیا ہے۔ فرمایا تم کو اتنا علم ملا بھلا بتلاؤ تم نے بھی کوئی کام کیا ہے" امام صاحبؒ یہ بات سن کر مدہوش ہو گئے اور کچھ دیر بعد جب ہوش میں آئے تو فرمایا "تمہیں تحصیل علم کی ضرورت نہیں۔ اہل معرفت کی صحبت اختیار کرو"۔

معرفت کی قسمیں

معرفت کی درج ذیل دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔

i ۔ **معرفت نظری**۔ یہ وہ معرفت ہے جس میں کسی چیز کی علامت اور آثار میں فکر و نظر یا غور و تدبر کرنے سے اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ امداد السلوک میں ہے کہ معرفت اللہ کی طرف سے ہدایت ہے اور اس (کی پہلی قسم یعنی معرفت نظری) کا دوسرا نام معرفت استدلالی ہے کیونکہ اس معرفت میں دنیا کی اشیاء کو دیکھ کر اللہ تک رسائی حاصل کر لی جاتی ہے جیسا کہ فرمایا۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (حمٓ السجدہ: ۳۵)	عنقریب ہم دکھائیں گے ان کو اپنی قدرت کی نشانیاں اطراف زمین اور آسمان میں اور خود ان کے نفسوں میں تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ وہ سچ ہے

معرفت کی یہ قسم اہل علم اور علمائے راسخین کو حاصل ہے کیونکہ وہ دنیا کی نشانیوں کے ذریعے اللہ تک راستہ پاتے ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ظاہری عالم (کائنات) کو اپنی معرفت کی دلیل بنایا ہے اسی طرح انسان میں موجود عالمِ باطن کو بھی دلیل معرفت بنایا ہے کیونکہ ظاہر میں دلیل ہو اور باطن میں دلیل نہ ہو تو اس سے دلیل میں تعطل کا ہونا ثابت ہوتا ہے، چنانچہ ایسی دلیل کو دلیل نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن مجید میں ہے کہ جس کا باطن نور مشاہدہ سے منور نہیں وہ اندھا ہے جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہے۔ جو شخص اطاعتِ نفس میں لگا رہتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اپنے مشاہدہ سے دور کر دیتا ہے۔

ii ۔ **معرفت شہودی**۔ معرفت شہودی یہ ہے کہ بغیر استدلال یعنی بغیر غور و فکر کے پہلی ہی نظر میں اس چیز کی معرفت حاصل کر لے۔ یہ درجہ صدیقین کا ہے۔ اس معرفت کا نام یقین اور احسان بھی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ داؤد علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اے داؤد جانتے ہو کہ میری

معرفت کیا ہے؟ تو آپ نے عرض کی نہیں! تو ارشاد ہوا

وَهُوَ حَيَاةُ الْقَلْبِ بِمُشَاهِدَتِیْ (کشف المحجوب) یعنی وہ قلب کی حیات ہے میرے مشاہدے سے۔

قرب اور معرفت

قرب الٰہی سے مراد قرب عرفانی ہے اور عرفان جتنا ہو گا قرب میں اتنی ہی ترقی ہو گی۔ قرب کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ جتنا اللہ کی صفات یا اخلاق کو اپناؤ گے اتنا ہی قرب ہو گا جیسے کہ اللہ نے ارشاد فرمایا۔

تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (الحدیث) یعنی اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے اپنے آپ کو متصف کر لو۔

صفات الٰہی کی دو قسمیں ہیں۔ i ۔ اللہ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ نیک و بد پر یکساں مہربان ہے جیسے رحمٰن کی صفت سے متصور ہے۔ ii دوسری صفت یہ ہے کہ وہ نیکوں پر بدوں کی نسبت زیادہ مہربان ہے۔ جیسا کہ رحیم کی صفت سے متصور ہے، لیکن بسم اللہ شریف میں دونوں صفات الٰہیہ، رحمٰن اور رحیم موجود ہیں اور عرفان یہ ہے کہ تمام علم بسم اللہ کی "ب" کے نقطے میں موجود ہے۔ عشق بھی عرفان سے پیدا ہوتا ہے اور اس لئے عشق کی کوئی انتہا نہیں یعنی جوں جوں عشق بڑھتا جاتا ہے عرفان میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے اور جب عرفان کی کوئی انتہا نہیں تو عشق کی بھی کوئی انتہا ممکن نہیں۔

عرفان الٰہی پانے والے خوش نصیب

کتب تصوف ایسی عظیم شخصیات کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں جن کو اپنے اپنے ظرف اور استعداد کے مطابق معرفت الٰہی نصیب ہوئی۔ طوالت کے خوف سے صرف چند ایک مثالیں جو کیمیائے سعادت سے ماخوذ ہیں، پر اکتفا کیا جا رہا ہے تاکہ ایسے عارفین کی روایات، حالات اور احوال کو سن کر معرفت کی بات سمجھ میں آجائے۔

احادیث میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دوسرے صحابہ پر نماز روزے کی وجہ سے فضیلت نہیں ملی بلکہ ایک پوشیدہ راز کی وجہ سے ملی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے مراد یہ تھی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی معرفت باقی تمام صحابہؓ سے زیادہ تھی۔ ایک حدیث میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ

کی ایک تجلی تو عوام کے لئے ہوگی اور ایک جلوہ وہ بھی ہو گا جو خاص ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے ہو گا۔ اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ جو لذت دیدار حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہوگی وہ دوسروں کو میسر نہیں ہوگی کیونکہ لذت دیدار کا انحصار حاصل کردہ معرفت کی بلندی کے مطابق ہو گا۔

حضرت معروف کرخیؒ دنیا سے متنفر ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ جب لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ گوشہ نشینی دوزخ کے خوف اور جنت کے حصول کی خاطر کی ہے تو آپؒ نے فرمایا یہ بھی کوئی چیزیں ہیں؟ اگر تم بادشاہ حقیقی کی دوستی کی لذت چکھ لو تو ان تمام باتوں کو بھول جاؤ۔ معرفت الٰہی کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں آسکتی۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ عَلی اِبنُ المُوَفّق ؒ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں بے شمار لوگوں کو جنت میں کھانا کھاتے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ایک شخص کھانا نہیں کھا رہا بلکہ اپنی مبہوت آنکھیں کھول کر اللہ کی طرف نظر جمائے ہوئے تھا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے رضوان سے پوچھا کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ تو فرمایا یہ معروف کرخیؒ ہیں اور ان کو اپنے شوق دیدار اور عشق الٰہی کے باعث اللہ کی طرف یوں دیکھتے رہنا مباح کر دیا گیا ہے۔

حضرت بشر حافیؒ کو ان کے وصال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ ابو نصر تمارؒ اور عبدالوہاب ورّاقؒ کا کیا حال ہے۔ فرمانے لگے ابھی ابھی میں انہیں جنت میں چھوڑ کر آیا ہوں وہ بہشتی کھانے کھا رہے تھے۔ جب پوچھا گیا کہ آپ کا کیا حال ہے تو فرمایا اللہ جانتا ہے کہ مجھے کھانے پینے سے کوئی غرض نہیں مجھے تو اللہ کا دیدار ہی کافی ہے اور وہ مجھے میسر ہے۔

ابو سلیمان درانیؒ فرماتے ہیں کہ جو آج اپنے آپ میں اور دنیا میں مصروف ہے وہ قیامت کے دن بھی اپنے (پچھتاوے) میں مصروف ہو گا اور جو آج حق تعالیٰ میں مصروف ہے قیامت کے دن بھی اللہ کے دیدار میں مصروف ہو گا۔

یحیٰ بن معاذؒ نقل کرتے ہیں کہ ایک رات انہوں نے دیکھا کہ بایزید بسطامیؒ نے ایک بہت طویل سجدہ کیا اور پھر اٹھے تو اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے اور اپنی مبہوت آنکھیں کھول کر تمام رات اسی طرح کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتے رہے۔ میں ان کی باتیں سنتا رہا۔ جب انہوں نے مڑ کر مجھے دیکھا تو میں نے عرض کیا کہ اپنے احوال کے متعلق مجھے بھی کچھ بتائیں۔ فرمایا تیرے حال کے متعلق جو بات ہے صرف وہی تجھے بتاتا ہوں۔ پھر فرمایا آج اللہ تعالیٰ نے مجھے ملکوت اسفل سے ملکوت اعلیٰ تک سب کچھ دکھایا اور پوچھا مانگو کیا مانگتے ہو! میں نے عرض کیا بارِ خدایا مجھے ان چیزوں میں سے جو تو نے مجھے دکھائی ہیں کچھ نہیں چاہئے، تب ارشاد ہوا "بے شک تو میرا اور صرف میرا بندہ ہے"

حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ اگر تجھے خلّتِ ابراہیم علیہ السلام، مناجاتِ موسیٰ علیہ السلام اور روحانیتِ عیسیٰ علیہ السلام بھی عطا ہو جائے تو خدا سے منہ نہ موڑ کیونکہ وہ ان تمام چیزوں سے بڑھ کر کام رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی فرمائی کہ جب میں کسی بندے کے دل کی طرف دیکھتا ہوں کہ اس میں نہ طلب دنیا ہے اور نہ طلب آخرت تو اپنی محبت کو اس میں موجود پاتا ہوں۔ پھر اس کی حفاظت بھی خود ہی کرتا ہوں۔ رابعہ بصری ؒ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کیسی ہے؟ تو کہا کہ بے حد مشکل لیکن محبت الٰہی نے مجھے دوستی خلق سے بے نیاز کر دیا ہے۔

امام غزالی ؒ نے اپنی مشہور کتاب (کیمیائے سعادت) میں ایک واقعہ لکھا ہے (جس کی روایت قوت القلوب کی عبارت سے ذرا مختلف ہے) وہ یہ کہ ابو تراب نخشبی ؒ کا ایک مرید انتہائی استغراق کی حالت میں رہتا تھا ایک روز آپ نے فرمایا کہ ابو یزید ؒ کا دیدار عین روا ہے۔ بولا کہ ہو گا مگر میں تو دیدار الٰہی میں مشغول ہوں۔ ایک دن پھر یہی بات ہوئی اور مرید نے کہا کہ میں تو ستر بار اللہ کا دیدار کر چکا ہوں، ابو یزیدؒ کو کیا کروں؟ ابو تراب ؒ نے فرمایا اگر تم ایک بار ابو یزید ؒ کو دیکھ لو تو وہ خدا کو ستر بار دیکھنے سے بہتر ہے۔ مرید یہ سن کر سناٹے میں آگیا اور کہا کہ آپ نے یہ کیسے کہہ دیا؟ فرمایا کہ تو خدا کو اپنی بساط کے مطابق دیکھتا ہے اور اگر تم بایزید ؒ کو دیکھو تو خدا کو ان کی بساط کے مطابق جلوہ فرما پاؤ گے۔ مرید کو یہ بات سمجھ میں آگئی اور کہا کہ چلئے ابھی چلئے۔ جب وہ ایک ٹیلے پر پہنچے جہاں ابو یزید ؒ ایک حجرہ سے باہر نکل رہے تھے تو مرید نے ان کو دیکھا اور ایک نعرہ مارا اور اپنی جان دے دی۔ ابو تراب ؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ بایزید ؒ کی ایک نگاہ نے اسے مار ڈالا تو حضرت ابو یزید ؒ نے فرمایا نہیں! بلکہ یہ مرید اپنے قول میں سچا تھا اور اس کے اندر ایک راز پنہاں تھا جو اس پر اپنی قوت سے آشکار نہیں ہو رہا تھا۔ جب اس نے ہمیں دیکھا تو یہ راز آشکار ہو گیا اور وہ بیچارا چونکہ ضعیف تھا اس کی تاب نہ لا سکا اور ہلاک ہو گیا۔

معرفت پر مشائخ کے اقوال

ایک حدیث پاک میں ہے کہ ہر چیز کی ایک معدن (کان) ہے اور تقویٰ کی معدن صاحب معرفت کا دل ہے۔ اسی واسطے ان لوگوں کا نام عارف رکھا گیا ہے۔ کتب تصوف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بعض صوفیاء معرفت اس کو کہتے ہیں کہ جس کے دل پر معلوم حقیقی یعنی اللہ جل شانہ کے علوم پے در پے وارد ہوتے ہوں اور اس کی عقل بالکل زائل ہو جائے اور ان علوم کے آثار اس پر ظاہر ہو جائیں۔ مشائخ کرام کے اقوال میں سے ہے کہ جس کو معرفت حاصل نہ ہو اسے چاہئے کہ چپ رہے مبادا کہ خلاف ادب کوئی بات کہہ دے اور جس کو معرفت حاصل ہو گی اس پر خود بخود سکوت لازم آجاتا ہے کیونکہ بے کیف ذات کا حال بیان ہو ہی نہیں سکتا اسی لئے کہا گیا ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ کَلَّ لِسَانُہٗ یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ مشائخ کا تجربہ ہے کہ مناظرہ سے قلب سخت ہوتا ہے، لہٰذا کسی سے بحث مباحثہ نہ کرے کیونکہ اس سے للّٰہیت ختم ہو جاتی ہے اور

نفسانیت اور انانیت آجاتی ہے۔ بحث و مباحثہ میں بسا اوقات انسان اپنے نظریئے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے غلط، ناجائز اور کبھی کفریہ کلمات بھی کہہ جاتا ہے۔ جب دیکھو کہ بحث غلط انداز میں شروع ہو گئی ہے تو فوراً موضوع گفتگو کو بدل دو۔

صوفیائے کرام نے کہا ہے کہ جس نے اللہ کو پہچان لیا اس پر دنیا باوجود وسعت کے تنگ ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی پاک ہو جاتی ہے۔ زندگی میں مزہ معلوم ہوتا ہے ہر چیز اس سے ڈرتی ہے مخلوق کا خوف اس سے جاتا رہتا ہے اور وہ اللہ کے ساتھ انس محسوس کرتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ معرفت سے حیا اور تعظیم پیدا ہوتی ہے جس طرح توحید سے رضا و تسلیم پیدا ہوتی ہے عارف کو دنیا کی کوئی خواہش نہیں رہتی اور اس کے لئے جدائی اور وصل کوئی چیز نہیں۔

معرفت کے موضوع پر مشائخ کرام نے کچھ حیرت انگیز نکات کو اپنے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے کلام میں الگ لذت اور شرینی پائی جاتی ہے۔ مناسب ہو گا کہ قارئین کرام کو بھی ان کے ارشادات سے محظوظ کیا جائے، چنانچہ چند مشائخ کرام کے اقوال نیچے پیش کئے جا رہے ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ نے فرمایا "پاک ہے وہ ذات جس نے بندوں کو اپنی معرفت کے متعلق اس سے سوا نہیں بتایا کہ وہ اسے اپنی عقل قاصر سے ہی پہچانیں۔ فرمایا جس نے معرفت حق کو جان لیا اس کو فاقہ اور وحشت ہرگز نہ پہنچے گی اس لئے کہ وہ ہر دم اللہ کے ساتھ ہے اور اسی میں محو ہے۔

۲۔ بایزید بسطامیؒ

فرماتے ہیں کہ عارف نیند اور بیداری میں اللہ کے سوا کچھ نہیں دیکھتا وہ غیر اللہ کی نہ موافقت کرتا ہے نہ مطالعہ۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ معرفت کی حقیقت کیا ہے تو فرمایا "ذکر الٰہی کے باعث حیرت اور پریشانی"۔ یعنی ذاکر خود کو مذکور یعنی ذات حق تعالیٰ میں کمال حضور کے سبب اپنے ذکر کو بھی حیرانی تصور کرتا ہے۔ جہل کے متعلق آپ سے سوال کیا گیا تو فرمایا "اللہ کی یاد سے غفلت کا نام جہل ہے"۔

۳۔ حضرت ابو ترابؒ

آپ سے کسی نے پوچھا کہ عارف کی علامت کیا ہے؟ فرمایا جسے کوئی چیز مکدر نہ کر سکے لیکن ہر چیز اس سے صفائی حاصل کرے۔

۴۔ ابو عثمان مغربیؒ

آپ فرماتے ہیں کہ عارف کے لئے علم کے انوار روشن ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ غیب کی عجیب و غریب باتیں دیکھ لیتا ہے۔

۵۔ ابو یحییٰ بن معاذؒ

آپ نے فرمایا ہے کہ عارف مخلوق کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ ہوتے ہیں۔

۶۔ ابو سعید خرازؒ

آپ نے فرمایا کہ معرفت اپنی طرف سے پوری کوشش کرنے اور سخاوت ایزدی (عطا) سے حاصل ہوتی ہے۔ آپ نے معرفت کے متعلق یوں بھی فرمایا ہے کہ معرفت کے سرچشمے دو ہیں، ایک آنسو بہانا اور دوسرا مقدور بھر مجاہدہ کرنا۔

۷۔ ابوالحسن نوریؒ

آپ سے جب پوچھا گیا کہ اللہ کو عقل پا بھی نہیں سکتی اور عقل کے بغیر وہ جانا بھی نہیں جا سکتا تو اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ محدود غیر محدود کو، مکلّف غیر مکلّف کو اور کیف والا بے کیف کو کیسے پا سکتا ہے۔ کیف و کوائف، زمان و مکان اور اول و اولیت کو پیدا کرنے والا ان چیزوں کے احاطے میں کیسے آ سکتا ہے۔ البتہ وہ کبھی وصل سے نوازتا ہے اور کبھی ہجر سے تاکہ تجدید لذت کا کام جاری رہے۔ اسی لئے وہ مشاہدے سے نہیں بلکہ صفت تخلیق سے پہچانا جاتا ہے۔

۸۔ احمد بن عطاءؒ

آپ کے فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کو خدا کے سوا کسی نے نہیں جانا اور نہ ہی کسی نے اس کے سوا اس کو چاہا ہے کیونکہ اس کی صمدیت (بے نیازی) احاطہ اور ادراک کو روکے ہوئے ہے۔ فرمایا کہ عارف ایک بندہ ہی تھا جو ظاہر ہو گیا (یعنی ممتاز ہو گیا)۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

آہ یہ تو نے کیا کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا — میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

۹۔ حضرت رویمؒ

آپ فرماتے ہیں کہ معرفت عارف کے لئے آئینہ ہوتی ہے جب عارف اس میں دیکھتا ہے تو اسے اپنا خدا نظر آتا ہے فرمایا عارفین کی ریا مریدین کے اخلاص سے بہتر ہے۔

۱۰۔ ابو علی دقاقؒ

فرماتے ہیں کہ دل میں ہیبت الٰہی کا پایا جانا اور دل میں سکون ہونا معرفت کی علامت ہے۔ جس قدر زیادہ ہیبت ہوگی معرفت بھی اسی قدر زیادہ ہوگی اور اتنا ہی زیادہ دلی سکون ہوگا۔

۱۱۔ حضرت شبلیؒ

فرماتے ہیں کہ عارف کا بجز اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، نہ ہی اس کو اللہ سے کوئی شکایت ہوتی ہے، نہ اسے اللہ کے بغیر قرار آتا ہے اور نہ ہی اللہ سے اسے فرار ہوتا ہے۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ بندہ مشاہدے پر کب فائز ہوتا ہے فرمایا جب شاہد (اللہ) ظاہر ہو جائے، شواہد فنا ہو جائیں، حواس جاتے رہیں اور احساس مضمحل پڑ جائے۔

۱۲۔ حضرت ابوالحفصؒ

آپ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے اللہ کو پہچانا میرے دل میں ہر کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔

۱۳۔ ذوالنون مصریؒ

فرماتے ہیں کہ عارف کے ساتھ میل جول رکھنا اسی طرح ہے جس طرح اللہ کے ساتھ میل جول رکھنا ہے، کیونکہ وہ اخلاق خداوندی سے موصوف ہونا چاہتا ہے فرماتے ہیں کہ ہر چیز کے لئے سزا ہے اور عارف کی سزا یہ ہے کہ وہ ذکر سے منقطع کر دیا جائے۔

۱۴۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں کہ معرفت خداوندی کی اساس یہی ہے کہ بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور قدرتوں کا مکمل احساس ہو اور اگر ایسا ہو تو اس کو یقین ہو جائے گا کہ اللہ اس پر شاہد ہے اور اس کے علم میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ ایسے یقین کے بعد اس کی عقل کامل اور عزم درست ہو جائے گا اور اسے محاسبہ کا مرتبہ مل جائے گا اور اللہ کی معرفت حاصل ہو جائے گی۔ اس کے ہر عمل میں اللہ کا

خوف پیدا ہو جائے گا اور وہ اللہ کے ساتھ رہے گا۔ اس کے دل کی نگرانی کی جائے گی اور وہ لاحاصل مقاصد سے الگ ہو جائے گا۔ جب اسے اللہ کا قرب حاصل ہو گا تو اسے اللہ سے شرم محسوس ہو گی اور وہ پسندیدہ اعمال بجالائے گا اور اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو گی جس سے اللہ تعالیٰ کی آگہی کا خیال پہلے سے اس کے دل میں موجود نہ ہو۔

حضرت شہاب الدین سہروردیؒ

آپ نے فرمایا کہ زاہدین کے زندگی بسر کرنے کے تمام احوال کا علم ہونا علم معرفت ہے۔ اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ جب زاہدین کی زندگی کے احوال معلوم ہوں تو ہر شخص کے دل میں ایسی زندگی بسر کرنے کی امنگ پیدا ہو گی۔

۱۵۔ حسین بن منصورؒ

اللہ تعالیٰ خواطر کے ذریعے عارف پر وحی نازل فرماتا ہے اور برے خیال اس کے نزدیک نہیں آتے اور اس کے باطن کی حفاظت کرتا ہے تاکہ اس میں ماسوا کا خیال نہ آئے۔

۱۶۔ ابو طیبؒ

فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا انسان کے باطن پر مسلسل انوار سے طلوع ہونا معرفت کہلاتا ہے کہا جاتا ہے کہ عارف جو کچھ کہتا ہے وہ اس سے بلند تر ہوتا ہے اور عالم جو کچھ کہتا اس کا درجہ اس سے کم تر ہوتا ہے۔

۱۷۔ ابو سلیمان درانیؒ

فرماتے ہیں کہ عارف کے لئے اللہ تعالیٰ بستر پر وہ چیزیں کھول دیتا ہے جو اوروں کو نماز میں بھی نہیں کھلتیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ خلق کے اعمال اللہ تعالیٰ کو راضی یا ناراض نہیں کرتے۔ وہ جس سے راضی ہو جائے اسے ایسے اعمال میں لگا دیتا ہے جو اس کی رضا کا باعث ہوتے ہیں اور جس سے ناراض ہو اسے ایسے کاموں میں لگا دیتا ہے جو اس کی ناراضگی کا باعث بنتے ہیں۔

۱۸۔ جنید بغدادیؒ

آپ فرماتے ہیں کہ عارف وہ ہے جو خود تو خاموش رہے اور حق تعالیٰ اس کے اسرار بیان کرے۔ فرماتے ہیں کہ عارف اپنے وقت کے حکم کے ماتحت ہوتا ہے کیونکہ پانی کا رنگ وہی ہوتا ہے جو اس کے برتن کا

ہوتا ہے۔ اسی طرح عارف کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ہی کیفیت رہتی ہے۔ خواہ احوال یا اوقات بدلتے رہیں۔ جب پوچھا گیا کہ عارفین اللہ سے کیا چاہتے ہیں فرمایا اپنے لئے حفاظت اور پناہ طلب کرتے ہیں۔

۱۹۔ حضرت واسطیؒ

خبر سے کسی چیز کو جاننا علم ہے اور حس سے معلوم کرنا معرفت ہے۔ معرفت چونکہ غفلت کے بعد ہوتی ہے اس لئے اللہ کے لئے معرفت کا اطلاق نہیں ہوتا کہ اسے عارف کہا جائے کیونکہ اس کا علم قدیم ہے فرمایا کہ جس نے اللہ کو پہچان لیا وہ غیر اللہ سے منقطع ہو گیا۔

۲۰۔ سُہیل تستریؒ

نفس کو گندگیوں سے پاک کر کے اوامر و نواہی کی پابندی لازم کرنا، سنت کی اقتدا اور ادب کی رعایت رکھ کر اپنے صاف ستھرے نفس کو بارگاہ الٰہی کا مقرب بنانا معرفت ہے۔

۲۱۔ ابن عطاءؒ

حق تعالیٰ سے ایسا معاملہ رکھے کہ اس کے انعامات اور عنایات مثلاً ہوا میں اڑنا، پانی پر چلنا وغیرہ کو عجب بات محسوس نہ کرے کیونکہ حق تعالیٰ کا ہر کام اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔

۲۲۔ حضرت شبلیؒ

اپنے اعمال اور ماسویٰ اللہ پر نظر نہ ڈالنا کامل معرفت ہے۔ آخرت میں اللہ کا دیدار ایسے ہی ہو گا جیسے دنیا میں معرفت حاصل تھی کیونکہ وہ اطراف و جوانب اور حد اور تناہی جسمیت سے پاک ہے

۲۳۔ احمد بن یحییٰ بن الجلالؒ

عارف کے تمام ارادے اور قوتیں اس کے مولا کی طرف موقوف ہوں تو وہ ہرگز اپنے مولا کے حکم کے بغیر کسی طرف رجوع نہیں کرتا۔

۲۴۔ حضرت علی ہجویریؒ

حضرت علی ہجویریؒ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ کی تشریحات سے مراد معرفت انسانیت ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ آدمی کا نفس ایک آئینہ معرفت الٰہی ہے، جو کوئی

اس میں دیکھے، وہ حق تعالیٰ کو دیکھتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "معرفت علم شریعت جانے بغیر صحیح نہیں اور اتباع شریعت بغیر مقامات رشد وہدایت (یعنی طریقت) جانے نہیں ہو سکتی ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا والی حدیث میں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کائنات کا سبب اپنی پہچان کرانا قرار دیا ہے یعنی میں (اللہ تعالیٰ) ایک مخفی خزانہ تھا پھر میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں اپنی صفات رزاقی، رحیمی، غفاری، ستاری وغیرہ سے اور یہ اس وقت ہی ممکن تھا اگر مخلوق کو پیدا کیا جاتا۔ چنانچہ اس حدیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آخر وہ اپنی صفات سے اسی وقت پہچانا گیا جب اس نے مخلوق کو پیدا فرمایا۔ گویا تخلیق کائنات کا مقصد اللہ کی معرفت حاصل کرنا ہے اور صفات کے ذریعے ہی معرفت ہو سکتی ہے۔

معرفت پر مذکورہ بالا گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت کا خواہشمند ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا رویہ اختیار کرے اور محبت کی علامت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات پر نظر رکھے، اتباع شریعت کا اہتمام کرے اور اولیائے کرام کی صحبت اختیار کرے تاکہ اس کی روحانی معاملات میں راہنمائی ہو سکے۔ ایک حدیث شریف کو حضرت مخدوم علی الہجویریؒ نے کشف المحجوب میں نقل کیا ہے کہ اپنے پیٹوں کو بھوکا اور جگروں کو پیاسا رکھو تاکہ اللہ تعالیٰ کے نور کا مشاہدہ کر سکو۔ صوفیہ کا خیال ہے کہ بزرگوں سے خالی پیٹ توجہ لی جائے یا مریدین کو اس حالت میں توجہ دی جائے تو اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

تعینات کے فہم کے بغیر عرفانِ الٰہی میں ترقی ممکن نہیں

اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ عالم مثال (META PHYSICAL WORLD) میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس وقوع کو عالم مثال میں دیکھ لیتے ہیں۔ خواب کی حالت میں جب کوئی چیز دیکھی جائے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے کا تعلق آنکھ سے نہیں ہوتا بلکہ اسے روح کے ذریعے دیکھا جاتا ہے۔ حقیقتاً دیکھنے والی چیز روح بھی نہیں بلکہ دیکھنے والی چیز "انا" ہے جو "حقیقی انا" کی بازگشت (رجوع کرنا یا لوٹ آنا) ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ میری روح میرا جسم اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں آپ کی ہیں مگر آپ کچھ اور ہیں۔ روح سے مراد بھی آپ نہیں کیونکہ اس کو آپ کی روح کہا جاتا ہے اور خالی جسم ہو تو بھی یہ آپ کی میت ہی کہلائے گی۔ جو جسم کا روح سے تعلق ہے وہی روح کا آپ کے ساتھ تعلق ہے۔ جس طرح جسم روح کا لباس ہے اسی طرح روح بھی "انا" کا لباس ہے اور "انا" جب "انائے حقیقی" کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو تمام راز کھلنے لگ جاتے ہیں اور ہر چیز کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ انسان کے جسم میں ایک مُضغہ (گوشت کا لوتھڑا) ہے اس مضغہ میں نورانی دل ہے۔ جس کو فواد کہتے ہیں اور فواد میں روح ہے اور روح میں سر ہے اور سِر میں خفی ہے اور خفی میں اخفیٰ ہے اور اخفیٰ میں "انا" ہے۔ اس "انا" سے اشارہ ہے

ذات مطلق (اللہ) کی طرف۔ بندہ میں جو انانیت ہے وہ "انائے حقیقی" کی بازگشت ہے۔

تعینات کی اقسام:

"انا" کو سمجھنے کے لئے تعینات کو سمجھنا ضروری ہے۔ تعینات تعین کی جمع ہے جس کا معنی ہے حق کا اپنی ذات کو پانا۔ تعینات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تعینات داخلی اور دوسری تعینات خارجی

۱۔ تعیّنات داخلی۔ تعینات داخلی بھی دو قسم پر ہیں۔

i ۔ اجمالی۔ یہ تعین اول ہے یعنی یہ وہ وحدت ہے جہاں اللہ نے اپنے وجود کو پایا اور فرمایا "انا"

ii ۔ تفصیلی۔ یہ وہ تعین ہے جہاں ذات باری تعالیٰ نے اپنی ذات میں اپنی صفات کو پایا۔

تعیناتِ خارجی

تعینات خارجی وہ تعینات ہوتے ہیں جو بطور اسماء و صفات و افعال کے ظہور میں آئیں، مثلاً ارواح، امثال اور اجسام وغیرہ۔ کسی چیز کا تعین کرنا ہو تو عام طور پر باعتبار تعینات ہم "من و تو" کہہ دیتے ہیں، لیکن اس سے اطلاق (مراد) هُوَ (وہ اللہ) ہے۔ چنانچہ "انا" کے کہنے سے انانیت حق تعالیٰ کی خبر ملتی ہے اور حق تعالیٰ کی جانب سے اس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ عارف اس مقام پر حق تعالیٰ میں فنا ہوتا ہے۔ وہ "هُوَالْحَقّ" کہے یا "اَنَاالْحَقّ" کہے تعبیر دونوں کی ایک ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ تعین کے دور کرنے سے "اَنَا" اور "هُوَ" ہم معنی ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کہیں اپنے لئے صیغۂ جمع استعمال کرتا ہے اور کہیں صیغۂ واحد استعمال کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ تجرد ذات (یعنی فقط اپنی ذات کے اعتبار) کے ساتھ کلام فرماتا ہے تو واحد کا صیغہ استعمال فرماتا ہے اور جب ذات اور صفات کے ساتھ کلام کرے تو "نَحْنُ" یعنی جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ سے مراد یہ ہے کہ ہم ذات اور صفات کے ساتھ اس کی شہ رگ کے قریب ہیں۔

حصول مقصد کے لئے تعینات کا ہونا ضروری ہے۔ فنا بغیر تعینات کے نہیں حاصل ہو سکتی کیونکہ فنا ہونے کے لئے کوئی نہ کوئی وجود ضروری ہے۔ اگر ایک پتھر کو سمندر میں پھینکا جائے تو ہم کہیں گے کہ پتھر سمندر میں فنا ہو گیا لیکن سارے سمندر میں تو فنا نہیں ہوا بلکہ اس سمندر کے ایک حصے میں فنا ہوا ہے۔ اسی طرح فنا فی الذات باری تعالیٰ ہونے کے لئے تعین شیخ اور تعین رسالت کی ضرورت ہے۔ تعینات کے باعث انسان حفظ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور عشق میں ڈوب کر اپنی طاقت بڑھاتا

ہے جس سے عرفان میں ترقی ہوتی ہے۔

قُمْ بِاِذْنِیْ وَقُمْ بِاِذْنِ اللہ ہر دو نغمہ آمد از لبِ یار

(میرے حکم سے اٹھو (کہا جائے) یا اللہ کے حکم سے اٹھو (کہا جائے) ہر دو حال میں اسی یار (یعنی اللہ تعالیٰ) کے لبوں سے ایک نغمہ ہے)

قُمْ بِاِذْنِیْ اور قُمْ بِاِذْنِ اللہِ میں جو فرق رکھا گیا ہے اسے اس کتاب کے "غرض تالیف" میں مکاشفہ ذاتی کے عنوان میں بیان کیا جا چکا ہے۔

عارف کے قلب کی وسعتیں

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ اگر عرش اور جو کچھ عرش میں ہے اس کو عارف کے گوشۂ دل میں رکھ دیا جائے تو عارف کو قلب کی فراخی کے باعث کچھ محسوس نہ ہو گا۔

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ مکتوبات شریف میں فرماتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ اس بات کی تائید کرتے ہیں اور دلیل سے ثابت کرتے ہیں کہ جب حادث قدیم کے ساتھ مل جاتا ہے تو اس کا اپنا اثر ختم ہو جاتا ہے یعنی عرش اور مافیہا حادث ہے اور عارف کا قلب جو انوار قدم کے ظہور کا محل ہے، جب اس حادث کو قدیم کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوتا ہے تو عرش و مافیہا فانی اور ناچیز ہو جاتے ہیں، تو پھر حادث کس طرح محسوس ہو سکے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں "اس فقیر کے نزدیک جو جذبات الٰہی سے تربیت یافتہ ہے یہ کہتا ہے کہ عارف کا قلب جب اپنی خاص استعداد کے موافق غایت و نہایت النہایت تک پہنچ جاتا ہے اور وہ قابلیت پیدا کر لیتا ہے جس سے بڑھ کر کوئی اور کمال متصور نہیں ہو سکتا تو عارف کے دل میں اس بات کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے کہ عرش کے انوار کے بے نہایت لمعات میں سے ایک لمعہ اس پر فائز ہو۔ اس لمعہ کو ان لمعات کے ساتھ وہ نسبت ہوتی ہے جو قطرہ کو دریائے محیط اور بحر بیکراں کے ساتھ ہوتی ہے۔ (مکتوب نمبر ۱۰، دفتر دوم حصہ اول، صفحہ ۹۴۴)

حضرت مجدد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ یہ بزرگ لوگ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے ہم نشین ہیں اور یہ حق تعالیٰ کا ذکر کرنے والی وہ قوم ہے جس کا ہم نشین بد بخت نہیں ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار پر نصرت اور کامیابی کے لئے فقراء اور مہاجرین کے طفیل حق تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے۔ ان بزرگوں کی رضا کو حق تعالیٰ کی رضا کا وسیلہ بنائیں۔ نجات اور فلاح کا طریقہ یہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اہل اللہ کا وجود درحقیقت کرامتوں میں سے ایک کرامت ہے اور ان کی دعوت الی الحق، رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے۔ مردہ دلوں کو زندہ کرنا ان کی عظیم نشانیوں میں سے ہے۔ یہ لوگ اہل زمین کے لئے باعث امن ہیں۔

رابطۂ شیخ میں کامیابی کی علامات

شیخ سے رابطہ قائم کرنا ہر چھوٹے بڑے مرید کے بس کی بات نہیں۔ ویسے تو عام پاکستانی اور دیگر مسلم ممالک کے لوگ بیعت میں ہی بہت کم دلچسپی رکھتے ہیں لیکن جو لوگ بیعت کی سعادت حاصل کر بھی لیتے ہیں ان میں سے شاید ایک فیصد لوگ ہی ایسے ہوتے ہیں جو اپنے شیخ کے ساتھ رابطہ استوار کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں، ورنہ اکثر مرید تو فقط رسمی طور پر بیعت کے بندھن میں منسلک ہو جاتے ہیں اور بیعت کی افادیت سے قطعاً نابلد رہتے ہیں۔ یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ جو لوگ پیروں کے آستانوں پر آتے ہیں یا تعویذ گنڈے والوں کے پاس جاتے ہیں تو اس سے ان کا مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ بغیر کسی محنت، مشقت یا نماز روزے اور وظائف کی پابندی اور احکام الٰہی کی بجا آوری کے ان کو دنیاوی امور میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ حالانکہ مصائب کے رفع کرنے کا نسخہ جو قرآن نے تجویز کیا ہے وہ ' وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (یعنی صبر اور نماز کے ذریعے اللہ سے مدد طلب کرو) کا عمل ہے اور مسلمانوں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ صبر کے تقاضے پورے کرتے ہوئے حالات سے ڈٹ کر مقابلہ کریں اور ساتھ ہی نماز کو پابندیِ سے ادا کرتے رہیں تاکہ ایسا کرنے سے ان کی تمام مشکلات حل ہو جائیں۔

اولیائے کرام نے تعویذات کو اگرچہ جائز قرار دیا ہے لیکن لوگوں کا تعویذات سے یہ توقع وابستہ کرنا کہ بغیر محنت اور مشقت کے تعویذ کو پاس رکھنے سے ہی ہمارے سب دنیاوی کام درست ہو جائیں گے، اس قوم کا ایک مہلک مرض ہے۔ یہی وہ بیماری ہے جس نے پوری قوم کو عمل سے بیگانہ کر کے اسے تباہی کی آفت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس بے عملی کا رویہ اختیار کرنے سے مسلمانوں کی ترقی کی راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قوم عضوِ معطل کی طرح مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ جو لوگ مال و دولت کے حصول سے خود کو خوشحال تصور کرتے ہیں ان کی یہ خوشحالی عموماً غلط ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کے سبب سے ہوتی ہے۔ آج ایسے مسلمان بہت کم نظر آتے ہیں جو ایمانداری کے اصولوں پر دولت جمع کر رہے ہوں اور ساتھ ہی ساتھ دین کی اتباع سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی توقع رکھتے ہوں۔ (بے جا منافع خوری، غلط طریقوں سے مال حاصل کرنا اور کسی کی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھانا بھی غلط ذرائع سے مال کمانے میں شامل ہے۔)

عصر حاضر کے حالات کے پیش نظر راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ جو لوگ بیعت کی

سعادت حاصل کر لیتے ہیں. ان کے لئے رابطۂ شیخ کی پڑتال کرنا ایک ضروری امر ہے اور انہیں چاہئے کہ اس طرف توجہ دیں کیونکہ رابطہ شیخ کے بغیر بیعت کی حیثیت بے معنی اور صرف برائے نام ہی رہ جاتی ہے۔ رابطہ شیخ میں کمی کا رونما ہونا عموماً روحانی دنیا کے کچھ دیگر لوازمات میں کمی واقع ہونے کے باعث ہوتا ہے. لہٰذا اس جگہ رابطہ شیخ میں کمی کو دور کرنے کے لئے چند نکات پیش کئے جا رہے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ اگر ان نکات پر توجہ دی جائے تو سالکین کو ربط کامل میسر ہو سکتا ہے۔ حقیقتاً رابطہ شیخ میں کمی محض اس لئے واقع ہوتی ہے کہ اکثر مریدین باضابطہ تربیت لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے اور نہ ہی ان کو بیعت کی صحیح قدر و قیمت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ذوق و شوق میں کمی اور معاملات و کمالات روحانیت سے لاعلمی اور مریدین کو دنیا کی طرف جنون کی حد تک محبت کا ہونا مرید کی روحانیت کو لے ڈوبتا ہے نتیجتاً. اس کو ایسی بیعت سے کماحقہ استفادہ بھی نہیں ہو پاتا۔

مریدوں کی مذکورہ کمزوری میں مشائخ ناپختہ کار کا بھی کچھ ہاتھ ہوتا ہے کیونکہ ایسے مشائخ کو اپنے ذاتی معاملات سے ہی اگر فرصت نہ ملے تو وہ مریدوں کو تربیت دینے کے لئے وقت کا کیسے اعلان کر سکتے ہیں۔ کچھ مشائخ جو اس تربیت کا اہتمام بھی کرتے ہیں، تو بھی پانچ فیصد سے زائد مریدین ایسی تربیت کی طرف رجوع نہیں کرتے کیونکہ وہ تربیت لینے کی طلب ہی نہیں رکھتے۔ راقم الحروف کچھ وقفوں کے بعد تربیتی کورس کا اہتمام کرتا ہے لیکن دیکھا گیا ہے کہ اکثر مریدین اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔ دنیاوی لالچ کا رجحان کچھ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ لوگ مالی خوشحالی کے باوجود ایسی تربیت کو ضروری تصور نہیں کرتے اور ایسی تحریروں کا بھی مطالعہ نہیں کرتے جس میں روحانی معاملات کی آسان طریقوں سے وضاحت کی گئی ہو۔ آئندہ سطروں میں ایسے نکات بیان کئے جا رہے ہیں جو رابطۂ شیخ کی تقویت کے لئے ضروری خیال کئے جاتے ہیں۔

۱ — محبّتِ شیخ۔ جب تک کوئی شخص اپنے تمام اعزاء و اقرباء اور خود اپنے آپ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہیں کرتا تو وہ ایک صحیح حدیث کے مطابق مومن ہی تصور نہیں کیا جاتا۔ فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے "لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ" (تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن ہو ہی نہیں سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں) ایسے ہی، چونکہ مشائخ انبیاء کے جانشین ہوتے ہیں، اس لئے اپنے سلسلے کے بزرگوں کے بعد ہر مرید کو اپنے شیخ سے محبت کا ہونا ضروری ہے۔ سائیں توکل شاہ انبالوی ؒ فرماتے ہیں کہ اپنے سلسلے کے بزرگوں کے بعد مرید کے دل میں سب سے زیادہ محبت اپنے شیخ کے لئے ہو۔ اگر مرید کی غیر موجودگی میں شیخ اس کا سارا مال اس کے گھر سے لے جائے تو بھی دل میں کوئی کجی محسوس نہ کرے۔ اس کے بدلے میں شیخ مرید کے دینی اور دنیاوی مرحلوں کا ذمہ دار ہوتا ہے، حتیٰ کہ وہ اس بات کا ضامن بھی ہوتا ہے کہ موت کے وقت مرید کی جان ایمان کی سلامتی کے ساتھ نکلے اور قبر میں نکیرین کے سوالوں کے جواب میں اس کی مدد کرے اور بالآخر اسے جنت میں

داخل کروادے۔ جب مرید کو کوئی نعمت میسر ہو تو اسے یہ سوچنا چاہیے کہ کاش میرا شیخ بھی اس نعمت میں شامل ہوتا۔ غرضیکہ شیخ کے بغیر وہ سکون محسوس نہ کرے۔

شیخ ابو بکر بن ابو اسحاق ؒ کی کتاب "اَلتَّعَرُّفُ لِمَذْهَبِ التَّصَوُّفِ" کی شرح میں ہے کہ بندے کا دل خدا کی طرف اور اس چیز کی طرف جو اللہ تعالیٰ کی ہے بلا تکلف مائل ہو جانے کا نام محبت ہے۔ جو چیز انسان کو بھلی لگے اس سے محبت کرتا ہے اور جو بری لگے اس سے بغض رکھتا ہے کیونکہ دلوں کو اسی جبلت پر پیدا کیا گیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ محبت میں موافقت ہے یعنی جو فرمایا گیا ہو اس کی اطاعت کرنا، جس سے روکا گیا ہو اس سے رک جانا اور جو حکم کیا جائے اس کو مقدر سمجھ کر اس پر راضی رہنا موافقت ہے۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا "اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (یعنی جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اطاعت کرو تو عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی تمام جہانوں کے پروردگار کی (البقرہ - ۱۳۱)

حضرت شیخ ابو بکر ؒ مذکورہ بالا کتاب میں فرماتے ہیں کہ محبت ایثارِ محبوب کا نام ہے یعنی اپنے دوست پر خود کو ایثار کر دے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ دوست پر اپنی تمام خواہشات کو قربان کر دینا محبت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس نے اپنے نفس کے ساتھ دشمنی رکھی اس پر اللہ تعالیٰ کی رضامندی واجب ہو گئی۔ فرماتے ہیں کہ محبت میں کمترین مقام موافقت ہے۔ جب خدا تعالیٰ بھی بندے سے محبت کرے تو اس کی علامت یہ ہے کہ بندہ ایسا بن جاتا ہے کہ وہ غیر کا نہیں رہتا۔ اس کو سارے کا سارا (کُلِّیَّۃً) اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ اس کی زبان پر اسی کا ذکر و فکر ہوتا ہے۔ محبت بندے کو اندھا اور باولا بنا دیتی ہے اور اسے محبوب کے سوا کسی اور چیز کی طلب نہیں رہتی۔ ایک طویل حدیث میں اس بات کا ذکر ہے کہ جو لوگ آپس میں اللہ کے لئے محبت کرتے ہیں (اَلْمُتَحَابُّوْنَ فِی اللہِ) ان کے لئے قیامت کے دن عرش کے چاروں طرف کرسیاں بچھائی جائیں گی اور ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح تاباں ہوں گے۔ صاحب عوارف المعارف نے لکھا ہے کہ صاحبان صدق و صفا کی محبت کو غنیمت شمار کرو کیونکہ ان سے محبت اللہ تعالیٰ سے محبت کے مترادف ہے۔ آپ کے اس فرمان سے مراد یہ ہے کہ ان سے محبت کے ذریعے خدائی تعلق پیدا ہو جاتا ہے، جبکہ دوسرے لوگوں سے محبت کے ساتھ صرف طبعی تعلق قائم ہوتا ہے۔ ایک حدیث ہے کہ ایک مومن دوسرے مومن کے لئے آئینہ کا کام دیتا ہے لہٰذا اہل اللہ کے اقوال، اعمال اور احوال کے آئینے میں تجلیات الٰہی کے ایسے پوشیدہ رموز جلوہ فگن ہو جاتے ہیں جو دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں اور صرف نظرباز انِ تجلی ان سے واقف ہوتے ہیں۔ ان تجلیات کا نظر آنا رابطہ کی تکمیل کی علامت ہے۔

۲ - آدابِ شیخ۔ ہماری کتاب "بیعت کی تشکیل اور تربیت" کے علاوہ "نشان منزل" اور "سرمایہ ملت" میں "ادب" کے موضوع پر کافی طویل بیان شامل کر دیا گیا ہے، جو مریدین کی ضرورت کے لئے کفایت کر سکتا ہے چنانچہ یہاں صرف یہ بیان کیا جائے گا کہ جو شخص شیخ کے ادب سے

غافل ہے وہ اس کے فیض سے بالکل محروم رہتا ہے بلکہ "بے ادب بے مراد" کے محاورے کے عین مطابق طریقت کے بہت سے انعامات سے قطعاً محروم ہو جاتا ہے۔

کچھ مرید ایسے بھی ہوتے ہیں (چند مثالیں) ۔ مشاہدے میں آتا ہے کہ کچھ لوگ بیعت کر لینے کے بعد بھی اپنے آپ کو پیر سے بہتر اور افضل خیال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ تو اپنے شیخ سے فضول بحث اور تنقید میں الجھ جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ کسی معمولی بات پر پیروں سے بدظن ہو جاتے ہیں اور پھر بیعت کو بھی ختم کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے مرید بھی ہوتے ہیں کہ کسی دوسرے پیر کی ذرا آب و تاب دیکھی تو اس سے بیعت کر لی اور پھر چند دنوں کے بعد اس سے بھی بدظن ہو گئے۔ ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ مرید اپنے شیخ سے مخدومانہ انداز میں خدمت لیتے ہیں۔ راقم الحروف اپنے ایک مرید کا واقعہ لکھنے سے گریز نہیں کرتا کہ ایک مرتبہ اس کا ایک مرید اس کے پاس آیا تو راقم الحروف اپنے اندرون خانہ سے اس کے لئے ایک شربت کا گلاس لایا اور مرید کو نوش کرنے کے لئے پیش کیا تو فوراً مرید نے حاکمانہ لہجے میں کہا "ایک گلاس ٹھنڈا پانی بھی لائیں" چنانچہ اس فقیر نے خادمانہ انداز میں اسے ٹھنڈا پانی بھی پیش کیا۔ اور پھر اثنائے گفتگو اس نے بیس ہزار روپے بطور قرض بھی طلب کیے۔ چنانچہ اس کو یہ بتایا گیا کہ یہ فقیر چونکہ ملازمت سے ریٹائر ہو چکا ہے اور پنشن کی رقم سے اتنی رقم ادا نہیں کر سکتا لہٰذا اسے اس خدمت سے معذور تصور کیا جائے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ ہو گیا ہے کہ وہ مرید صاحب پھر کبھی تشریف نہیں لائے۔ کچھ مرید ایسے بھی ہیں جو ادھار لے گئے اور پھر واپس نہیں کیا اور نہ ہی ادھار لینے کے بعد اب تک واپس آئے ہیں۔ ایک صاحب نے فقیر سے بیعت صرف اس وجہ سے ختم کر دی کہ اس کی فرمائش پر اسے دس ہزار روپے ادھار نہ دے سکا جبکہ ایک بار اس نے اس فقیر کو مکان کی تعمیر کے لئے دس ہزار روپے ادھار دیا تھا جو اسے لوٹا بھی دیا گیا تھا۔ اس مرید نے دوسرے ایک مرید سے یہ گلہ کیا کہ پیر صاحب مکان کی تعمیر پر پیسہ خرچ کر رہے ہیں تو کیا مجھے چند دنوں کے لئے دس ہزار نہیں دے سکتے تھے۔ ایسے مرید جو آداب شیخ سے بالکل نابلد ہوں تو ان کی سب سے پہلی ضرورت ادب سیکھنا ہے کیونکہ یہ کہا جاتا ہے کہ طریقت میں ادب پہلا قرینہ ہے۔ ایک بے ادب مرید سے کسی خیر کی توقع نہیں ہونی چاہئے۔ دیکھا گیا ہے کہ سزا کے طور پر ایسے بیعت توڑنے والے اور مغرور قسم کے مرید یا تو تارک صلوٰۃ ہو جاتے ہیں یا بد عقیدہ ہو جاتے ہیں۔

ایسے مرید بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ جو اپنے شیخ سے جب تک کچھ مفادات حاصل ہوتے رہیں تو ان کی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں اور جب کبھی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو گئی یا کوئی مراد پوری نہ ہوئی تو فوراً بیعت توڑ دی۔ کچھ لوگوں کا یہ معمول ہوتا ہے کہ اگر کوئی مشکل در پیش آئی تو دعا کے لئے آ گئے اور جب کام ہو گیا تو بھاگ گئے اور اگر کام نہ ہوا تو بھی بھاگ گئے۔ بعض مرید تو پیروں سے اس انداز سے بھی گفتگو کرتے ہیں گویا وہ اپنے پیر کے افسر بھی ہیں۔ کچھ مرید تو پیر کو ڈانٹ پلانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اکثر پیر خانوں میں دیکھا گیا ہے کہ ان کے گھر کے افراد پیر صاحب سے ایسا ہی

سلوک کرتے ہیں جس میں ہمسری کا عنصر پایا جاتا ہو، بلکہ مرید ہوتے ہوئے بھی اپنے والد (جوان کا مرشد بھی ہوتا ہے) کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بدتمیزی سے دیکھتے اور کلام کرتے ہیں اور سخت باتیں بھی کہنے سے گریز نہیں کرتے۔ ایسے مریدوں کو بیعت کی رحمتوں اور برکات سے کیا مل سکتا ہے اور تصور شیخ یا محبت شیخ تو بہت دور کی بات ہے۔ جب تک کوئی مرید ادب نہ سیکھے روحانیت والی چادر اس کی قامت پر ہرگز پوری نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے بیعت کرنے والے لوگ مشائخ کے فیوض سے بالکل محروم رہتے ہیں۔

کئی مقامات پر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بطور معمول مرید پیر صاحب کے گھر پر آتے ہیں اور آتے ہی پہلے پیشاب اور پاخانہ کرتے ہیں اور پھر وضو کرنے کے بعد محفل میں شرکت کرتے ہیں۔ مجلس میں بیٹھنے کے آداب کو جاننے پہچاننے والے بھی صرف چند ہی خوش قسمت مرید ہوتے ہیں۔ مشائخ اپنی مجالس میں ادب کی تلقین کر بھی دیں تو اکثر لوگ آداب محفل کو بجا نہیں لاتے۔ کچھ مشائخ ایسے بھی ہیں کہ جنہوں نے مریدوں کی سہولت کے لئے ادب پر بہت بصیرت افروز مقالے لکھ کر تقسیم کیے لیکن مریدوں کی بے ادبی کی حالت جوں کی توں رہی۔ یاد رہے کہ کچھ پیر خانوں اور درباروں میں رعب و جلال نظر آتا ہے لیکن حقیقی معنوں میں شاذ و نادر ہی کوئی مرید ادب آشنا ہوتا ہے۔ اس بے ادبی کے رویئے کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ معاشرے میں تزلزل کے باعث لوگوں کے دلوں میں مشائخ کا احترام نہیں رہا اور مریدین میں سے کسی کو اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی، یعنی لوگ مادہ پرستی کی طرف اس قدر مائل ہو گئے ہیں کہ مال و دولت کی چمک نے لوگوں کے دلوں پر مکمل قبضہ کر لیا ہے اور اب ان کی نظروں میں روحانی دنیا کی قدر و منزلت لایعنی ہو چکی ہے۔ زیر نظر تحریر کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ عوام کی توجہ مادی دنیا سے ہٹا کر پھر سے دین کی طرف مائل کی جائے۔ دولت کے اس ساحرانہ رویئے کو علامہ اقبال ؒ نے یوں بیان کیا ہے۔۔

نہ سلیقہ مجھ میں کِلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل ؑ کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آذری

۳ - شیخ سے طلبِ توجہ

سالک کا اپنے شیخ سے توجہ حاصل کرنا اس کے طلب کرنے کے انداز کے مطابق ہوتا ہے۔ طلب تیز ہو تو توجہ بھی تیز ملتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی ؒ کے فرزند ارجمند، مکتوبات سرہندی (ص ۱۹۲) پر اپنے ایک مرید کو مرشد کی توجہ طلب کرنے کی بابت حسبِ ذیل انداز میں لکھتے ہیں جس سے طلبِ توجہ کا معاملہ واضح ہو جاتا ہے:۔

مخدوما! جس شخص میں نشہ محبت موجود ہے، وہ (خود) "معانی مکنونہ" جذب کر لیتا ہے اور باطنِ فیض دہندہ سے باندازۂ محبت اخذ فیوض کرتا ہے اور موقع توجہ

کا خیال رکھتا ہے۔ اگر (مرشد کی) توجہ بھی اس محبت کے ساتھ جمع ہو جائے، تو نُورٌ علیٰ نُور ہے۔ اس کام (سلوک) میں سب سے اعلیٰ محبت ہے۔ توجہ، محبت کے بغیر کارگر نہیں اور محبت بے توجہ بھی کام کر جاتی ہے۔ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ اِلَیْهِ حدیث نبوی ؐ ہے۔ محبت سلسلۂ وجود و ایجاد کو جنبش میں لاتی ہے۔ اسی محبت نے گنجِ پنہاں کو ظاہر کیا ہے۔ اسی نے حسن پوشیدہ کو بے پردہ کر دیا ہے۔ بیشک حسن بے پردگی کا خواہاں ہے اور جمال تابِ مستوری نہیں رکھتا

پری روتابِ مستوری ندارد (پری چہرہ لوگ چھپنے کی طاقت نہیں رکھتے)

یہ محبت، صفت محبوب کا مظہر ہے، جو کہ "حسنِ نظارگی" چاہتا ہے۔ محبوب کو ایک محبّ چاہئے تاکہ اس کی صفت محبوبی آشکارا ہو جائے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے

منم کاستاد را استاد کردم
غلامم خواجہ را آزاد کردم

(میں نے استاد کو استاد بنا دیا۔ غلام ہوں مگر آقا کو آزاد کر دیا)

جو محبت عاشق کی صفت ہے، وہ اسی محبت کا عکس ہے، جو معشوق کے ساتھ قائم ہے کیونکہ عاشق کا جو کمال ہے وہ کمالاتِ معشوق کا سایہ ہے۔ پس یہ اسی محبت کا ظہور ہے جو اس آئینے کے اندر اس لباس میں جلوہ گر ہے۔

ع- یک نشہ دو جا ظہور کردہ (ایک نشہ نے دو جگہوں پر ظہور کیا)

عاشق "دقائقِ حُسن" کو جتنا زیادہ سمجھے گا اور جمال و کمالِ معشوق کی معرفت میں جتنی زیادہ "چشمِ دوربیں" رکھتا ہو گا، صفتِ عشق اس میں اتنی ہی زیادہ بڑھی ہوئی ہو گی اور وہ اتنا ہی زیادہ فریفتہ و شیفتہ ہو جائے گا۔

آرا کہ بہ حسنِ دیدہ تیز است ایں عشق، بلائے خانہ خیز است

(وہ چیز لا کہ جو حسن نظر کو تیز کرتی ہے۔ وہ چیز عشق ہے، جو پورے گھر کو ہلا دینے والی ہے)

یاد رکھیں کہ جو مرید توجہ طلب نہیں کرتا وہ اپنے شیخ کے فیض سے بھی محروم رہے گا۔

۴ - احترام و اکرامِ شیخ۔ احترام شیخ کا بیان بھی حقیقتاً آدابِ شیخ کے زمرہ میں شامل ہوتا ہے لیکن یہاں احترام شیخ سے مراد شیخ کا وہ احترام مقصود ہے جو ادب کی حد سے بھی تجاوز کر جائے، یعنی ادب میں حد درجہ مبالغہ کرنا شیخ کے احترام و اکرام میں شامل ہے۔ اس حد درجہ احترام کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اگرچہ کسی شخص کا بستر پر سونا عام طور پر ادب کے منافی نہیں لیکن اولیائے خواص احتیاطاً بستر پر اس لئے نہیں سوتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رات کے ایک حصے میں زمین پر استراحت فرمانا احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے۔ کچھ مریدین کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا شیخ اگر زمین پر آرام فرما ہو تو ان کو بستر پر سونا زیب نہیں دیتا، چنانچہ اس طرح ادب کو ملحوظ خاطر رکھنے سے انہیں شیخ کے احترام

کا اجر بھی ملتا ہے اور سنت رسول کی نیت کرنے سے سنت کی ادائیگی کا بھی ثواب مل جاتا ہے۔ ایک حدیث شریف "امداد السلوک" میں نقل کی گئی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام دن میں ایک مرتبہ اپنا رخِ انور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کی غرض سے زمین پر رکھ دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو آپ کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو پیغمبری کے لئے چن لیا۔ الغرض جو لوگ اپنے اعمال میں عاجزی کا اظہار کرتے ہیں تو وہ محض اپنے شیخ کے احترام کے باعث ہی ایسا کرتے ہیں۔ حضرت اویس قرنی ؒ کو جب علم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دانت مبارک جنگ احد میں شہید ہو گیا ہے تو انہوں نے اپنے تمام دانت شہید کر دیئے کیونکہ انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کونسا دانت شہید ہوا تھا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت تھی کہ آپ نے تمام عمر خربوزہ نہیں کھایا کیونکہ انہیں کوئی ایسی حدیث نہ مل سکی کہ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خربوزہ کھایا ہو اور اگر کھایا تھا تو کس طریقے سے کھایا تھا۔ علامہ ؒ فرماتے ہیں۔

کاملِ بُسطام در تقلیدِ فرد اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد

(بسطام کے ایک کامل ولی (بایزید بسطامی ؒ) نے حضورؐ کی تقلید میں عمر بھر خربوزہ کھانے سے اجتناب کیا)

اس احترام کی اصل قرآن کی یہ آیت لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ہے (یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے نہ بڑھو (الحجرات آیت ۲) چونکہ اولیائے کرام انبیاء کرام کے جانشیں ہوتے ہیں اس لئے ایک سالک طریقت اپنے شیخ کے احترام کو اللہ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کی جگہ تصوّر کرتے ہیں۔ اولیاء کرام کا ادب و احترام حقیقتاً اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر کی بدولت ہوتا ہے۔ اولیائے کرام کے لواحقین اور ان کی اولاد کا احترام بھی اسی قبیل سے ہے۔ اہلِ عقیدت اولیائے کرام کے تبرکات کو انکی ذات کے ساتھ نسبت ہونے کے باعث عزیز جانتے ہیں۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (اور جو اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے تو یہ (احترام) اس لئے ہے کہ دلوں میں تقویٰ ہے۔ الحج: ۳۲)۔

جہاں حضرت ہاجرہ ؓ کے قدم لگ گئے وہ جگہ بھی شعائر اللہ بن گئی۔ روایات میں ہے کہ ایک بار امام شافعی ؒ اپنے شاگردوں کو درس دے رہے تھے تو یہ بات شاگردوں کے دیکھنے میں آئی کہ آپ درس کے دوران بار بار کھڑے ہو جاتے۔ جب اس کی وجہ دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ مدرسے کے باہر چند بچے کھیل رہے تھے اور ان میں سے ایک بچہ سید خاندان سے تعلق رکھتا تھا جب وہ بچہ گیند اٹھانے کے لئے ہمارے قریب آتا تو میں احتراماً کھڑا ہو جاتا۔ حضرت جنید بغدادی جو اپنے پہلے ایام

میں شاہی پہلوان تھے، ایک سید کے ساتھ کشتی میں احتراماً چت ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی روز خواب میں حضرت جنید بغدادیؒ سے فرمایا کہ تم نے ہماری آل کی عزت افزائی کی ہے لہٰذا تمہارے اس احترام کے باعث ہم نے تمہیں تمام اولیاء میں سَیِّدُ الطَّائِفَہ کا مقام عطا کر دیا ہے۔ راقم الحروف اس مثال کے پیش کرنے کے بعد مزید کسی تحریر کی گنجائش نہیں سمجھتا البتہ اتنا لکھنا ضروری ہے کہ قرآن اور حدیث کی رو سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جو انبیاء کرام اور اولیاء عظام کا احترام بجا نہیں لاتا، اس کی پیدائش یا نطفہ میں ضرور کوئی نہ کوئی خرابی ہوتی ہے۔ دیکھئے سورۂ القلم کی آیت ۱۲ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَالِكَ زَنِيمٍ (درشت خو اور اس سب پر طرہ یہ کہ (ولید بن مغیرہ) کی اصل میں خطا ہے)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ كُلُّ تَقِيٍّ وَنَقِيٍّ مِنْ اٰلِيْ (یعنی ہر متقی اور نیک نام شخص میری آل میں سے ہے) جس سے ہر ولی اللہ کا احترام کرنا ثابت ہوتا ہے۔ آپؐ نے حضرت بلالؓ اور سلمان فارسیؓ کو بھی اپنی آل میں شامل فرمایا ہے (الاحادیث) چنانچہ کلام کو سمیٹتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ گستاخان رسول اور اولیائے کرام کا احترام نہ کرنے والوں کی اصل میں ضرور کوئی خطا ہوتی ہے۔

۵ - اتباع یا موافقت شیخ۔

تَبِعَهٗ وَاتَّبَعَهٗ کے معنی کسی کے نقش قدم پر چلنے کے ہیں۔ اتباع کا لفظ عموماً اطاعت اور فرمانبرداری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی خواہش کی پیروی، ساتھ ہو لینے یا کسی کے پیچھے چلنے اور اسے پا لینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چوپاؤں کے بچوں کا اپنی ماں کے پیچھے رہنا، رعیت کا مطیع ہونا اور سائے کا دھوپ کے پیچھے لگے رہنا جیسے اعمال کے لئے بھی یہ لفظ مختلف اعتبار سے استعمال کیا جاتا ہے۔

قرآن میں اتباع کے لفظ کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حاکمانِ وقت کی اطاعت کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے اور سورۃ النساء کی آیت ۸۰ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی، بیشک اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ انہی معنوں میں مشائخ کی اتباع بھی اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح سمجھی جاتی ہے۔ (لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ حاکم یا شیخ کے حکم میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی مطابقت پائی جاتی ہو) اہل طریقت اپنے مشائخ کی عادات اور رسوم کی بھی اسی طرح اتباع کرتے ہیں کیونکہ شیخ بذات خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم کی اتباع کرنے والا ہوتا ہے۔ مشائخ کی کچھ عادات کی اتباع کو موافقت کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس موافقت میں وہ رسوم اور عادات شامل ہوتی ہیں جس میں شریعت کی پابندی کا لزوم نہیں پایا جاتا، مثلاً طرز گفتگو، اٹھنے بیٹھنے اور پہننے کے خاص طریقے جن کو شیخ اپنائے ہوئے ہوتا ہے، مریدین بھی اپناتے ہیں گویا کوئی اگر مرید کو دیکھ لے تو اس میں اس کے شیخ کی عادات کی خوشبو پائی جائے۔

نسخہ کیمیا میں لکھا ہے کہ نجیب الدین سہروردیؒ اور مجیب الدین سہروردیؒ میں اس قدر موافقت طبع اور باہمی عشق پایا جاتا تھا اور دونوں کا لباس اور شکل و صورت میں اس قدر ہم آہنگی تھی کہ لوگوں کے لئے دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ مماثلت محبت اور خیالات کی یکجہتی

کے باعث ہوتی ہے۔ عوارف المعارف (ص ۴۲۲) میں مُودّتُ اور محبت کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ یہ مودت اور باہمی الفت صوفیوں کے اخلاق کا ایک وصف ہے یعنی ان میں برادرانہ موافقت (اتحاد) اور ترک مخالفت کی عادت، جو صحابہ کرام میں اسلام لانے کے بعد پائی جاتی تھی اور جس کا ذکر سورۂ فتح کے آخری رکوع میں "رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" اور سورۂ انفال کی آیت ۶۳ میں وَلٰكِنَّ اللهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان الفت پیدا کر دی) آیا ہے۔ یہ اتحاد و تالف ارواح کے باہمی اتحاد کی بدولت پیدا ہوتا ہے جس کا ذکر ایک حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ روحیں جن سے واقف ہوتی ہیں ان سے مانوس ہو جاتی ہیں۔ ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ اس شخص میں کوئی بھلائی نہیں جو نہ خود محبت کرنے والا ہو اور نہ دوسرے اس سے محبت کرتے ہوں۔

راقم الحروف کے نزدیک ایک مرید کا اپنے شیخ سے موافقت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے شیخ کے جملہ اعمال کی کس حد تک تقلید کرتا ہے۔ فریضۂ تبلیغ، درس و تدریس، نفاذ شریعت، شیخ کی عام سرگرمیوں اور خدمت طریقت کے بجالانے میں اگر مرید اپنی استطاعت کے مطابق اپنے شیخ کی طرح سرگرم عمل ہے تو وہ اپنے شیخ کی اتباع اور موافقت میں سچا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرید بھی ان امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے جن میں اس کا شیخ مبتلا ہوتا ہو اور اگر شیخ تندرست ہو جائے تو مرید کی بیماریوں میں بھی افاقہ ہو جاتا ہے۔ عسرت اور آسائش کی حالت میں بھی مرید کے اوقات اپنے شیخ کی موافقت میں گذرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور بالآخر ان کی شکلوں اور لباس میں بھی مماثلث نظر آنے لگتی ہے۔

۶ - مرید کا اپنی مرضی سے دستبردار ہونا۔ سچا مرید وہی کہلاتا ہے جس کی اپنی کوئی مرضی نہ ہو۔ کہا جاتا ہے "اَلْمُرِيْدُ لَا يُرِيْدُ" یعنی مرید وہ ہے جو کچھ نہیں چاہتا" قرآن میں بھی آیا ہے "وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللهُ" (اور تم نہیں چاہ سکتے بجز اس کے کہ جو اللہ چاہے۔ التکویر ۲۹) صوفیائے کرام کا ایک قول یہ بھی ہے کہ "اَلشَّيْخُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ" یعنی شیخ مارتا بھی ہے اور زندہ بھی کرتا ہے۔ اس قول سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ اگر شیخ کسی سے خوش ہو جائے تو اس کو ایک نئی زندگی عطا کر دیتا ہے اور جس سے ناراض ہو جائے اسے مار دیتا ہے۔ مولانا روم ؒ نے تو مثنوی میں اولیائے کرام کو اسرافیل وقت کہا ہے۔

اسرافیلِ وقت اند ایں اولیاء مردہ را زیشاں حیات است و نما
(اولیائے کرام اپنے وقت کے اسرافیل ہیں۔ مردہ کو ان سے حیات اور نمود و نمائش ملتی ہے)

اولیائے کرام تھوڑی دیر میں ہی لوگوں کی تقدیر کو بدل کے رکھ دیتے ہیں اور مفلسی و بے دینی کی حالت سے حالت استغناء و اتباع اور دین کی تابعداری میں لاکر مردہ حالت سے نکال کر زندگی بخش دیتے ہیں۔ جو لوگ شیخ کی مخالفت اور نافرمانی پر اتر آئیں تو بربادی اور قہر خداوندی میں

گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان پر غضبِ خداوندی کا نازل ہونا ایک قسم کی موت کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔
حضرت عبیدہ اللہ احرارؒ فرمایا کرتے تھے "الٰہی تو جسے تباہ کرنا چاہتا ہے انہیں ہمارا دشمن بنا دیتا ہے"
حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ پیر کے غضب سے بچنا چاہئے کیونکہ حق تعالیٰ کی رضامندی شیخ کی رضامندی سے وابستہ ہے اور حق تعالیٰ کا غضب شیخ کے غضب پر موقوف ہے (غضب شیخ کے متعلق زیادہ تفصیل "سرمایۂ ملت" میں "مکتوباتِ لطیف" کے حصے ہیں، ادب کے بیان میں شامل کر دی گئی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں)

درج بالا بیان کے مطابق ہر مرید کو اپنی عادات اور اطوار کا احتساب کرنا چاہئے تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ وہ شیخ سے رابطہ رکھنے کے لائق ہے یا اسے ابھی مزید اصلاح کی ضرورت ہے۔ اگر رابطہ کا طریق اپنے شیخ سے شروع کیا جائے تو رفتہ رفتہ مرید کا رابطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور پھر باری تعالیٰ سے بھی استوار ہو جاتا ہے۔

۷ - اپنے تمام امور اور احوال میں شیخ کو شریک پانا۔ رابطۂ شیخ اگر قائم ہو جائے تو مرید ہمہ وقت اپنے شیخ کو اپنے ساتھ غائبانہ طور پر شریک سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ شیخ کی معیت اسے ہر وقت حاصل ہوتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بوقت ضرورت شیخ کی روح اس کے پاس پہنچ جاتی ہے اور مدد کرتی ہے جس کا کبھی شیخ کو بھی علم نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات منقول ہے کہ جب آپ جنگ تبوک پر تشریف لے گئے تو آپ نے اپنے ساتھ ان لوگوں کو بھی ہم سفر پایا جو کسی معقول وجہ کے باعث جنگ میں شمولیت کرنے سے قاصر رہے۔ کچھ مریدوں کا یہ کہنا ہے کہ ہم ہر وقت اپنے مرشد کے دستِ شفقت کو اپنے سروں پر حفاظت کرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں، لہٰذا مرشد کی اس قسم کی حفاظت کے باعث ہم غلط کاموں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اسی محافظت کے باعث مرشد کو دستگیر بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ مشائخ اپنے مریدوں کی مشکل امور میں دستگیری فرماتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق قرآن میں لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (سورۂ یوسف۔ ۲۴) کے الفاظ میں اس بات کی تصدیق موجود ہے کہ (حضرت یعقوب علیہ السلام کے ذریعے) حضرت یوسف علیہ السلام کو تنبیہ کی گئی کہ وہ خود کو زلیخا سے محفوظ رکھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک جنگ کے دوران حضرت ساریہؓ کو دشمنوں کے ہونے والے حملے سے قبل از وقت متنبہ کیا۔ یہ تمام روایات اور اس قسم کے دیگر بہت سے واقعات مشائخ کا اپنے متعلقین کے ساتھ رابطہ یا تعلق کے مستحکم ہونے کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ اگر مرید کا اپنے شیخ کے ساتھ ربط قائم ہو جائے تو وہ شیخ سے رہنمائی حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اسی طرح مرید پر ایک ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ سے بھی ربط قائم کر سکتا ہے۔

۸ - عبادات میں تصوّرِ شیخ کا پایا جانا۔ اگرچہ کچھ علماء نے نماز اور دیگر عبادات میں شیخ کے تصور کے پائے جانے کو شرک قرار دیا ہے لیکن ایسا فتویٰ دینے والے وہ لوگ تھے جنہوں نے بدقسمتی سے تصوف یا روحانیت کی ہوا بھی نہ پائی تھی۔ پاکستان اور عرب ممالک کے جس قدر بلند مرتبہ مشائخ کرام ہو گزرے ہیں ان کی بہت بڑی اکثریت نے تصور شیخ کو نہ صرف جائز بلکہ مستحسن قرار دیا ہے۔ اسی کتاب میں بعنوان "رابطۂ شیخ حضرت مجدّدؒ کے نزدیک" ایک ایسی تحریر لکھ دی گئی ہے جس میں اولیائے کرام کی طرف سے تصوّرِ شیخ کے جواز کا فیصلہ اور چند بزرگوں کے اپنے رابطے کے طریقہ کار سے متعلق کافی تفصیل موجود ہے۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے نماز کی حالت میں تصوّرِ شیخ کے پائے جانے کو بہت مستحسن قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ دولت تو لاکھوں میں سے کسی ایک خوش بخت کو نصیب ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں یہاں تک فرما دیا کہ جب تک نماز میں مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال نظر نہ آئے اس وقت تک نہ میری نماز کا قیام، قیام کہلائے گا اور نہ ہی ایسے سجدے کو سجدہ کہا جا سکتا ہے۔ آئمہ متقدمین میں سے بعض بزرگ تو یہ فرماتے ہیں کہ اگر ان کو ایک ساعت کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت میسر نہ ہو تو وہ خود کو مومنوں میں شمار نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہے تو پھر وہ اپنی نماز اور دیگر عبادات میں جمال مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کس طرح محروم رہ سکتے ہیں۔ سیدی علی خواصؒ کا ایک قول کس قدر خوش کن ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ بندہ اس وقت تک عارف کامل نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ وہ جس وقت چاہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہ کر لے۔ افسوس کی بات ہے کہ یہودیوں کی خواہش کے مطابق چند علماء عوام کو عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کا اسلام اس قدر کمزور ہو جائے کہ وہ محض نام کے ہی مسلمان رہ جائیں جبکہ قرون اولیٰ کے مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل و جان سے شیدا تھے اور ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ وہ گلی کوچوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو کے ذریعے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کر لیا کرتے تھے۔ یہ بات بھی مستند ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرماتے تو صحابہ کرامؓ آپ کے وضو کے پانی کو زمین پر گرنے نہ دیتے تھے بلکہ اپنے جسموں پر مل لیتے تھے۔ آپ کا لعاب مبارک کہیں نظر آ جاتا تو لوگ اس پر اس طرح جھپٹتے کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ شاید ابھی ان کی آپس میں جنگ ہو جائے گی۔ مگر آج کے مسلمان اپنی بعض کتابوں میں یہ لکھتے ہیں کہ نماز میں گدھے کا خیال آ جائے تو حرج نہیں لیکن نعوذ باللہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آ جائے تو نماز خراب ہو جاتی ہے۔ (اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تصوّر کے متعلق بعض مشائخ کبار کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر ایک صوفی کو نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال نظر نہ آئے تو ایسی نماز کا دہرانا ضروری سمجھا جاتا ہے، لہٰذا عارفین اور کاملین کے لئے نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور کا پایا جانا نماز کے باطنی آداب کی تکمیل کے لئے ضروری ہے اور اسی طرح اگر شیخ کا تصور آ جائے تو اسے اپنی خوش بختی تصور کرنا چاہئے

کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق ان پاک ہستیوں کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے۔

ہر کس کہ در نماز نہ بیند جمال دوست　　فتویٰ ہمیں دِہم کہ نمازش قضا کند

(ہر وہ شخص جو نماز میں اپنے دوست کا جمال نہیں دیکھتا، اس کے لئے میں فتویٰ یہی دوں گا کہ وہ اپنی نماز دہرالے)

علامہ اقبال" عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور نماز میں آپ کے تصوّر کو اس طرح دل میں بساتے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق وہ نماز جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذوق اور شوق جلوہ گر نہ ہو تو اس نماز کا قیام اور سجود حجاب پر محمول کیا جائے گا۔ فرماتے ہیں ۔

شوق تِرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام　　میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
لوح بھی تو قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب　　گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود　　فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ، تیرا جمالِ بے نقاب

اختتامیہ

اس کتاب کو ضبط تحریر میں لانے کا واحد مقصد یہ ہے کہ عصر حاضر کا مسلمان جو مال و زر کی فراہمی اور عیش و عشرت کو مہیا کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے میں دن رات مصروف ہے. اسے نہ صرف دین اسلام کی راہ کی ترغیب دی جائے بلکہ اسلامی روحانیت کے بلند مقام سے بھی آشنا کیا جائے۔ عصر حاضر میں مسلمانوں کی دین سے دوری. بے راہ روی، بد عملی اور معصیت کشی کا سبب مناسب تعلیم و تربیت کا فقدان اور روحانی رہنمائی سے محرومی ہے۔ تربیتی نظام کی ابتدا ہمیشہ گھر سے ہوا کرتی ہے اور ملک کے مدارس اور روحانی شخصیتیں اس ابتدائی تربیت کی تکمیل میں اہم کردار کی حامل ہوتی ہیں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ آج یہ دونوں درسگاہیں یا تو کالعدم ہو چکی ہیں یا صیہونی طاقتوں نے انہیں فعال کردار ادا کرنے سے روک دیا ہے جس کا ذکر راقم الحروف کی کتاب "بیعت کی تشکیل اور تربیت" اور "سرمایۂ ملت" میں کافی وضاحت سے کیا جا چکا ہے۔ موجودہ حالت میں مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیداری کا واحد راز اسی بات میں مضمر ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلامی ممالک کو ایسی سعادت عطا فرمائے کہ وہ اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے سرکاری ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلمانوں کے اصلاحِ احوال اور تربیتِ نفس کا نظام مہیا کریں اور بصورتِ دیگر اُمّت کے زوال اور زبوں حالی کا درد محسوس کرنے والے مصلحین قوم و ملت اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو مزید تقویت دیں اور قوم کے متموّل حضرات ایسی درسگاہوں کی کامیابی کے لئے ان مبلغین و مصلحین کے ساتھ شانہ بشانہ چلیں تاکہ ان روحانی مراکز و مدارس سے خاطر خواہ نتائج بر آمد ہو سکیں۔

مسلمانوں کی اصلاح میں حصہ لینے والوں کی شان احادیث صیحیہ میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ روزِ قیامت ایسے لوگوں کا مقام و مرتبہ انبیائے کرام کے درجے سے صرف ایک درجہ کم ہو گا۔ مزید برآں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ذات انہیں زندگی کے ہر قدم پر اپنی خاص مدد و نصرت سے نوازے گی۔ ظاہر ہے جن خوش نصیبوں کے لئے اللہ تعالیٰ قدم قدم پر مدد کرنے کا وعدہ فرمائے تو پھر انہیں کامیاب و کامران زندگی بسر کرنے میں کیا رکاوٹ پیش آ سکتی ہے۔

ہر زمانے میں انسانیت کی رشد و ہدایت کے لئے ہادی اور مصلحین کو ارسال کرتے رہنا اللہ تعالیٰ کی سنت میں شامل ہے اور ہمارے زمانے میں بھی قوم کے احوال کی اصلاح کے لئے مخلص

لوگ ہمیشہ سے کوشاں رہے ہیں۔ مگر افسوس کہ دشمنانِ اسلام بھی ہمیشہ سے مسلمانوں کے ساتھ سامری کا سا کردار ادا کرتے آئے ہیں اور اہل اسلام کو راہ ہدایت سے دور لے جانے میں اس قدر کامیاب ہو چکے ہیں کہ اب زوال و انحطاط کا شکار مسلمان کسی دردمندانہ ندا اور پکار پر کان دھرنے کو تیار نہیں۔ یہ دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے کہ نوجوان نسل کے اخلاق و کردار کو بری طرف متاثر کرنے والے الیکٹرانک میڈیا، (ٹی وی، وی۔ سی آر اور ڈش انٹینا کے پروگراموں) کے ذریعے مسلمانوں کا بالائی طبقہ اس قدر جوش و خروش کا اظہار کرتا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مذہب کے ساتھ ذوق و شوق کی جگہ اب فحاشی، عریانی اور بے حیائی نے لے لی ہے۔ جن لوگوں کا فرض منصبی ایسی بے راہ روی اور بے حیائی کے سیلاب کی روک تھام کرنا تھا، وہ خود اس بے حیائی کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ سعادت عطا فرمائے کہ ہم قوم کے لئے ایسی خدمت سرانجام دے سکیں کہ ہمارے دور میں ہی باطل کو تقویت دینے والوں کو نابود کیا جاسکے۔ آمین۔

علامہ اقبال" کا پورا کلام ہمیں جھنجھوڑ کر یہ بتا رہا ہے کہ مسلمانوں نے جب تک اسلام کے قوانین کو اپنائے رکھا تب تک وہ پوری دنیا میں ممتاز اور سربلند رہے اور دوسرے یہ کہ جب مسلمانوں نے پیغمبرِ اسلام کی اطاعت و اتباع سے ہاتھ کھینچا تو زمانے بھر میں خوار و زبوں حال ہو گئے۔ تیسرا موضوع جس کو علامہ" نے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا وہ یہ تھا کہ مسلمان اس زبوں حالی سے کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہیں، چنانچہ اس موضوع پر آپ نے ایسا درد بھرا کلام پیش کیا ہے کہ جسے پڑھ کر کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن افسوس ہے کہ آپ کے کلام کا صرف چند ایک لوگوں نے ہی مطالعہ کیا ہے جب کہ دوسری قوموں نے آپ کے کلام کو سمجھا اور عمل کرنے کے بعد پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے آئے۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت زار کو جن اشعار میں علامہ" نے پیش کیا ہے اس کی فہرست بہت طویل ہے، البتہ چند ایک اشعار بطور نمونہ پیش کئے جارہے ہیں تاکہ اس بات کا احساس ہو جائے کہ ان کو قوم کی زبوں حالی کا کس قدر دکھ تھا۔ ایک وکیل صاحب، جن کا کچھ عرصے کے لئے علامہ کے ساتھ تعلق رہا ہے، فرماتے ہیں کہ لاہور میں علامہ اقبال" ہر روز شام کو علامہ اقبال روڈ والے مسکن سے پیدل چل کر بوہڑ والے چوک تک آتے اور کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد واپس چلے جاتے۔ ان کا کہنا ہے کہ علامہ کو یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا کہ مسلمانانِ ہند زیادہ تر تانگے کی کوچوانی اور بوجھ اٹھانے یا مزدوری جیسے کام کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ قوم کا یہ حال دیکھ کر علامہ اقبال" گھر جا کر اکثر گریہ و زاری میں راتیں گذار دیتے تھے۔ مسلمانوں کے کچھ احوال و کوائف علامہ اقبال" کے درج ذیل اشعار سے بھی ظاہر ہو رہے ہیں ؎

مؤمن است و پیشہ اُو آذری دین و عرفانش سراپا کافری

(یہ مومن تو ہے مگر اس کا پیشہ بت پرستی ہے، اس کا دین و عرفان سراپا کافری ہے)

گرچہ دارد لَا اِلٰہ اندر نہاد از بطونِ اُو مسلمانے نہ زاد

(اگرچہ (مسلمان) اپنی سرشت میں لَااِلٰہ رکھتے ہیں مگر ان کے بطنوں سے ایک بھی مسلمان پیدا نہیں ہوا)

سینہ اُش بے سوز و جانش بے خروش　　اُو سرافیلؑ است و صورِ او خموش

(اس کا سینہ بے سوز اور اس کی روح بے اثر ہے۔ وہ خود اسرافیل (کی طرح) ہے مگر اس کا صور خاموش ہے)

پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق　　مکتب و مُلّائے او محرومِ شوق

(پست فکر و کمینہ فطرت اور بے ذوق ہیں ان کے مدرسہ اور مُلّا محروم شوق ہیں)

آہ قومے دل زحق پرداختہ　　مُرد و مرگِ خویش را نہ شناختہ

(افسوس اس قوم پر جس نے حق سے دل خالی کر لیا۔ وہ قوم مر گئی لیکن اس نے اپنی موت کو نہ پہچانا)

ہر زماں اندر تلاش ساز و برگ　　کارِ او فکرِ معاش و ترسِ مرگ

(یہ قوم ہر وقت ساز و سامان زندگی کی تلاش میں ہے۔ اس کا کام فکر معاش اور موت سے خائف رہنا ہے)

ظالم آں قومے کہ چشماں دُوختند　　وز سخنہا عالمے را سُوختند

(وہ لوگ کتنے ظالم ہیں کہ جو اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اور اپنی اہ و پکار سے دنیا کو جلا دیتے ہیں)

از سہ قرن این اُمتِ خوار و زبوں　　زندہ بےسوز و سرورِ اندروں

(تین صدیوں سے یہ امت خوار اور زبوں حال ہے۔ یہ لوگ زندہ ہیں باطنی سوز و سرور کے بغیر)

طبعٔ اُو بے صحبتِ مردِ فقیر　　خستہ او افسردہ و حق ناپذیر

(اس کی طبیعت میں مرد فقیر کی صحبت سے محرومی ہے وہ خستہ حال. افسردہ اور حق کو قبول کرنے والا نہیں)

تاریخ شاہد ہے کہ جب سے مسلمان عیش و نشاط کے دلدادہ ہوئے تو اس وقت سے عزم و استقلال اور حکومت ان کے ہاتھوں سے نکل گئی ہے اور روحانی کیفیت کا یہ عالم ہے کہ اکثر علاقوں میں مسلمانوں کو قرآن کی تلاوت اور نماز پڑھنے کے لئے سورہ فاتحہ اور التحیّات کی عبارت کا یاد ہونا تو درکنار، بعض مسلمانوں کو تو تکبیر ذبح اور کلمہ طیبہ بھی پڑھنا نہیں آتا۔ جس قوم کی لاعلمی کی حالت اس قدر تنزل اختیار کر جائے تو اس کو قومی یا بین الاقوامی سطح پر کوئی باعزت مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مسلمان معاشی، اقتصادی، علمی اور اخلاقی معیار کے اعتبار سے پوری دنیا میں مار کھا گئے۔ کسی قوم کے تنزل کی حالت جب اَسْفَلَ السَّافِلِینَ کی حدود کو چھو لے تو اس میں ہر قسم کی گراوٹ پائی جاتی ہے قوم کے ان احوال کا نقشہ علامہ اقبالؒ نے درج ذیل اشعار میں پیش کیا ہے۔

اقتدار و عزم و استقلال رفت اعتبار و عزت و اقبال رفت
(حکومت و قوتِ ارادی اور استقامت ہاتھ سے گئی عظمت و عزت اور اقبال بھی گیا)

از دلِ افسردۂ او سوز رفت ذوقِ فردا، لذتِ امروز رفت
(اس کے مرجھائے دل سے لگن یا اضطراب نکل گیا آنے والے کل کا اشتیاق اور آج کے کارناموں کی لذت گئی)

اَلحَذَر، ایں نغمۂ موت است بس ہستیٔ در کسوتِ صوت است بس
(اس سے بچو! یہ حال تو نغمۂ موت کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی ہستی فقط آواز کے مجازی لباس میں ہے)

قوتِ فرمانروا معبودِ اُو در زیانِ دین و ایماں سودِ اُو
(حاکم وقت کی قوت اس کے لئے ایک خدا بنا ہوا ہے، دین اور ایمان کے ساتھ زیادتی کر کے فائدہ اٹھاتا ہے)

دینِ او عہدِ وفا بستن زغیر یعنی از خشتِ حرم تعمیر دیر
(مسلمانوں کا دین غیر قوموں سے عہد وفا کرنا ہے، یعنی وہ حرم کی اینٹ سے بتخانے کو تعمیر کرتے ہیں)

شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر از مقامِ او نہ داد او را خبر
(شیخ مکتب محدود خیال اور کم نظر ہے، ان کو ان کے مقام کی کچھ خبر نہیں دیتا)

در حرم زاد و کلیسا را مرید پردۂ ناموسِ مارا بر درید
(یہ لوگ پیدا تو حرم میں ہوئے لیکن کلیسا کے معتقد ہیں، انہوں نے ہمارے نام و ناموس کا پردہ پھاڑ دیا ہے)

کعبہ آباد است از اصنامِ ما خندہ زن کفر است بر اسلامِ ما
(کعبے کی آبادی ہمارے بتوں سے ہے، آج کفر ہمارے اسلام کا مذاق اڑاتا ہے۔)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال ؒ نے اپنی عمر کی تمام کاوشوں کو مسلمانوں کی بیداری، اقامتِ دین اور اصلاحِ امت میں صرف کر دیا اور آپ نے زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی حاصل کرنے کے رازوں کو اپنی خلوتوں میں تلاش کیا اور پھر ان رازوں کو نہایت خوبصورت اور دلنشیں الفاظ میں اشعار کی وساطت سے قوم کے سامنے پیش کیا۔ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں کہ ؎

بہرِ انساں چشمِ من شب ہا گریست تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
(انسان کی بہبود کے لئے کئی راتیں میری آنکھ روتی رہی۔ پھر کہیں جا کر میں نے زندگی کے اسرار سے پردہ کشائی کی)

علامہ اقبال ؒ نے اللہ تعالیٰ سے ربط قائم کرنے پر بھی کافی کلام کیا ہے۔ ایسے چند

اشعار کو راقم الحروف کی کتاب "حضور قلب" میں (تقریباً ۳۵۰ صفحات کی ضخامت کے ساتھ) بیان کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کے روحانی روابط پر آپ کا اور بھی کلام موجود ہے جس کو انشاء اللہ کسی اور کتاب میں پیش کیا جائے گا۔ آپ کے ہاتھوں جو کلام لکھا گیا ہے اس کے متعلق ہم یقین سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کلام مسلمانوں کی بیداری کا سبب بنا ہے مگر جس حد تک اصلاح کا ہونا مقصود تھا وہاں تک نوبت نہ پہنچ سکی۔ درجِ ذیل اشعار میں آپ نے مسلمانوں کو آگاہ کیا ہے کہ زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل کرنا ہے اور انسان کی تخلیق کا منشا بھی یہی ہے۔

زندگی خود را بخویشِ آراستن بر وجودِ خود شہادت خواستن

(زندگی اپنے آپ کو اپنی خودی سے آراستہ کرنے کا نام ہے، اور اپنے آپ کو خودی کی کسوٹی پر پرکھنا ہے)

بر مقامِ خود رسیدن زندگی ست ذات را بے پردہ دیدن زندگی ست

(اپنے مقام کو پالینا ہی زندگی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا بلا حجاب مشاہدہ کرنا زندگی ہے)

چشم برحق باز کردن بندگی ست خویش را بےپردہ دیدن زندگی ست

(اپنی آنکھ کو حق تعالیٰ کے لئے کھولنا عبادت ہے، اپنے آپ کا بےپردہ مشاہدہ کرنا زندگی ہے۔)

بندہ چوں از زندگی گیرد برأت ہم خدا آں بندہ را گوید صلوٰت!

(جب بندہ زندگی کی آلائشوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے، تو پھر خود اللہ تعالیٰ بھی اس بندے پر درود بھیجتا ہے)

زندگی ایں جا بہ دیدار است بس ذوقِ دیدار است و گفتار است بس

(روحانیت میں زندگی دیدار الٰہی کا ہی نام ہے، اس دیدار کا ذوق اور اسی کے لئے بات کرتے رہنے کا نام زندگی ہے)

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن عالم ایں شمشیر را سنگِ فسن

(آدمی تو تلوار ہے اور اللہ تعالیٰ اس تلوار کو چلانے والا ہے۔ یہ دنیا اس شمشیر کو تیز کرنے کا آلہ ہے)

رابطہ کے لفظ سے ہی ربط قائم کرنے کے عمل کا احساس ہوتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ربط کے ذریعے انسان اللہ تعالیٰ سے وصل حاصل کر لیتا ہے۔ اتباعِ شریعت، ذکر کا دوام اور شیخ کی توجہ کے تصرف سے ہی رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔ مولانا روم ؒ نے بھی اپنی مثنوی میں اس حقیقت سے پردہ کشائی کی ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد ذات کبریا کی جانب رجوع اور رسائی حاصل کرنا ہے۔ مولانا کا کلام قرآن کی اس آیت کی ترجمانی کرتا ہے کہ جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ اَیْ لِیَعْرِفُوْنَ (ہم نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لئے کہ وہ عبادت کریں یعنی عرفان حاصل کریں مفسرین نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی معرفت

حاصل کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے مولانا روم کے اس قول کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے۔

شعلۂ درگیر زد بر خس و خاشاکِ من　　مرشدِ رومی کہ گفت "منزلِ ما کبریا ست"

(ہمارے افکار کے حس و خاشاک پر مرشد رومیؒ نے ایسا شعلہ پھینکا کہ جس نے انہیں راکھ کر دیا ہے جب مرشد رومیؒ نے کہا "ہماری منزل اللہ تعالیٰ ہے")

علامہؒ فرماتے ہیں کہ ذات باری تعالیٰ تمام ہستیوں کی اساسی ایغو ہے۔ لہٰذا انسان اپنی ایغو یا خودی کی ترقی اور تقویت کے ذریعے اساسی ایغو (یعنی اللہ تعالیٰ) کی معرفت حاصل کر سکتا ہے، چنانچہ انسان ایک شدید اور طویل عمل (یعنی اتباعِ شریعت، ربطِ شیخ اور تکمیلِ خودی) کے ذریعے آزمائشوں اور تکالیف و مجاہدات سے گزرنے کے بعد خودی کی خلوتوں میں کبریائی کے مقام تک جا پہنچتا ہے، تب کہیں جاکر وہ اللہ تعالیٰ کے جلال و جبروت کی بارگاہ میں تقدیر کے پردوں کو چاک کرتا اور اس کے پردوں کو اٹھاتا ہے۔ ایسا ہو جائے تو پھر کہیں نور الٰہی کی شمع پر انسان کی نظریں پڑتی ہیں اور وہ اسے بے حجاب دیکھتا ہے۔ یہی حالت واصل باللہ ہونے سے عبارت ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ سلاطین کے درباروں میں اپنے چہروں کیوں جھکاتے ہو، حالانکہ تمہیں چاہئے کہ اپنے خدا سے نازِ کبریائی سیکھو۔

ع　بیاموز از خدائے خویش نازِ کبریائی ہا
(اپنے رب سے نازِ کبریائی سیکھو)

ایک جگہ فرمایا۔

قربِ حق از ہر عمل مقصود دار　　تا زتو گردد جلالش آشکار

(اپنے ہر عمل کا مقصود خدا تعالیٰ کے قرب کو بناؤ تاکہ تمہاری ذات سے خدا کا جلال ظاہر ہونے لگے)

مولانا رومؒ کے قول "منزل ما کبریاست" میں کبریا سے مراد بڑائی اور سرداری ہے اور اسے ہم جلوہ خداوندی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اگرچہ انسان بندہ ہے مگر جب وہ کبریائی کے جلوؤں کو اپنے اندر سمولے تو وہ اس خلوص اور تعبد سے سجدہ کرتا ہے کہ دیکھنے والوں کو باری تعالیٰ کی عظمت کا احساس ہوتا ہے جیسے علامہؒ نے مولانا روم کی ادا کردہ نماز کے لئے فرمایا۔

شعلہ ہا در موج دودش دیدہ ام　　کبریا اندر سجودش دیدہ ام

(میں نے مولانا روم کے دھوئیں کی موج میں بہت سے شعلوں کو دیکھا ہے۔ ان کے سجود میں خدا تعالیٰ کی کبریائی کو بھی دیکھا ہے)

آج کا مسلمان، جو مال و دولت کی دوڑ میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو ترک کئے ہوئے ہے اور دین سے بہت دور نکل چکا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید کی اہلیت سے

ہاتھ دھو چکا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے لازم ہے کہ وہ خدائے قدوس و برتر کے دین سے بغاوت کو ترک کر دے اور اس کے حضور سجدہ ریز ہو جائے۔ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے صرف دن بھر میں پانچ وقت کی نمازوں کی ادائیگی درکار ہے (جس کے لئے کل ۳۵ منٹ درکار ہیں) اور اس کے علاوہ اسے حرام کاموں سے توبہ کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اگر کوئی مسلمان اپنے مولیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس قدر معمولی وقت کا نذرانہ بھی پیش نہ کر سکے جب کہ دنیاوی امور میں وہ صبح سے شام تک نہایت تندہی سے محنت اور مشقت کرنے سے تھکتا نہیں۔ قرآن میں ہے کہ انسان اپنے لئے بہتری کا شدت سے خواہاں ہے۔ ایسے لوگوں کو اس بات کا احساس کرنا چاہئے کہ اس قدر محنت و مشقت کے بعد وہ دنیا میں مال و دولت کے انبار تو لگا سکتے ہیں اور دنیا کی مختصر سی زندگی میں آرام کے چند محدود سال تو گزار سکتے ہیں لیکن مرنے کے بعد وہ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ ایسے لوگ جب قبر میں جائیں گے (کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم سے پہلے تمام لوگوں کو قبر میں دفنایا جا چکا ہے اور ایک روز ہم نے بھی قبر میں جانا ہے) تو وہاں انہیں سخت عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اور اس عذاب سے پل بھر چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اگر وہ اپنی عمر کی پوری کمائی بھی دے دیں تو بھی بات نہیں بنے گی۔ آج جب کہ توبہ کا وقت ہاتھ سے نکل نہیں گیا ہے تو اس دن کے لئے کیوں نہیں سوچتے جس دن سوائے ان کے اعمال کے اور کوئی ان کی مدد نہیں کر سکے گا۔ یہ سمجھ لینا خطا ہے کہ خدا معاف کرنے والا ہے معاف کر ہی دے گا۔ ذرا غور کریں کہ جب آپ کہتے ہیں کہ خدا رزق دینے والا ہے تو پھر کاروبار کے لئے کیوں اس قدر جاں فشانی کرتے ہیں۔ خدا تو ان کے لئے غفور الرحیم ہے جو اپنی زندگی میں اعمالِ صالح کرنے میں کوشاں رہیں، لیکن کچھ کمی ہو جائے تو ایسی حالت میں معافی کا امکان ہوتا ہے کیا یہ بات ممکن ہے کہ آپ امتحان کے پرچہ کے لئے کاغذ خالی چھوڑ دیں اور پھر کامیاب بھی ہو جائیں۔ ان تمام نکات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بجائے آخرت کا سخت عذاب مول لینے کے نماز و روزہ وغیرہ کا آسان کام اس دنیا میں ہی مکمل کر لو تاکہ اگلے جہاں میں محفوظ رہ سکو اور دنیا میں بھی تمہارے کاموں میں کامیابی اور برکت عطا کر دی جائے اس معمولی مشقت کرنے میں کیا مشکل ہے جو خدا کی ناراضگی کو مول لیتے ہو۔

علامہ اقبال ؒ نے مسلمانوں کی پسماندہ اور دل شکن حالت کو دیکھ کر ان کو یہ سبق دیا ہے کہ وہ نہ تو دنیا کے کاموں میں سستی اور غفلت کریں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلقات کو استوار کرنے سے اجتناب کریں۔ جو لوگ علامہ ؒ کے ایسے کلام کو ملاحظہ کرنا چاہتے ہیں وہ علامہ کی جملہ کتب کا مطالعہ فرمائیں۔ اب تو علامہ کے تمام فارسی کلام کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور راقم الحروف کی اکثر کتابوں میں بھی علامہ ؒ کے کلام کا ایک اچھا خاصا مجموعہ شامل کیا جا چکا ہے تاکہ لوگ اقبال آشنا ہو جائیں۔

جس طرح ہر زمانے میں اسلامی شعراء اپنے کلام میں عوام کی توجہ کو اسلام کی طرف

راغب کرنے کی غرض سے خوبصورت نکات پیش کرتے رہے ہیں، اسی طرح اولیاء کرام لوگوں کو اپنے اپنے وقتوں میں راہ ہدایت کی طرف راہنمائی کرنے کے لئے محفلوں کا انعقاد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام دشمن طاقتوں نے ہمیشہ مشائخ عظام کی مخالفت کا اظہار کیا ہے اور عوام کو پیری مریدی سے متنفر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھا۔ تمام مشائخ عظام حضرات بایزید بسطامی، جنید بغدادی، معین الدین چشتی، نظام الدین اولیاء، بہاؤالدین نقشبند، میاں شیر محمد شرقپوری رَحِمَهُمُ اللهِ عَلَيهِم اور ایسے سینکڑوں مشائخ کرام نے لوگوں کو طریقت کی تعلیم دی لیکن آج جو لوگ ان کے نظریات کی مخالفت کر رہے ہیں ان کی حیثیت ایسے ہی ہے جیسے کوئی ادنیٰ سا چوہا، شیر کی دم سے کھیل رہا ہو۔ ایسے لوگوں کے دام میں آنا عقلمندی نہیں۔ اس جگہ اس بات کا مشورہ دینا نہایت مناسب ہے کہ طالبانِ حق کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ مذکورہ بالا مشائخ کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تاکہ ان کے دل کے پردے کھل جائیں چند دیگر کتب جن کا مطالعہ ضروری ہے ان میں سے مثنوی مولانا روم، کشف المحجوب مکتوباتِ ربانی، اولیائے نقشبند، عوارف المعارف، غنیۃ الطالبین، علامہ اقبال کے کلام کی تشریحی کتب، مدارج نبوت اور سیرت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم قابل ذکر ہیں۔ ہر طالب کے لئے ان کتب کا مطالعہ اولین فرصت میں کیا جانا بہت بہتر ہو سکتا ہے۔ اس مطالعہ کے ساتھ ساتھ کسی مرشد کامل کی بیعت کرنا نہایت ضروری ہے ورنہ بہت سے روحانی انعامات سے محرومی کا منہ دیکھنا ہوگا۔

حضرت سلطان باھوؒ نے "عین الفقر" میں روحانی تربیت پر بہت تاکید فرمائی ہے۔ یہاں آپ کے پیش کردہ چند نکات کو قارئین کرام کے لئے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ان کو طریقت کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مرشد کامل کی ایک نظر ہزار سالہ عبادت سے بہتر ہے کیونکہ علم قیل و قال نری سر دردی ہے اور صاحب نظر کی نظر میں مکمل معرفت ہے۔ عموماً مشائخ مریدوں کو ریاضت کرواتے ہیں لیکن کبھی اللہ کی طرف سے (مرشد کے طفیل) کرم ہو جائے تو پل بھر میں وصال عطا ہو جاتا ہے۔ آپ ایک فارسی کے شعر میں فرماتے ہیں کہ پہلے علم حاصل کرو اور پھر معرفت کے میدان میں آؤ، کیونکہ بارگاہ حق میں جاہلوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جو شخص علم کے بغیر زہد اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی آخری عمر میں پاگل ہو جاتا ہے اور کفر کی موت مرتا ہے۔ علم مرشد کے ذریعے یا وسیلہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جنہوں نے عقیدت کے ساتھ اپنے مرشد کو دیکھا اس کا یہ دیکھنا اللہ تعالیٰ کی طرف دیکھنے سے خدا کو زیادہ پسند ہے۔ علم میں اگر عمل ہو تو حق تعالیٰ سے یگانگی ہے اور عمل بے علم دیوانگی ہے۔ حضرت امام مالکؒ کا قول ہے کہ فقہ کو بغیر تصوف پڑھنے والا زندیق ہے اور جس نے فقہ کے بغیر تصوف حاصل کیا وہ فاسق ہوا۔ فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ کو قیامت کے دن اختیار دیا جائے گا کہ جنہوں نے ان درویشوں کے ساتھ محبت کی یا ان کی خدمت میں لگے رہے تو ان کو یہ درویش پل صراط سے گزار کر اپنے ساتھ جنت میں لے جائیں۔ فرماتے ہیں کہ حضوری کے بغیر نماز درست نہیں۔ نماز میں نمازی کو اس کی ہر پکار پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے "لبیک" کہا جاتا ہے اور عارفوں کو تو ہر لمحہ، ہر ساعت یہی جواب ملتا ہے

فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ یعنی پس تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا۔ (البقرہ آیت ۱۵۲)

یہ ایک حقیقت ہے کہ رابطہ کا عمل مراقبہ کا عمل جاننے کے بغیر ممکن نہیں بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مراقبہ ہی رابطہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سلطان باھوؒ نے "عین الفقر" میں مراقبہ پر بہت زور دیا ہے کیونکہ مراقبہ میں جانے سے ہی تصور شیخ حاصل ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں "مراقبہ خدا کی محبت کا نام ہے، استغراق حق کا راہنما اور مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا کے مقام کو حاصل کرنے والا ہے۔ اس میں بندے کو مشاہدہ، حضور حال، سیرالاسرار سے واقف ہونا اور مجلسِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی حضوری نصیب ہوتی ہے۔" مراقبہ کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً مراقبۂ عام، مراقبۂ خاص، مراقبۂ خاص الخاص، مراقبۂ اخص، مراقبہ عشق، مراقبہ فنافی اللہ اور بقا باللہ وغیرہ۔ صاحبِ مراقبہ کی روح پل بھر میں زمین، عرش، کرسی، لوح و قلم وغیرہ کی سیر کر کے صاحب مراقبہ میں اس طرح لوٹ آتی ہے جس طرح کوئی روحانی شخص اپنی قبر میں اعلیٰ علیین سے لوٹ آتا ہے۔ صاحبِ مراقبہ جس طرف نظر اٹھاتا ہے تمام حجابات جل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے "عین الفقر" میں مراقبہ فنافی الفقر، مراقبہ فنافی محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مراقبۂ نفس، مراقبۂ نودونہ (۹۹) نام باری تعالیٰ، مراقبہ چشم باز، مراقبہ شہباز اور مراقبۂ بلی پر بھی مختصر سی گفتگو کی ہے۔ اگر مراقبہ میں جانور اور مال و جاہ نظر آئیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سالک ابھی طلب دنیا میں ہے اور اس کا تعلق عالم ناسوت سے ہے۔ اگر سالک کو باغ، دریا، مکانات، محلات، حور و قصور اور جنت وغیرہ نظر آئیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی اس کے دل میں کثافت باقی ہے۔ ذکر قلب کرنے والے سالک کو اسمِ ذات (اللہ) کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس میں حواسِ خمسہ بند ہوتے ہیں۔ ذکر روح کرنے والے سالکوں کے دل کی آنکھ کھل جاتی ہے اور پھر وہ مجلس محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہو جاتے ہیں اور کشف القبور حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسا سالک مقامِ حیرت اور خوفِ خدا میں رہتا ہے۔ ذکر سر میں چشم سر کھل جاتی ہے اور ازل سے ابد تک سب کچھ نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے سالکوں کو عرش سے تحت الثریٰ تک ہر چیز نظر آ جاتی ہے۔ بلی کا مراقبہ اس بلی کی طرح ہوتا ہے جو چوہے کو پکڑنے کی خواہش میں ہو۔ جو شخص خواب میں بھی بیدار رہتا ہے، وہ جب چاہے انبیاء اور اولیاء کی مجلس میں حاضر ہو جاتا ہے اور جب چاہے خاص الخاص، اخص اور سر توحید (مراقبہ کی قسمیں) کے استغراق میں غرق ہو جائے۔ جب وہ مراقبہ سے باہر آئے تو مراقبے کا طویل وقت بھی ایک لمحہ کی صورت میں نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ مراقبہ اس قدر پختہ ہونا چاہئے جس طرح تیر کا نشانہ جہاں لگانا چاہا دم بھر میں وہاں جالگا۔ اگر عشق سالک کا راہبر ہو جائے تو ہزاروں سال کی مسافت نصف قدم کی طرح ہوتی ہے۔

زیر نظر کتاب میں ربط شیخ، تصور شیخ اور توجہ و تصرف شیخ سے متعلق وافر معلومات بہم کر دی گئی ہیں۔ اس کے مضامین اس قدر عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں کہ کسی کو اس کے سمجھنے میں قطعاً کوئی شکایت نہ ہو سکے گی۔ جو حضرات طریق رابطہ کو اپنانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کے لئے اس معاملہ کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوگی کیونکہ اس راہ کی پیچیدگیوں کو نہایت سہل

اور سادہ انداز میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والوں کو اس بات کی نوید حاصل ہو گی کہ وہ ابتداء سے ہی پابندی صوم و صلوٰہ کو اختیار کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی ان کو روحانیت کی بلند و برتر شاہراہ پر گامزن ہونے میں مکمل مدد ملے گی۔ اس طرح وہ ایک مرحلے میں ہی شریعت کی پابندی، تقویٰ اور روحانیت کی بلند و بالا منزلوں کی طرف رواں دواں ہو سکیں گے اور آسانی سے ولایت کا مرتبہ پا سکیں گے۔ ذَالِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ سورہ یونس ۶۴)

یاد رہے کہ صوم و صلوٰۃ کی ادائیگی پر مداومت حاصل کرنا اور شریعت حقہ کی حتی الامکان پیروی کرنا ہر مسلمان کے لئے کامیاب زندگی بسر کرنے کا ایک نہایت اہم راز ہے۔ اس طریقے سے دوری یا فرار اختیار کرنا شیطانیت اور فرعونیت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ غیر شرعی زندگی کو اپناتے ہوئے مال و دولت تو جمع ہو سکتا ہے مگر ایسے لوگوں کو آخرت کی کٹھن مشکلات کا سامنا کرنا ہو گا۔ ان حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے قرین عقل بات یہی ہے کہ آج سے ہی خدا کے ساتھ باغیانہ زندگی سے توبہ کی جائے اور کسی مرد حق پرست کے ساتھ مل کر زندگی اور آخرت کی مشکلات سے متعلق ابھی سے حل کی راہ تلاش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سچی توبہ کی توفیق نصیب فرمائے، بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور دنیا و آخرت میں کامیابی اور کامرانی نصیب فرمائے۔ آمین، وَصَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلٰی خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَسَلَّمَ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی وَالْتَزَمَ مُتَابَعَةَ الْمُصْطَفٰی صَلَّی اللہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

از مصنف

دعوتِ فکر

اگر سکھ چاہتے ہو تو خدا کو راضی کرلو

برادرانِ ملت! ہم اپنی زندگیوں کو دنیاوی وقار کے اعتبار سے بہتر بنانے کیلئے جو ذرائع اختیار کرتے ہیں وہ بالعموم خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کے منافی اور انسانیت سوز اصولوں پر مبنی ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم مال و منال کے ہوتے ہوئے بھی پریشان حال رہتے ہیں۔ ایسی جھوٹی شان، عزت اور وقار خدائے تبارک وتعالیٰ کے ہاں چنداں اہمیت نہیں رکھتی بلکہ اس کے حضور ایسے تمام کمالات مردود قرار پاتے ہیں۔ انسانی زندگی کی کامیابی اِس میں نہیں کہ صرف دنیا کے عیش اور آرام حاصل کر لئے جائیں بلکہ کامیاب زندگی کا راز خدا اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنا ہے۔

اگرچہ یہ دنیا ہم سے ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کیلئے مال و دولت کو حاصل کرنے کا تقاضہ کرتی ہے لیکن اِس سے یہ مراد نہیں کہ ہم یہ مال اور دولت ہر جائز اور ناجائز طریقے سے حاصل کرنے لگیں۔ مالِ دنیا حلال ذرائع سے بھی اتنا ہی کمایا جا سکتا ہے جتنا کہ حرام طریقوں سے کما لیا جاتا ہے یہ اِس لئے کہ روزی تو اُسی قدر ملتی ہے جو لکھ دی گئی ہے۔ یہ دنیا مصائب کا گھر ہے اور اِن مصائب کے ذریعہ ہماری آزمائش بھی کی جا رہی ہے دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کا صحیح اور واحد حل یہی ہے کہ ہم اپنا تعلق اس خدا سے اُستوار کرلیں جو اپنی کائنات کے تمام خزانوں کو لوگوں کیلئے اپنے مخصوص اور وضع کردہ اصولوں کے مطابق تقسیم کرتا ہے۔ جب خدائے تعالیٰ اپنے نافرمانوں اور کافروں کو بھی دنیا میں رزق سے فراغت بخشتا ہے تو پھر وہ اپنے فرماں بردار مسلمان بندوں کو اپنی کرم بخشیوں سے کیوں محروم کرے گا؟۔

قرآن مجید میں ہے کہ رزق اور اُس کے علاوہ ہر چیز آسمان سے نازل ہوتی ہے لہٰذا اِس رزق کے حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آسمانوں کے مالک سے اپنا تعلق قائم کرلیا جائے۔ اِس کو آزما کر دیکھو تو سہی کہ رزق کے دروازے تم پر کس طرح کھول دیئے جاتے ہیں؟ بالکل اِسی طرح جس طرح اُس نے تم سے پہلے لوگوں پر اِن دروازوں کو کھولا، یاد رکھو کہ خدائے تعالیٰ اپنے وعدوں سے انحراف نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کا رزق ایک مقدار اور ایک قانونِ اِکتساب کے مطابق مقرر کیا ہے لیکن اپنے فرماں بردار بندوں کیلئے رزق کی فراخی کے علاوہ دنیا اور آخرت کو بھی مسخر کر دیتا ہے۔

صرف رزق کی کشادگی اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی خوبی کی حامل نہیں۔
یاد رکھیں کہ مشکلات حرام کمائی سے حل ہو ہی نہیں سکتیں کیونکہ حرام تو تکالیف اور بے چینیوں میں اضافہ کرتا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ اگر آپ درجِ ذیل مشوروں پر عمل کریں تو انشاء اللہ آپ کی تمام مشکلات اور مصائب منجانب اللہ بہتر طریقے سے حل ہو جائیں گے اور ساتھ ہی برکات الٰہی آپ پر جلوہ فگن ہونے لگیں گیں۔

روزی میں برکت۔

اگر تنگئی معاش کی شکایت ہو تو درج ذیل وظائف کو اپنا معمول بنا لیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ فراغت رزق آپ کو تھوڑے عرصہ میں ہی میسر نہ ہو جائے۔

۱۔ ملائیکہ کی وہ تسبیح جس کی برکت سے روزی دی جاتی ہے وہ فجر کی نماز کے بعد سورج نکلنے سے پہلے (ورنہ بعد میں) ایک سو بار روزانہ پڑھیں، وہ تسبیح یہ ہے۔
سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللهَ۔

۲۔ تنگی رزق اور ہر مصیبت سے نجات کے لئے لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ الْعَظِيْمِ کثرت سے پڑھیں۔

۳۔ تنگئی معاش اور مقامات میں بلندی کے لئے حسب ذیل درود شریف کم از کم سو بار سے تین سو بار ہر روز پڑھیں۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ

۴۔ حضرت شفیق بلخیؒ نے پانچ چیزیں ہمارے لئے تلاش کی ہیں۔
i ۔ روزی چاشت کی نماز میں ii ۔ قبر کا نور تہجد کی نماز میں iii ۔ منکر نکیر کے سوال کا جواب قرأت میں iv ۔ پل صراط کا پار ہونا روزہ اور صدقہ میں v ۔ قیامت کے دن عرش کا سایہ خلوت میں۔

۵۔ فراخیٔ رزق کے لئے حضرت توکل شاہؒ نے روزانہ ساڑھے تین ہزار مرتبہ "اللہ الصمد" (اول و آخر ایک تسبیح درود شریف) پڑھنے کا وظیفہ بہت آزمودہ ہونا قرار دیا ہے۔

۶۔ اِستغفار کے درجِ ذیل بیان میں دیکھیں کہ کثرتِ استغفار سے وقار، عزت، دولت اور رزق میں برکت ہوتی ہے اور اس کے پڑھنے سے ہر مشکل دور ہو جاتی ہے۔

۷۔ اپنے نام کے حروفِ ابجد کے برابر دو جلالی اور جمالی اسمائے الٰہی منتخب کر کے اِن اسماء کا روزانہ ورد کیا جائے۔ اِس ورد سے آپ کے تمام مصائب دور ہو جائیں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں بہترین

اثرات مرتب ہوں گے۔ مثلاً" صحت ' کمائی ' تعلقات عامہ وغیرہ۔

کثرتِ استغفار سے ہر مُصیبت رَدّ اور مُراد پوری ہوتی ہے۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج کے مسلمان یہ نہیں جانتے کہ کثرتِ استغفار (کم از کم سات سو بار روزانہ) سے اُن کے لئے وقار ' عزت ' دولت ' اولاد اور ہر مراد غرضیکہ دین و دنیا کی ہر نعمت ملنے کا وعدہ قرآن میں کیا گیا ہے ایک روایت میں ہے کہ کچھ لوگ حضرت حسن بصریؒ کے پاس اپنی مشکلات کے حل کے لیے آئے تو آپ نے سب کو کثرت استغفار کا حکم دیا جب اُن سے پوچھا گیا کہ کیا یہ استغفار ہر مشکل کا حل ہے تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے پاس سے کچھ نہیں کہا بلکہ یہ اللہ تعالےٰ کا تجویز کردہ نسخہ ہے جو سورہ "ھود اور نوح" میں ارشاد ہوا ہے۔

مشکلات کے رفع ہونے کے علاوہ استغفار پڑھنے سے انسانوں پر شیاطین کے حملے ناکام بنا دیئے جاتے ہیں اور لوگ ہر قسم کے شر اور فساد سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ابلیس نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے کہ استغفار نے تو میری کمر ہی توڑ دی ہے۔ جو شخص استغفار کو کم از کم ۷۰۰ بار یا زیادہ پڑھے تو انشاء اللہ بہت جلد اُس کی مشکلات حل ہو جائیں گی۔ کوئی مشکل آئے تو ہزاروں کے حساب سے درج ذیل استغفار (اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے) پڑھیں اور معمول کا ورد (۷۰۰ بار) بند نہ کریں۔

۱۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ (۱۰۰ سے ۷۰۰ بار)

۲۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا یَا غَفُوْرُ یَا غَفُوْرُ یَا غَفُوْرُ (۱۰۰ سے ۷۰۰ بار)

نماز جاری کرنے کا آسان طریقہ۔

جو شخص نماز کی ادائیگی میں مداومت (ہیشگی) چاہتا ہے اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ درجِ ذیل چار نکات کی طرف توجہ دے تو انشاء اللہ بہت جلد مستقل نمازی بن جائے گا۔ تفصیل کے لئے ہماری کتاب "نشانِ منزل" جلد اول کا مطالعہ فرمائیں۔

۱۔ نماز کی اہمیت معلوم کرنا۔

احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص نماز نہیں پڑھتا وہ کفر کے نزدیک پہنچ گیا' اُس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔ بے نمازی کا ترکِ نماز کا نقصان اِس قدر ہوتا ہے جیسے کہ اُس کا سب کچھ

لٹ گیا ہو۔ بے نمازی سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سخت ناراضگی سے پیش آئے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز ترک نہ کرنا خواہ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں، بے نمازی کے چہرے سے ایمان کی علامت ہٹالی جاتی ہے، اُس کی عمر سے برکت اُٹھ جاتی ہے، اُس کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں، رزق میں بے برکتی اور زندگی مصائب اور آفات میں گزر جاتی ہے، قبر میں سخت عذاب ملتا ہے اور مرتے وقت ذلت کی موت مرتا ہے۔ بے نمازی بالآخر ذلیل کر کے جہنم میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں نہایت واضح اور بالکل درست ہیں، ان کی حقیقتوں کا مشاہدہ ہو چکا ہے چنانچہ نماز کوئی ایسی معمولی بات نہیں کہ دل میں آیا تو پڑھ لی نہیں تو نہ سہی! بلکہ نماز تو ایک ایسا فرض ہے کہ اس سے کسی حالت میں فرار ممکن نہیں۔ اس کے ترک سے دنیا اور آخرت دونوں میں نقصان ہی نقصان ہے۔

۲۔ نماز کی راہ میں شیطان کی رکاوٹوں سے بچنا۔

قرآن میں ہے کہ ابلیس نے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اُس نے اللہ تعالیٰ سے یہ بھی کہا کہ یہ خاکی انسان خدائے تعالیٰ کا خلیفہ بننے کے قابل نہیں۔ اپنے اِس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کہ انسان خدا کا شکرگزار نہیں، ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے اِس بات کی مہلت حاصل کر لی ہے کہ قیامت تک وہ لوگوں کو بہکاتا رہے گا اور اُن کو نماز اور دیگر نیک کاموں سے ہٹاتا رہے گا لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُن بندوں میں سے جو میرے مخلص بندے ہوں گے اُن پر ابلیس کا ذرہ برابر بھی زور نہیں چلے گا چنانچہ نماز کے لیے کسی رکاوٹ کو شیطان کی طرف سے دشمنی سمجھتے ہوئے اُس کی رکاوٹ کو ٹھکرا دیں اور فوراً نماز کے لئے اٹھ بیٹھیں۔

۳۔ نمازوں کی حاضری کے اوقات میں اختصار۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ جب نماز کے لیے آمادگی کا اظہار کرتے ہیں تو عموماً لمبی لمبی نمازیں اور وظائف کرنے لگ جاتے ہیں لیکن دو تین دن کے بعد پھر سب کچھ چھوڑ بیٹھتے ہیں کیونکہ اِس قدر طویل وقت کا نکالنا اُن کی محدود ہمت کے لیے ایک مشکل امر نظر آتا ہے چنانچہ جب تک کوئی پکا نمازی نہ بن جائے اُس وقت تک نمازوں میں صرف ہونے والے وقت میں اختصار قائم کرنا بہتر ہوتا ہے یعنی فرائض، واجبات اور سنت موکدہ ہی ادا کریں۔ اس طرح عشاء کی نماز میں صرف چار فرض، دو سنت

اور تین وتر ادا کریں۔ باقی نمازیں تو ویسے ہی چھوٹی ہیں جب نمازوں میں پختگی حاصل ہو جائے تو پھر بے شک اپنی نمازوں کے ساتھ سو نفل روزانہ ادا کریں۔ ابتدا میں نماز کے بعد وظائف بھی مختصر رکھیں تاکہ دل کو یہ محسوس ہو جائے کہ حقیقتاً نماز تو چند منٹوں کی ہی بات ہے اور اتنی مختصر نماز کے لیے دل چرانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس طرح نمازی کو بوجھ محسوس نہ ہو گا۔ ویسے بھی نماز تو اللہ کے حضور میں حاضری ہے جب اُس کے دربار میں آگئے تو حاضری ہو گئی البتہ جب خدا سے قرب ہو گیا تو پھر آپ کا دل ہر وقت اُس کے دربار میں انکا رہے گا

۲۔ کوئی نماز رہ جائے تو اُس کی قضا ضرور ادا کرو۔

جذبۂ شوق سے متاثر ہو کر جب کوئی بندہ کچھ عرصہ کے لئے نمازی بن جاتا ہے تو شیطان کسی نہ کسی عذر سے ایک یا دو نمازوں کو فوت کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن یاد رکھیں کہ جونہی کوئی نماز قضا ہو جائے تو اُسی دن یا رات کو (یا دوسرے تیسرے دن) اُس کی قضا ضرور ادا کر لیں کیونکہ اگر ایک نماز چھوٹ گئی تو دوسرے دن آپ دو اور پھر تین چار نمازیں چھوڑ دینے پر دلیر ہو جائیں گے۔ اس طرح آپ نمازوں کے ترک کرنے کے عادی ہو جائیں گے یہاں تک کہ ایک دن آپ سب کی سب نمازیں ترک کر دیں گے اور اگر آپ ترک شدہ ہر نماز کی قضا ادا کرتے رہے تو دل میں یہی خیال رہے گا کہ میں نے ایک نماز ہی تو چھوڑی تھی اور اُسکی بھی قضا ادا کر لی ہے۔ اس حالت میں نمازوں کے ناغے نہیں ہوں گے اور انسان پکا نمازی بن جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ کبھی صبح نو بجے آنکھ کھلے تو نماز کو ترک نہ کریں بلکہ سب سے پہلے اُٹھ کر فجر کی قضا نماز ادا کریں اور پھر ناشتہ وغیرہ کریں۔ نمازوں کا ناغہ اگر نہ ہو تو کبھی بے نمازی ہونے کی نوبت نہیں آئے گی۔ یہی نمازوں پر استقامت حاصل کرنے کا راز ہے۔ فافہم

انسان کی کامیابی فقط خدا کو خوش کرنے میں ہے۔

حرام مال جس قدر بھی کما لیا جائے اُس کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے مال سے حاصل کردہ شان و شوکت اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی طرح بھی عزت اور وقار کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ عزت کا حصول صرف خدا کی خوشنودی سے وابستہ ہے۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اُسے دنیا میں آسودگی ملے اور آخرت میں نجات بھی حاصل کرے تو وہ حسب ذیل نکات پر غور کرے۔

۱۔ خدا کی مدد کرو تاکہ اِس کے عوض میں تمہیں بھی اُس کی مدد حاصل ہو سکے۔ خدا کی مدد اِس بات میں پوشیدہ ہے کہ خود کو ٹھیک ٹھیک مسلمان بنانے کی کوشش کرو اور دوسرے مسلمانوں کا خدا کے دین کی طرف رجوع قائم کرو۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ مل جاؤ جنہوں نے لوگوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ مدد مال خرچ کرنے سے ہی نہیں بلکہ تبلیغی اداروں کے ساتھ اپنا وقت صرف کرنے سے بھی میسر ہوا کرتی ہے۔ چند مخلص لوگ اگر اِس مہم میں حصہ لیں تو ملک گیر اصلاح بعید نہیں۔ اگر حکومت اِس کام میں ہماری امداد کرے تو بغیر کسی مشکل کے، معمولی مال صرف کرنے سے ہی یہ مرحلہ بہت تیزی سے طے ہو سکتا ہے کاش حکومت ایسے مخلص لوگوں کو پہچان سکے تاکہ قومی معیار کو بلند کیا جا سکے۔

۲۔ حرام کاری، رشوت خوری، چور بازاری، ملاوٹ اور غلط کاریوں کو یکسر چھوڑ دیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے مال کم نہیں ہو گا بلکہ بڑھے گا۔

۳۔ خدا اور رسول ؐ کی اتباع کا سہارا حاصل کیا جائے۔ یہ سہارا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ صحابہ کرام اِسی سہارے سے دنیا بھر میں معزز ترین بن گئے تھے۔

۴۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی حاصل کریں۔ اِس تحریر کے اواخر میں پابندی صوم و صلوٰۃ آسانی سے حاصل کرنے کا طریقہ شامل کر دیا گیا ہے۔ اُس سے مدد حاصل کریں۔

۵۔ دین کا ضروری علم حاصل کیا جائے۔ جو شخص دین کا علم اِس لئے حاصل کرتا ہے کہ وہ اِس سے اِسلام کو زندہ کرے گا تو قیامت کے دن اُس کے درجے اور انبیاء کے درجے میں صرف ایک درجے کا فرق ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو وحی کی کہ علم، دولت اور سلطنت میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کریں تو آپ نے علم کو ترجیح دی۔ لہٰذا اِس علم کے سبب آپ کو دولت بھی ملی اور سلطنت بھی مل گئی۔ افسوس ہے کہ ہم اِن باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ حقیقت یہی ہے۔

۶۔ خدا اور اُس کے رسول ؐ اور اولیائے کرام کی محبت کو اپنایا جائے کیوں کہ اِن کے علاوہ اور کوئی چیز محبت کے قابل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اُن انعامات کو جو وہ انسان کو عطا فرماتا ہے، اگر اللہ کی راہ میں صرف کئے جاویں تو قرآن میں اِن انعامات میں مزید اضافے کا وعدہ کیا گیا ہے چنانچہ حرام مال کی رغبت کی بجائے حلال ذرائع سے اپنے مال کو بڑھاتے رہو۔ اور اللہ تبارکؐ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے سے حاصل کردہ نعمتوں کو قید کر لو۔

شجرہ شریف

سلسلہ نقشبندیہ بہ مناسبت عبداللطیف خان نقشبندی خاکپائے آستانہ نیریاں شریف

یا الٰہی خستہ حالم، رحم کن بر حالِ ما
اِتِّقَا دارم زِ فضلت نیست جز تو والِ ما

التجا دارم بہ درگاہت بنامِ مصطفےٰ
کآں بود احمدؐ محمدؐ درصفات و درعطا

دستِ گو گیرم کہ دستِ خویش او را گفتہ ای
زیں سبب گفتہ نہ باشد دست او از تو جدا

حضرتِ صدیقؓ و سلماں قاسم و جعفر دگر
بایزیدؒ و خواجۂ ما بوالحسنؒ خورشید فر

بوعلیؒ بحرِ عطارؒ، بویوسفؒ ابرِ مکرمت
عبد خالقؒ عارفؒ و محمودؒ، شاہِ داد گر

بحر کرم رامیتنیؒ، بابا سماسیؒ و کلالؒ
نقشبندؒ عطارؒ چرخیؒ عشق را تیغ و سپر

پس عبیداللہ و زاہد خواجہ درویشؒ اجل
خواجہ امکنگیؒ و باقی باللہؒ آمد خوب تر

پس مجدّد عروۃ الوُثقیٰ و شاہ شاہ حسینؒ
خواجہ عبدالباسطؒ و شاہ عبد قادرؒ دیدہ در

فغنوی محمودؒ خواجہ اولیاء عبداللہ شاہؒ
شاہ عنایتؒ، حافظ احمدؒ والیان بحر و بر

فخر ہند عبدالصبورؒ و گل محمدؒ شاہ غفورؒ
خلق را عبدالمجیدؒ عبدالعزیزؒ آمرزگر

خواجہ سلطان الملوک و آں نظام الدینؒ شہ
خواجہ قاسمؒ ہادیٔ ہند و جہاں را راہبر

زاہدِ کامل محی الدینؒ شاہِ نیروی
داد علاؤالدین جہانِ عشق را کامل نظر

یا الٰہی رحم کن برما طفیلِ آں شہاں
لطف فرما بر لطیفؔ و دوستاں شام و سحر

ختمِ خواجگان

بروز جمعۃ المبارک بعد نماز عصر و قبل از مغرب پڑھیں

۱ بسم اللہ شریف ۱۰۰ بار
۲ درود شریف ″
۳ الحمد شریف ″
۴ سورہ الم نشرح لک ۷۹ بار
۵ سورہ اخلاص ۱۰۰۰ بار
۶ الحمد شریف ۷ بار
۷ درود شریف ۱۰۰ بار
۱ یَا قَاضِیَ الْحَاجَاتِ ۱۰۰ بار
۲ یَا شَافِیَ الْاَمْرَاضِ ۱۰۰ بار
۳ یَا کَافِیَ الْمُہِمَّاتِ ۱۰۰ بار
۴ یَا دَافِعَ الْبَلِیَّاتِ ۱۰۰ بار
۵ یَا رَافِعَ الدَّرَجَاتِ ۱۰۰ بار
۶ یَا حَلَّ الْمُشْکِلَاتِ ۱۰۰ بار
۷ یَا مُسَبِّبَ الْاَسْبَابِ ۱۰۰ بار
۸ یَا مُفَتِّحَ الْاَبْوَابِ ۱۰۰ بار
۹ یَا غِیَاثَ الْمُسْتَغِیْثِیْنَ ۱۰۰ بار
۱۰ یَا وَاسِعَ الْمَغْفِرَاتِ ۱۰۰ بار
۱۱ یَا مُنَزِّلَ الْبَرَکَاتِ ۱۰۰ بار
۱۲ یَا مُجِیْبَ الدَّعْوَاتِ ۱۰۰ بار
۱۳ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ۱۰۰ بار
۱۴ درود شریف ۱۰۰ بار

الداعی: عبد اللطیف خان نقشبندی
ڈائریکٹر، محکمہ موسمیات، لاہور

ایصالِ ثواب برائے خواجگان نقشبند

۱ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
۲ خواجہ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ
۳ خواجہ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ
۴ خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ
۵ خواجہ ابو یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ
۶ خواجہ عارف ریوگری رحمۃ اللہ علیہ
۷ خواجہ بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ
۸ خواجہ امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ
۹ پیران پیر خواجہ بہاؤ الدین رحمۃ اللہ علیہ
۱۰ خواجہ ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ

(من خدام دربار نیریاں شریف)

مصنّف کی تصنیفات

نام کتاب اور پبلشر	موضوع
☆ بیعت کی تشکیل اور تربیت : (جنگ پبلشرز، دوبار شائع کر چکے ہیں)	بیعت کا جواز، اس کی اہمیت اور تصوف کے احوال و اشغال پر مدلل گفتگو
☆ حضور قلب : (جنگ پبلشرز سے دوبار چھپ چکی ہے)	معارفِ قلب، خشوع و خضوع، اقبال'' کا فلسفۂ حضور:
☆ تہذیبِ نفس : (پریس میں جانے والی ہے)	خطرات و آفاتِ نفس اور تزکیہ و تصفیۂ باطن، دنیائے دنی اور نفس کی حقیقت
☆ رابطۂ شیخ : (جنگ پبلشرز سے شائع ہو چکی ہے)	رابطہ شیخ اور تصوّرِ شیخ کا جواز، شیخِ طریقت سے حاصل ہونے والی روحانی توجہات، کمالات، معاملات اور تصرّفات۔
☆ احیائے سنت : (پریس میں عنقریب جانے والی ہے)	سنت کا تعارف، مقام، افہام، اقسام، تاریخ، آئینی اور شرعی حیثیت، احیاء اور اتباع سنت کی ترغیب۔
☆ نشان منزل : (پرانا نام نشان منزل جلد اول حصہ اول) (سنگ میل سے تیسری بار طبع ہو چکی ہے)	پابندیٔ صوم و صلوٰۃ کی اہلیت پیدا کرنے والی کتاب۔ دین کے بنیادی علوم مہیا کرتی ہے۔
☆ حُسنِ نماز : (روحِ نماز، نشان منزل جلد دوم) (فیروز سنز عنقریب شائع کر رہے ہیں)	نماز کے مفصل معارف اور روحانی اسرار ضخامت ۸۰۰ صفحات
☆ سرمایۂ ملت : (پرانا نام نشان منزل جلد اول حصہ دوم)	ملتِ اسلامیہ کا چراغ، مسلمانوں کا علمی

(کام جاری ہے)

نصاب، سرمایۂ قرآن، اقبالؒ اور رومیؒ کی خدمات، مکتوباتِ لطیف

☆ **متاعِ اخلاق :** (پرانا نام نشان منزل جلد سوم)

اخلاقیات پر ایک خوبصورت اور دلچسپ کتاب

☆ **اسلام اور روحانیت :**
(تکمیل کا کام جاری ہے)

تصوف کے علوم اور راہِ حق کی تلاش

☆ **مسلکِ اولیائے امت :**
(ہنوز زیرِ ترتیب ہے)

ان عقائد کی وضاحت جن پر جملہ اولیائے کرام قائم رہے۔

☆ **بیا بہ مجلسِ اقبال :**
(شیخ غلام علی پبلشرز عنقریب شائع کرنے والے ہیں)

اقبال کے فارسی کلام کی فہرست جس کی مدد سے علامہ کا کوئی شعر بھی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

☆ **جنیدؒ و بایزیدؒ :**
(ہنوز کام جاری ہے)

روحانیت جنیدؒ و بایزیدؒ اور ان کے مقالات و احوال

☆ **عقل و عشق اور فلسفۂ خودی :**
(نستعلیق کمپیوٹر کمپوزنگ ہو چکی ہے)

کمالاتِ عشق اور اقبالؒ کا فلسفۂ خودی

☆ **اکتسابِ رزق و انفاق :**
(کام جاری ہے)

قرآن کا روحانی اندازِ اکتساب و انفاق

☆ **مسئلۂ تقدیر :**
(تکمیل کے آخری مراحل میں ہے)

نوجوانوں کی بے عملی کا خوبصورت حل۔

☆ **اقبال اور دیگر شعرا :** (تقابلی جائزہ)
(تکمیل کے آخری مراحل میں ہے)

مصنّف کے بڑے بھائی جناب کے۔ ایم۔ نیازؔ کی غیر مطبوعہ تحریروں کا مرتب مجموعہ۔ اقبالؒ اور چند دیگر شعرا پر مفصل اور پرمغز تحریر۔

☆ **ثنائے خواجہ :**
(جملہ کاموں کی نگرانی ہو رہی ہے)

مصنّف کے نعتیہ کلام کا مجموعہ

مقام زرد رنگ کے ہالے میں پہنچنے کے بعد حاصل کرتا جو رفتہ ر
بقاباللہ سے سالک کو مشرف کر دیتا ہے۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ وہ راہیں جو اللہ تعالیٰ
طرف پہنچانے والی ہیں' دو ہیں۔ ان میں سے ایک وہ راہ ہے
قُربِ نبوّت سے تعلق رکھتی ہے اور اصل الاصل تک پہنچانے وا
ہے۔ اس راہ سے واصل ہونے والے انبیاء علیہم الصلوٰ
والتسلیمات ہیں اور ان کے طفیل 'ان کے چند صحابہ کرامؓ بھی ا
راہ سے مسلک ہوتے ہیں۔ ایسی راہ سے مسلک ہونے والوں
تعداد بہت کم ہوتی ہے اور اس راہ سے واصل ہونے والے بغ
کسی وسیلے اور حیلولت کے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست فیض حاص
کرتے ہیں اور کوئی دوسرا ان کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ سرو ر
میں اس راہ کو سرخ رنگ کی پٹی سے زرد رنگ کے ہالے تک بر
راست پہنچنے کا تصور دکھایا گیا ہے اور اس میں حائل ہونے وا
نیلے اور سیاہ رنگوں کو نورانی اور ظلماتی حجابات سے تشبیہ دی گ
ہے۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ
واصل ہونے والی دوسری راہ قُربِ ولایت سے تعلق رکھتی ہے
جس کے ذریعے اقطاب 'اوتار' نجباء 'ابرار اور عام ولی اللہ ا
راہ سے واصل ہوتے ہیں اور راہ سلوک بھی اسی سے عبارت
ہے' بلکہ متعارف جذبہ بھی اس میں داخل ہے۔ اس راہ میں توس
(مشائخ کا) اور حیلولت ثابت ہے۔ اس دوسری راہ کو سرخ رنگ کی
پٹی سے ظاہر کیا گیا ہے جو رفتہ رفتہ زرد رنگ کے ہالے میں جذب ہ
جاتی ہے۔ یہی وہ راہ ہے جس میں شیخ طریقت کی مدد سے وصل الٰہی
حاصل کیا جاتا ہے اور طریق رابطہ بھی اسی راہ سے متعلق ہے او
فنافِی الشیخ' فنافِی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم اور فنافِی اللہ کے
مقامات اسی راہ میں متصور ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں مذکورہ بالا دونوں راہوں میں سے دوسری را
کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس سلسلے میں کام آنے والے مشائخ عظام
کے زرّین اقوال اور ہدایات کو شامل کیا گیا ہے اور اس بات کی
وضاحت کی گئی ہے کہ مذکورہ دوسری راہ کو کس طرح اختیار کیا جا
ہے اور اس میں رابطۂ شیخ کی کیوں شدت سے ضرورت محسوس
ہوتی ہے۔ شیخ کامل اور مکمل کی راہ نمائی کے بغیر اللہ تعالیٰ کی پاک
ذات تک رسائی ممکن نہیں' جیسے کہ قرآن پاک میں ارشاد باری
تعالیٰ ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ
الْوَسِيْلَةَ (المائده -۳۵)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ
ڈھونڈو... مشائخ عظام نے وسیلہ شیخ کو ہی رابطہ شیخ سے تعبیر کیا
ہے۔

تعارف مصنّف

نام : عبداللطیف خان نقشبندی — سال پیدائش: ۱۹۲۷ء
مقام پیدائش : جالندھر — تعلیم: ایم۔ ایس سی و دیگر محکمانہ تعلیمات
پیشہ : ڈائریکٹر (ر) محکمہ موسمیات، لاہور۔حال سرپرست، ادارۂ تبلیغ و ترویج اسلام اور سلسلہ درس و تدریس
فون : ۶۶۶۵۴۷۵ - ۶۶۶۶۶۳۱

اسلام کی ترویج اور اشاعت میں جن مقتدر ہستیوں نے کردار ادا کیا ہے اور جن کے طفیل وطن عزیز میں آبادی کا بہت بڑا حصہ اسلامی تعلیمات سے روشناس ہوا ہے، ان میں سے ایک اہم شخصیت، مصنف کتاب ہذا پیر عبداللطیف خان نقشبندی بھی ہیں۔ موصوف اپنی دینی خدمات کے باعث ملک اور بیرون ملک، دینی حلقوں میں خاصے معروف ہیں۔ اگرچہ آپ نے چالیس برس کا عرصہ ایک ایسے محکمہ میں ممتاز عہدوں پر گزارا ہے جہاں آپ کا تعلق ماڈرن سائنس اور فنی مہارات کے متعلقات سے وابستہ رہا، مگر آپ نے اس محکمہ کی اہم ذمہ داریوں کے علاوہ اوائل شباب سے ہی دینی علوم اور تصوف کے عمیق علوم کا مطالعہ کیا اور اب تک آپ متعدد رسائل اور مکتوبات کے علاوہ پندرہ سے زائد دینی کتب کے مصنف ہونے کا اعزاز بھی حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کے لاتعداد مضامین تصوف، روحانیت اور دیگر اسلامی عنوانات پر نوائے وقت، جنگ اور خبریں جیسے اخبارات کے علاوہ مختلف دینی رسالوں کی زینت بن چکے ہیں۔ آپ کی جو کتب اب تک زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں، یا عنقریب ہونے والی ہیں ان میں سے "نشانِ منزل"، "حُسنِ نماز"، "بیعت کی تشکیل اور تربیت"، "حضورِ قلب"، "بیابہ مجلسِ اقبال"، "رابطۂ شیخ" "متاعِ اخلاق"، "سرمایۂ ملت"، اور "تہذیبِ نفس" قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کی دیگر آٹھ عدد کتب ہنوز تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں۔

مذکورہ بالا تصانیف و اشاعت کے ساتھ ساتھ پیر عبداللطیف خان نقشبندی نے تبلیغ کا ایک انوکھا سلسلہ وضع کیا ہے اور وہ یہ کہ آپ مختلف مقامات پر کچھ لوگوں کے اجتماع میں دو تین دنوں کے لئے (صرف ایک گھنٹہ یومیہ) درس کا اہتمام کرتے ہیں، جس میں وہ جدید سائنٹیفک انداز میں اسلامی زندگی کے ایمان افروز حقائق اور قرآن و حدیث کے خوبصورت نکات سے آراستہ گفتگو کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو اس طرح گرما دیتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں حیرت انگیز کیفیت، زبردست انقلاب اور اسلامی ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات تو آپ چند منٹوں میں ہی لوگوں کی زندگیوں کو بدل کر رکھ دیتے ہیں آپ کے اس حسن تعلیم و تدریس اور صحبت فیض بخش سے اب تک ہزاروں مسلمان نشہ اسلام سے سرشار ہو چکے ہیں مصنف کی خواہش ہے کہ اگر درسوں کے اس طریقے کو وسیع تر پیمانے پر رائج کیا جائے تو مسلمانوں کی کثیر تعداد بہت جلد اصلاحِ نفس اور تعمیرِ سیرت و کردار کی دولت سے مالا مال ہو سکتی ہے مگر اس کے لئے حکومت یا متموّل حضرات کی توجہ کی اشد ضرورت ہے۔